خطباتِ اعجاز

عارف باللہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب نور اللہ مرقدہ
(بانی مدرسہ سراج العلوم سراج نگر چھپرا ضلع مئو، یوپی) کے

دینی و اصلاحی خطبات و بیانات

مدرسہ عربیہ سعیدیہ اشرف العلوم مصطفی ایجوکیشنل سوسائٹی
کرمھیا، مہراج گنج، یوپی

خطباتِ اعجاز

عارف باللہ حضرت مولانا **اعجاز احمد اعظمی** صاحب نوراللہ مرقدہ
(بانی مدرسہ سراج العلوم سراج نگر چھپرا ضلع مئو۔ یوپی)
کے دینی واصلاحی خطبات وبیانات

(جلد اول)

ناشر
مدرسہ عربیہ سعیدیہ اشرف العلوم مصطفیٰ ایجوکیشنل سوسائٹی
کرتھیا، مہراج گنج۔ یوپی
فون نمبر۔ 9455675877

تفصیلات

نام کتاب	خطباتِ اعجاز (دینی واصلاحی خطبات)
خطیب	عارف باللہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب نور اللہ مرقدہ
باہتمام	مولانا قمر الحسن قاسمی صدر المدرسین مدرسہ عربیہ سعیدیہ اشرف العلوم
صفحات	۲۹۶
سنہ طباعت	۲۰۱۷ء
ناشر	مدرسہ عربیہ سعیدیہ اشرف العلوم مصطفیٰ ایجوکیشنل سوسائٹی کرتھیا مہراج گنج
قیمت	

ملنے کے پتے

☆ مولانا اعجاز احمد اعظمی لائبریری، چھپرا، چریاکوٹ، ضلع مئو 9936029463

☆ مکتبہ ضیاء الکتب خیرآباد محلہ اتراری ضلع مئو 9235327576

☆ مفتی روح اللہ صاحب، فلاح المسلمین گواپوکھر مدھوبنی 9852685298

فہرستِ خطبات

○ چند باتیں ۱۴
○ پیش لفظ مولانا محمد عابد اعظمی صاحب ۱۵
۱۔ **اللہ کے اسما و صفات** **۱۷**
○ کائنات کی ہر چیز صفاتِ الٰہی کی مظہر ہے ۱۷
○ اسمائے الٰہی میں تاثیر بہت ہوتی ہے ۱۸
○ لفظ 'ھو' اللہ کا ایک مستقل نام ہے ۲۰
○ اللہ کے معنی 'من موہن' ۲۰
○ اصل محبت اللہ سے ہے ۲۱
○ غیب کا علم صرف اللہ کو ہے ۲۲
○ اللہ کھلے چھپے ہر کام سے واقف ہے ۲۳
۲۔ **رسول اللہ ﷺ کی خاص صفت: شفقت و رحمت** **۳۱**
○ عبدیت کے لیے علم اور ادب دونوں ضروری ہے ۳۱
○ امتِ اجابت اور امتِ دعوت ۳۲
○ رسول اللہ ﷺ کی صفتِ خاص ۳۳
○ رسول اللہ ﷺ کی رحمتِ عام ۳۳
○ امور شریعت میں مداہنت جائز نہیں ۳۴
○ رسول اللہ ﷺ کی رافت، ثبوت جرم سے قبل ۳۷
○ اجرائے حد کے بعد آپ کی کیفیت ۳۷
○ آپ ﷺ کی شفقت کی کوئی حد و نہایت نہیں ۳۸
○ نوجوان صحابی کی ذہانت ۴۰
○ آمدم بر سر مطلب ۴۱

○ رسول اللہ ﷺ کی تربیت کا اثر ۴۱
○ طلبِ صادق شرط ہے ۴۲
○ نرم مزاجی کی آپ ﷺ نے وصیت فرمائی ہے ۴۳
○ دشمنوں کے ساتھ آپ ﷺ کی نرم مزاجی ۴۳
○ ہمارے اکابر کی اپنے مشائخ کے ساتھ گرویدگی ۴۴
○ کرامت کا ظہور وصدور خالص اللہ کا فعل ہے ۴۵
○ نرمی کی سنت اپنانے والوں کا حال ۴۶
رسول اللہ ﷺ کی شفقتِ بے پایاں ۴۷
○ رسول اللہ ﷺ کی خاص صفت ۴۷
○ حاصلِ کلام ۴۹
۳۔ قرآن: ایک دولتِ بے بہا ۵۰
○ قرآن ایک نسخۂ کیمیا ۵۰
○ حضرت عمر ؓ کا واقعہ ۵۲
○ رسول اللہ ﷺ کا اہتمام ۵۳
○ حضرت ابوموسی اشعری ؓ کا واقعہ ۵۳
○ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کی تلاوت ۵۴
○ رسول اللہ ﷺ کا قرآن سے شغف ۵۵
○ صحابہ کرام کا قرآن سے شغف ۵۷
○ مفتی محمد حسن صاحب امرتسری کا واقعہ ۵۸
○ حضرت عثمان غنی ؓ کا ارشاد ۵۹
○ شیخ حافظ عبداللہ صاحب کا واقعہ ۶۰
○ قرآن سے شغف کی برکت ۶۱
○ خدمتِ دین کی برکت ۶۲

○ قرآن کا دیکھنا بھی باعثِ ثواب ہے ۶۳
○ قرآن کو دیکھنے کی برکت ۶۴
○ خدا کو خواب میں دیکھنا ممکن ہے ۶۵
○ حافظ بادشاہ کا واقعہ ۶۶
○ قرآن کی دھن ۶۷
○ امام احمد بن حنبل کا خواب ۶۷
○ قرآن سب کے لیے ۶۷
○ حضرت حسن بصری کا واقعہ ۶۹
○ اللہ تعالی دل دیکھتے ہیں تلفظ نہیں ۶۹
○ اصل مدعا ۷۱
○ قرآن کی تلاوت ہر حال میں مفید ہے ۷۳
○ دنیا کے معیار کا کیا اعتبار؟ ۷۴
○ دو انمول دولت جن کی قدر ضروری ہے ۷۵
○ دل اور زبان کی حفاظت راس التقوی ہے ۷۶
○ آمدم برسر مطلب ۷۶
○ تقوی کی برکت ۷۷
○ زبان پر نسلِ انسانی کا انحصار ہے ۷۸
○ صحتِ زبان وقلب کی اہمیت ۷۹
۴۔ قرآن کی عظمت ۸۲
○ کلام اللہ کی عظمت ۸۲
○ حافظ قرآن کا مرتبہ ۸۵
○ ایک محسوس مثال ۸۶
○ کھانے میں برکت ۸۷

○ برکت کا ایک اور واقعہ ۸۸
○ اللہ والوں کے یہاں ہر چیز میں برکت ہوتی ہے ۸۹
○ قرآن ایک زندہ معجزہ ۸۹
○ حفاظ کے لیے بشارت ۹۱
○ خدا کی رحمت بے حد وحساب ہے ۹۲
○ قرآن کو سہل اور عام کر دیا گیا ہے ۹۳
○ ایک محسوس مثال ۹۳
○ جیسا امام ہوگا ویسی نماز ہوگی ۹۴
○ قرآن سے کسی کو محروم نہیں کیا گیا ہے ۹۵
○ قرآن ایک زندہ معجزہ ۹۵
○ قرآن کے نزول کے وقت اس کی حفاظت ۹۶
○ قاریانِ خوش الحان ۹۷
○ قرآن ایک بیش بہا دولت ۹۸
○ تعلیم قرآن کی برکت ۹۹
○ ضرورت عمل کی ہے ۱۰۰
۵۔ ملت کے نوجوانوں سے خطاب ۱۰۱
۶۔ وعظ نرملی ضلع سپول بہار ۱۱۴
○ حضرت عبداللہ بن عمر ؓ کا فرمان ۱۱۵
○ اسلام کی قدردانی ضروری ہے ۱۱۶
○ حضرات صحابہ کرام کا حال ۱۱۶
○ نعمت کی قدردانی اور ادائے شکر پر بشارت ۱۱۷
○ ہماری ایک بڑی کمزوری ۱۱۸
○ علامہ عزالدین عبدالسلام کا واقعہ ۱۱۹

○ موت کی جگہ اور وقت متعین ہے، ڈرنے سے وہ نہیں ٹل سکتی ۱۲۰
○ حضرت خالد بن ولید ؓ کی تمنائے شہادت ۱۲۱
○ اسلام کو ہر جگہ نمایاں رکھنا چاہیے ۱۲۲
○ سیدنا ابوذر غفاری ؓ کا اعلان اسلام ۱۲۳
○ اسلامی وضع و ہیئت میں اللہ نے رعب رکھا ہے ۱۲۳
○ شہید کا اجر ۱۲۶
○ ایک عجیب دعا ۱۲۷
○ خشیتِ خدا اور قلب و زبان کی اصلاح ضروری ہے ۱۲۸
۷۔ مشکلات کا حل: تقویٰ ۱۳۰
○ موضوعِ زندگی ۱۳۰
○ ہماری ذمہ داری اللہ کے احکام کو پورا کرنا ہے ۱۳۱
○ تین کام ۱۳۲
○ امر دو طرح کے ہوتے ہیں ۱۳۳
○ حکم کا پورا نہ کرنا حکم سے ناراضی کی دلیل ہے ۱۳۳
○ بندوں کا وظیفہ اطاعت اور راضی رہنا ہے ۱۳۴
○ بے سان و گمان رزق کا انتظام ۱۳۵
○ اللہ کو راضی کرنا سب سے ضروری ہے ۱۳۵
○ تقویٰ پر خدا کے وعدے ۱۳۶
○ جزا اچھی ہو تو مشکل آسان ہو جاتی ہے ۱۳۷
○ حکومت اور تقویٰ ۱۳۷
○ کل کے لیے تیار رہنا چاہیے ۱۳۸
○ خدا کا حکم سب پر مقدم ۱۳۹
○ خدا کو راضی کر لیں تو ہر مشکل آسان ہے ۱۳۹

○ اصل مرکز نظر اللہ کی رضا ۱۴۱
○ اول و آخر تقوی ۱۴۲
○ اللہ کے لیے نماز ۱۴۳
○ ہمارا کام تعمیل حکم ہے ۱۴۳
۸۔ خدا اور رسول کی اطاعت ۱۴۵
○ اللہ کا ایک عظیم احسان ۱۴۵
○ تکلیف صرف دنیا تک ہے ۱۴۶
○ ہر کام اللہ کے لیے ہو تو بات بن جائے ۱۴۷
○ دنیا مقصد نہیں ہے ۱۴۸
○ دنیا کی کوئی قیمت نہیں ہے ۱۵۰
○ تین کام کا اہتمام ۱۵۰
○ ایفاے عہد کی اہمیت ۱۵۱
○ مقروض کی دعوت قبول نہیں کرنی چاہیے ۱۵۲
○ ایفاے عہد کی ایک مثال ۱۵۳
○ شاہ یعقوب صاحب کا واقعہ ۱۵۴
○ آمدم بر سر مطلب ۱۵۵
○ رضا بالقضا ۱۵۷
۹۔ زندگی اور موت انسان کے امتحان کے لیے ہیں ۱۵۸
○ قادر مطلق صرف ذاتِ واحد ہے ۱۵۸
○ انسان کی طاقت قدرتِ الٰہی کے تابع ہے ۱۵۹
○ زندگی و موت انسان کے امتحان کے لیے ہیں ۱۵۹
○ موت ایک لگام ہے ۱۶۰
○ موت کا خوف ۱۶۱

○ موت کے وقت کا نہ جاننا بھی اللہ کا بڑا فضل ہے ۱۶۱
○ دنیا سرائے فانی ہے ۱۶۲
○ اطاعت کا سب سے اچھا زمانہ جوانی ہے ۱۶۳
○ اللہ والوں کا حال ۱۶۴
○ زندگی کا حاصل خدا کی رضا ہے ۱۶۵
۱۰۔ عند اللہ وعند الناس محبوبیت کا نسخۂ کیمیا ۱۶۷
○ عروۃ الوثقی (مضبوط کڑا) کیا ہے؟ ۱۶۹
○ للہ فی اللہ محبت پائیدار ہوتی ہے ۱۷۰
○ کام آنے والی محبت للہ فی اللہ ہے ۱۷۱
○ عند اللہ وعند الناس محبوبیت کا نسخہ کیمیا ۱۷۲
۱۱۔ رزقِ حلال کا اہتمام ضروری ہے ۱۷۵
○ انسان کی روزی دو طرح کی ہے ۱۷۵
○ رزقِ حرام انسان کے امتحان کے لیے ہے ۱۷۶
○ عملِ صالح کی بنیاد رزقِ حلال ہے ۱۷۷
○ اللہ تعالیٰ صرف پاکیزہ چیز قبول کرتے ہیں ۱۷۸
○ نیکی اور تقوی کے لیے رزق حلال کا اہتمام ضروری ہے ۱۷۸
○ رزق کے تین ذرائع۔ پہلا کاشتکاری ۱۷۹
○ حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی کا احتیاط واہتمام ۱۸۰
○ گنگوہ کا واقعہ ۱۸۱
○ دوسرا ذریعہ: تجارت ۱۸۲
○ تیسرا ذریعہ: ملازمت ۱۸۲
○ ہمارے اکابر کا اہتمام وتقوی ۱۸۳
○ وراثت کی عدم تقسیم، جس میں ابتلاے عام ہے ۱۸۵

○ رزق حرام کا سب سے بڑا نقصان دعا کی عدم قبولیت ۱۸۷

○ دعا سے بلائیں ٹل جاتی ہیں ۱۸۸

○ خلاصہِ کلام ۱۸۸

۱۲۔ روزی مسئلہ ۱۸۹

○ رزق کا مسئلہ ۱۸۹

○ رازق صرف اللہ کی ذات ہے ۱۹۰

○ رزق رسانی بندے کے بس سے باہر ہے ۱۹۱

○ انسان جہاں ہو اُس کی کی روزی وہیں پہنچتی ہے ۱۹۲

○ رزق کی بجائے رزق رساں کو تلاش کرنا چاہیے ۱۹۲

○ نوجوان عابد کا واقعہ ۱۹۴

○ اصل فکر روزی رساں کی ہونی چاہیے ۱۹۵

○ جو دینا جانتا ہے وہ لینا بھی جانتا ہے ۱۹۶

○ ایک عبرت ناک واقعہ ۱۹۷

○ اصل برکت ہے، کثرت نہیں ۱۹۸

○ مومن ایک آنت میں کھاتا ہے ۱۹۹

○ حضور ﷺ کی برکت ۱۹۹

○ برکت اللہ کے نام میں ہے ۲۰۱

○ تین بات ۲۰۲

○ مال و دولت میں دوام نہیں ہے ۲۰۲

۱۳۔ دین و دنیا ہر چیز میں خوبی مطلوب ہے ۲۰۵

○ سورہ ملک کی فضیلت ۲۰۵

○ نابالغ اولاد والدین کے حق میں سفارشی ہوں گے ۲۰۶

○ دین یسیر الفہم ہے ۲۰۷

○ قادرِ مطلق صرف ذاتِ واحد ہے ۲۰۸
○ عزت و ذلت اللہ کے اختیار میں ہے ۲۰۹
○ رسول اللہ ﷺ کی قدر افزائی ۲۰۹
○ خدا کے نزدیک سب سے بہتر زمین ۲۱۶
○ دنیا کی مہلت امتحان کے لیے ہے ۲۱۶
○ موت کا خوف ۲۱۸
○ ہر چیز میں اچھائی مطلوب ہے ۲۱۹
○ انسان بہت ناشکرا واقع ہوا ہے ۲۲۰
○ عبادت میں حسن پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے ۲۲۱
○ اچھے عمل کا سب سے عمدہ نمونہ آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس ہے ۲۲۲
○ اللہ سے محبت انسان کی مجبوری ہے ۲۲۳
○ اسمِ اعظم ۲۲۳
○ ایک بزرگ کا واقعہ ۲۲۵
○ اسمِ اعظم ۲۲۵
○ اچھا ہونے کا معیار صرف ایک ہے ۲۲۶
○ زبان کو اچھا رکھیے ۲۲۸
○ ایک شخص کا عجیب واقعہ ۲۲۹
۱۴۔ اول و آخر سہارا اللہ ہی کی ذات ہے ۲۳۲
○ سہارا صرف اللہ کی ذات ہے ۲۳۲
○ ایک ظریفانہ واقعہ ۲۳۵
○ شاہ وصی اللہ صاحب کی کرامت ۲۳۶
○ صحت و مرض سب اللہ کی طرف سے ہے ۲۳۷
○ سحر اور جادو سے روزی نہیں روکی جا سکتی ۲۳۸

○ پوچھنا بھی غلط اور بتانا بھی غلط ۲۳۹
○ انسان کی ضعیف الاعتقادی کا حال ۲۴۰
○ تکلیفیں انسان کی بداعمالی کی وجہ سے آتی ہیں ۲۴۲
○ اول سہارا بھی اللہ، آخر بھی وہی ۲۴۴
○ اللہ بغیر اسباب کے بھی جو چاہے کر دے ۲۴۶
○ سہارا صرف خدا کی ذات ہے ۲۴۸
○ ایک اہم بات ۲۴۹
○ ہر حال میں اللہ ہی سے کہنا چاہیے ۲۵۰
○ تدبیر کیجیے مگر یقین اللہ پر رکھیے ۲۵۱
○ خلاصہِ کلام ۲۵۲
۱۵۔ غیروں کی مشابہت سے بچنا لازم ہے ۲۵۳
○ ایک جامع حکم ۲۵۴
○ ہر حال میں اللہ کے حکم کو دیکھنا ہے ۲۵۵
○ اپنا حق صرف اللہ سے مانگیں ۲۵۶
○ غیروں کے ساتھ مشابہت منع ہے ۲۵۷
○ غلط ہر حال میں غلط ہے ۲۵۸
○ تہذیب اپنی ہی اچھی ہوتی ہے ۲۵۹
○ اللہ کو بھولنے والا اپنا ہی نقصان کرتا ہے ۲۶۰
○ سکونِ قلب مال میں نہیں ہے ۲۶۰
○ فاسق کی طرف اللہ کی رحمت متوجہ نہیں ہوتی ہے ۲۶۱
○ فاسق کے حق میں دوسرے کی دعا بھی قبول نہیں ہوتی ۲۶۲
○ اہل جنت اور اہل جہنم برابر نہیں ہیں ۲۶۲
○ نیک لوگ بآسانی پہچان لیے جاتے ہیں ۲۶۳

۱۶۔ **بنی اسرائیل کی بدعنوانیاں اور کفرانِ نعمت** ۲۶۵
○ تذکیر بایام اللہ ۲۶۷
○ مُعذّب جگہوں سے احتیاط ۲۷۰
○ بنی اسرائیل پر خدا کا عظیم احسان ۲۷۱
○ شکر گزاری پر افزونیِ نعمت کا وعدہ ۲۷۲
○ بنی اسرائیل کا کفرانِ نعمت ۲۷۳
○ قوم کے لیے اعزاز کی بات ۲۷۴
○ بنی اسرائیل کے کفرانِ نعمت کی انتہا ۲۷۵
○ بنی اسرائیل پر اللہ کا عذاب ۲۷۵
○ کامرانی کا مدار اطاعت پر ہے ۲۷۶
○ قانونِ قدرت ۲۷۶
۱۷۔ **ابدال کا تعارف اور ان کی صفات** ۲۷۸
○ اولیاء اللہ کو ستانے کا انجام ۲۷۹
○ بزرگوں کی دعا کا اثر ۲۸۰
○ اللہ والوں کی خدمت کا صلہ ۲۸۲
○ اہل اللہ میں شامل ہونے کا نسخہ ۲۸۳
○ اہل اللہ کے احترام کا صلہ ۲۸۳
○ اہل اللہ کے ساتھ گستاخی کا انجام ۲۸۳
○ ابدال کی صفات ۲۸۴
○ ابدال کی برکت ۲۸۶
○ ہمارے دیار کے ابدال ۲۸۶
۱۸۔ **ماہِ محرم اور ہمارے اعمال** ۲۸۸
۱۹۔ **خواتین سے خطاب** ۲۹۲

چند باتیں

یہ کتاب عارف باللہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی نوراللہ مرقدہ کے اصلاحی خطابات و بیانات کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں کل ۱۹ تقریریں شامل ہیں۔ بیشتر تقریریں بہار میں کی گئی ہیں۔ حضرت مولانا کا اکثر بہار کا اصلاحی دورہ ہوا کرتا تھا، شوال ۱۴۲۷ھ میں آپ کا جو دورہ ہوا، اور اس میں جو دروسِ قرآن اور اصلاحی بیانات ہوئے، اُن میں سے بیشتر کو یا تقریباً سبھی بیانات کو حضرت مولانا کے ایک ذہین وزیرک شاگرد، قابلِ احترام بلکہ قابلِ رشک شخصیت کے مالک (جو خود بھی سحر طراز مقرر اور بہترین انشا پرداز ہیں) حضرت مولانا مفتی محمد روح اللہ قاسمی صاحب مدرس مدرسہ فلاح المسلمین گواپوکھر مدھوبنی نے حضرت مولانا کی مجلسِ وعظ ہی میں نقل کرکے ان کو مولانا کی نگاہِ اصلاح سے بھی گزار دیا تھا۔ ان تقریروں کو حضرت مفتی صاحب کے شکریہ کے ساتھ اس کتاب شامل کیا جاتا ہے۔

حضرت مولانا کے خطبات کی یہ پہلی جلد ہے، ان شاء اللہ دوسری جلد اُن دروسِ قرآن پر مشتمل ہوگی جو اعظم گڑھ کی جامع مسجد میں دیئے گئے ہیں اور خوش قسمتی سے محفوظ رہ گئے ہیں۔

اس مجموعۂ خطبات کی تیاری میں مولانا محمد اشہد اعظمی صاحب نے خوب خوب تعاون کیا، ان کے علاوہ مولانا محمد عامر اعظمی صاحب اور مولانا محمد توقیر اعظمی صاحب نے بھی معاونت میں پوری فراخ دلی کا ثبوت دیا، طباعت کے الجھے مسئلہ کو مولانا قمر الحسن قاسمی صاحب صدر مدرس مدرسہ عربیہ سعیدیہ گُرتھیا مہراج گنج کے ناخنِ گرہ کشا نے سلجھایا، ان تمام حضرات کا صمیمِ قلب سے شکریہ، اور بارگاہ رب الصمد میں دعا ہے کہ اللہ تعالی صاحبِ خطبات کو اور معاونین کو بہترین اجر سے نوازیں اور اس کتاب حسنِ قبول عطا کریں اور صدقۂ جاریہ بنائیں۔ آمین

* * *

پیش لفظ

مولانا محمد عابد اعظمی صاحب

والدنا المعظم حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی نور اللہ مرقدہ جامع الصفات انسان تھے۔ ان کی شخصیت کے نمایاں عناوین تدریس، تحریر، تقریر اور تزکیہ تھے۔ یہ عناصر ان کی ذات میں اس شان سے جلوہ فگن تھے کہ ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا اور یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کون سی خوبی اور صفت دوسری پر غالب ہے۔ وہ ایک کامیاب اور بافیض مدرس و مربی، صاحبِ طرز انشا پرداز، بہترین خطیب و واعظ اور صاحبِ دل مرشد و رہنما تھے۔

والد صاحب علیہ الرحمہ کی شخصیت اپنے امتیازی اوصاف و کمالات کی وجہ سے معاصرین میں ممتاز نظر آتی ہے۔ علم و فن، تقوی و للّٰہیت، نصح و خیر خواہی اور اخلاق و کردار کی بلندی میں نمونے کے انسان تھے۔ آپ کی پوری زندگی جہدِ مسلسل سے عبارت تھی اور ساری جد و جہد کا محور اخلاص پر مبنی رضاے الٰہی تھا۔ بندگانِ خدا کو راہِ حق پر گامزن کرنے، خدا کی معرفت سے روشناس کرانے اور بھٹکے ہوئے آہو کو سوے حرم لانے کے لیے اپنی پوری زندگی صرف کر دی۔ اس کے لیے ملک کے دور دراز ایسے علاقوں میں بھی تشریف لے گئے جہاں زندگی کی بنیادی ضروریات و سہولیات یکسر مفقود ہیں۔ بہار اور جھارکھنڈ کے دور افتادہ علاقے آپ کی جد و جہد کی ابتدائی جولان گاہ تھے، جہاں ہفتوں، مہینوں قیام کر کے رشد و ہدایت کے چراغ روشن کیے اور وعظ و ارشاد کے ذریعہ مردہ دلوں میں

ایمان ویقین کی شمعیں روشن کیں۔ آپ کے وعظ و بیان اور تقریر وخطابت میں خدا نے بلا کی تاثیر رکھی تھی۔ زبان سے نکلے ہوئے الفاظ براہ راست دلوں پر اثر کرتے اور خوابیدہ جذبات واحساسات کو مہمیز کرتے۔ سادہ زبان اور آسان اسلوب میں خطابت کے روایتی آہنگ سے ہٹ کر بات کرنے کا ایک خاص انداز تھا جس میں داعی کا خلوص، مفکر کا جذبِ دروں، صاحبِ دل کا سوز اور مجاہد کا آہنگ صاف جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

زبان وبیان کی سادگی وپرکاری کے ساتھ علمی استحضار کا یہ عالم تھا کہ ایک موضوع اور عنوان پر ہفتہ عشرہ بیان فرماتے اور مضامین کا تکرار نہ ہوتا۔ خواص کی مجلس ہو یا عوام الناس کا مجمع، جس موضوع پر گفتگو فرماتے، اس کا حق ادا کردیتے اور سننے والا مطمئن ہوکر عمل واصلاح کا جذبہ لے کر اٹھتا۔ جن لوگوں نے آپ کی زیارت کی، آپ کے بیانات سنے اور آپ کی صحبت کا شرف حاصل کیا، وہ حرف حرف اس کی تصدیق کریں گے۔

والد صاحب علیہ الرحمہ کی تقریروں اور بیانات کو محفوظ کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا، کاش کہ ایسا ہوتا تو ایک بڑا علمی واصلاحی ذخیرہ لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچتا۔ البتہ جو چند خطبات اور بیانات خوش قسمتی سے محفوظ کرلیے گئے تھے، انھیں تلاش کرکے برادر عزیز مولانا محمد عرفات اعجاز اعظمی سلمہ نے سلیقہ سے مرتب کردیا ہے جو یقیناً ایک گراں قدر علمی خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ مرتب کی اس کاوش کو قبول فرمائیں اور اس کے نفع کو عام فرمائیں۔
آمین

محمد عابد اعظمی

۵؍ذی قعدہ ۱۴۲۸ھ

* * *

اللہ کے اسما وصفات

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہ وَنَسْتَعِیْنُہ وَنَسْتَغْفِرُہ وَنُوْمِنُ بِہ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہ وَ مَن یُّضْلِلْہ فَلَا ھَادِیَ لَہ۔ وَنَشْھَدُ اَن لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہ لَا شَرِیْکَ لَہ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مَحَمّداً عَبْدُہ وَرَسُوْلُہ اَرْسَلَہ بِالْحَقِّ بَشِیْراً وَنَذِیْراً ۔ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہ وَاَصْحَابِہ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً۔ اَمَّا بَعْدُ:

فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمان الرحیم

هُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّاھُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ (۲۲)ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّاھُوَ الْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُھَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ سُبْحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ (۲۳)ھُوَ اللّٰہُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی یُسَبِّحُ لَہٗ مَا فِی السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (۲۴)[سورۃ الحشر]

کائنات کی ہر چیز صفاتِ الٰہی کی مظہر ہے:

یہ سورہ حشر کی آخری آیات ہیں، ان میں اللہ نے اپنی کچھ صفات اور کچھ اسما کا ذکر فرمایا ہے۔ کائنات ساری کی ساری اللہ تعالی کے اسما وصفات کا مظہر ہیں۔ جو کچھ اس دنیا میں ہے ان سب کا تعلق حق تعالی کے اسما وصفات سے ہے، اور مخلوقات کا تعلق اللہ تعالی سے صفات ہی کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالی نے قرآن پاک میں اور

نبی کریم ﷺ نے احادیث مبارکہ میں صفاتِ الٰہی کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ انسانوں میں بھلائی اور بہتری انھیں کا مظہر ہے۔ اور انبیا میں سے ہر نبی پر کسی اسمِ الٰہی کا غلبہ ہوتا ہے، جسے اصطلاح میں کہتے ہیں کہ 'اس نبی کا مربی یہ نام ہے۔ فلاں نبی فلاں اسمِ الٰہی کے زیرِ تربیت ہیں۔' غرض کائنات کی ہر چیز صفاتِ الٰہی کی مظہر ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ہر آیت کے اخیر میں کسی نہ کسی صفت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ ان آیات میں خاص طور سے ان صفات کا تذکرہ ہے جن کا تعلق پیدائش اور عبودیت وغیرہ سے ہے۔ غالبًا اسی وجہ سے حدیث میں ان تینوں آیتوں کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ اگر کوئی صبح وشام تین مرتبہ 'اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم' پڑھ کر ان تینوں آیتوں کو پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ستر ہزار فرشتے مقرر فرما دیتے ہیں جو اس کے لیے دعاے مغفرت کرتے ہیں۔ اور اگر اسی دن وہ مر گیا یعنی صبح کو پڑھا اور شام سے پہلے مر گیا، یا شام کو پڑھا اور صبح سے پہلے مر گیا تو وہ شہید ہوتا ہے۔ اسے شہیدوں کا ثواب ملتا ہے۔

اسماے الٰہی میں تاثیر بہت ہوتی ہے:

اللہ تعالیٰ کے ان ناموں کی بڑی تاثیر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى" "اللہ کے اچھے اچھے نام ہیں۔ ترمذی شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "اِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَّتِسْعِيْنَ اِسْماً مِأَةً اِلَّا وَاحِداً مَنْ اَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ"۔ اللہ کے ننانوے نام ہیں، جو ان ناموں کو یاد کرلے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اکابرین نے اسے یاد کرنے کا معمول بنایا ہے۔ ایسا بارہا تجربہ ہوا ہے کہ ان ننانوے نام سے جسے حضور ﷺ نے بیان فرمایا ہے، پڑھ کر دعا کی گئی تو وہ دعا قبول ہوئی۔

ایک تجربہ اپنا آپ کو بتلاتا ہوں۔ ہندوستان کے دیہاتوں میں بجلی بہت کٹتی ہے۔ یوپی میں تو کم، بہار میں یہ مصیبت زیادہ ہے۔ میں غازی پور میں پڑھتا تھا، ایک

دن مغرب کے بعد اچانک بجلی چلی گئی۔ اس زمانے میں جنریٹر کا سہارا نہیں تھا۔ ساتھ میں ایک بزرگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ جب بجلی کٹی تو وہ اسمائے حسنی کا ورد کرنے لگے۔ میری طبیعت بھی اللہ کی طرف متوجہ ہوئی کہ اس وقت تازہ تازہ مصیبت بجلی جانا تھی۔ اس میں طلبہ کا نقصان تھا۔ اس زمانہ میں ایک منٹ طلبہ کا نقصان گوارا نہیں تھا۔ ان بزرگ کے اسمائے حسنی ختم ہوتے ہوتے بجلی آ گئی۔ میں نے ان سے کہا کہ 'آپ نے اسمائے حسنی پڑھی ہے، میں نے دعا کی۔ اب یہ دعا کر دیجیے کہ بجلی جائے نہیں' چنانچہ اس دن پوری رات بجلی نہیں گئی۔

اور بھی اس کے تجربات ہیں۔ اللہ نے ہر نام میں ایک تاثیر رکھی ہے، جو صاحبِ معرفت ہوتے ہیں وہ ہر نام کی تاثیر کو جانتے ہیں۔ ایک بزرگ نے تجربات سے ہر نام کی تاثیر اور اس کے فوائد لکھے ہیں، اور وہ صحیح بھی ہوئے ہیں۔ ایک ناتواں بیمار آیا تو اسے بتایا کہ "یَا اَللّٰہُ یَا سَلَامُ" پڑھا کرو، وہ تندرست بھی ہو گیا اور طاقت بھی آ گئی۔

میں بیمار تھا، فالج کا حملہ تھا۔ دعائیں خوب ہو رہی تھیں، اور اس کا فائدہ بھی ہو رہا تھا، مگر ہاتھ کام نہیں کر رہے تھے۔ ایک وکیل صاحب نیک آدمی ہیں، وہ عیادت کے لیے آئے۔ دیکھ کر کہنے لگے کہ 'مولانا! آپ کے پاس طلبہ بہت ہیں، ان سے سوا لاکھ مرتبہ 'یا سلام' پڑھوا کر دعا کروا لیجیے، ان شاء اللہ دعا قبول ہوگی۔ اس کے دوسرے دن میرے ایک دوست آئے، بڑے نیک آدمی ہیں۔ وہ موجود نہیں تھے۔ جب انھیں میری بیماری کا علم ہوا تو بھاگے ہوئے آئے، اور کہنے لگے کہ 'آپ مجھے کچھ بتا دیجیے، جو میں پڑھوں۔' میں نے کہا کہ 'کل وکیل صاحب آئے تھے، اور حضرت مرزا مظہر جان جاناں کا تجربہ بتایا تھا۔ میں نے سوچا کہ طلبہ کیا پڑھیں گے، اب آپ خود پوچھ رہے ہیں تو یہی بتا دیتا ہوں۔' وہ اللہ کے بندے گئے اور گھر کے چار افراد کو ساتھ لے کر چوبیس گھنٹے میں اسے پورا کر لیا۔ پہلے میں اپنی چارپائی کے پاس ہی نماز پڑھتا تھا۔ فرض نماز کھڑے ہو کر اور بقیہ سنتیں بیٹھ کر ادا کرتا تھا۔ اُدھر صبح تک ان کی سوا لاکھ تسبیح مکمل ہوئی، اِدھر میں

فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے کے قابل ہوگیا، اور ایسی صحت ہوگئی کہ نمازیں اطمینان سے ادا کرنے لگا۔ اور پھر مزید صحت ہوتی چلی گئی۔ جب میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ کی دعا سے اتنا فائدہ ہوا تو طلبہ سے ایک بار اور پڑھوایا، تاکہ رہی سہی کسر بھی پوری ہوجائے۔

ایک غیر مسلم میرے پاس آتا ہے۔ میں اسے بتادیا کہ "هُوَ الْهَادِیُ" پڑھا کرو۔ ایک ہفتہ سے پڑھ رہا ہے اور اس کی تاثیر بھی ظاہر ہورہی ہے۔ اللہ کے تمام ناموں کا ایک اثر ہوتا ہے جو ظاہر ہوکر رہتا ہے۔

لفظ 'ھو' اللہ کا ایک مستقل نام ہے:

ہماری بیعت کا تعلق سلسلۂ قادریہ سے ہے۔ ہمارے شیخ پاکستان میں ہیں۔ اس سلسلہ میں لفظ "ھو" اللہ کا ایک مستقل نام ہے۔ یہاں آیت کریمہ میں "ھو الله" کہا گیا ہے۔ 'ھو' بھی ہے اور 'الله' بھی ہے۔ یہ موصوف صفت کی ترکیب نہیں ہے بلکہ دونوں لفظ مستقل ہیں۔ اردو میں بولتے ہیں 'وہی سب کچھ کرتا ہے'۔ یہ 'وہی' 'ھو' کا ترجمہ ہے۔ کوئی نہیں پوچھتا کہ 'وہی' سے کیا مراد ہے؟ اگر 'وہ' کہیں تو فوراً مرجع کا مطالبہ ہوتا ہے۔ حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی نے فرمایا کہ 'اسمائے الٰہی میں ایک نام 'ھُو' بھی ہے۔' جہاں اللہ کے رسول ﷺ نے اسمائے حسنیٰ یعنی ننانوے اچھے اچھے نام گنائے ہیں، اس میں 'ھو' بھی موجود ہے۔

اللہ کے معنیٰ 'من موہن':

اللہ سے ہمارا تعلق دو طرح کا ہے۔ ایک تعلق تو عبادت کا ہے۔ عبادت کہتے ہیں محبت کے ساتھ انتہائی تضرع اختیار کرنا۔ لفظ 'اللہ' 'اِلٰہ' سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں 'انتہائی گہرا تعلق'۔ اللہ ہر قلب کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اسی لیے حضرت مولانا فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی فرمایا کرتے تھے کہ 'جانتے ہو اللہ کے کیا معنی ہیں؟' پھر فرماتے 'اللہ کا معنی ہے 'من موہن'۔ یعنی من کو موہ لینے والا۔ دل کو اپنی طرف کھینچ لینے

والا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا "لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذاً خَلِيْلِيْ غَيْرَ رَبِّيْ لَاتَّخَذْتُ اَبَابَكْرٍ خَلِيْلاً" (رواہ البخاری) اگر میں اللہ کے علاوہ کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا۔ 'خِلّت' ایسی محبت کو کہتے ہیں جس میں ہر محبت کی حد ختم ہوگئی ہو۔ انتہائی محبت کا استحقاق صرف اللہ کی ذات کو ہے۔ "وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبّاً لِلّٰهِ" (سورہ بقرۃ آیۃ ۱۶۵) اور ایمان والے اللہ کی محبت میں بہت سخت ہوتے ہیں۔

اصل محبت اللہ سے ہے:

ایمان والے اللہ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ کائنات میں کوئی کسی سے اتنی محبت نہیں کرسکتا جتنی محبت ایمان والے اللہ سے کرتے ہیں۔ اللہ کے علاوہ کسی اور سے کوئی محبت اور تعلق ہے تو وہ اصل نہیں ہے، وہ سب اللہ کی محبت کے تابع ہے۔

حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کی دو بیویاں تھیں۔ ان کا مزاج تھا کہ اللہ کی محبت میں سب کچھ رد کردیا کرتے تھے۔ ایک بار ایک اہلیہ کہنے لگیں کہ 'آپ کو ہم سے کچھ محبت تھوڑا ہی ہے۔ شوہر بیوی کی ہر بات مانا کرتا ہے، اور لوگوں کی طرح آپ کو ہم سے تعلق نہیں ہے۔ آپ چوں کہ اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ کا حکم ہے، اس لیے اللہ کی محبت میں ہم لوگوں کے حقوق ادا کررہے ہیں، ورنہ ہم سے کوئی محبت نہیں۔' مولانا نے فرمایا کہ 'بات تو صحیح ہے کہ ہم اللہ کی محبت میں تمھارے حقوق کی ادائیگی کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی تو سنو کہ جن لوگوں کی محبت اللہ کی محبت کے واسطے سے نہیں ہوتی، ان کی محبت جذباتی ہوتی ہے، اس میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ جب تک جذبات ہیں تو بیوی حور پری، جب جذبات ذرا سرد ہوئے تو وہی چڑیل معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور جن لوگوں کو اللہ کی محبت کے واسطے سے بیوی سے محبت ہوتی ہے، اس میں اتار چڑھاؤ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ احکامِ الٰہی میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں، ہمیشہ یکساں سلوک رہتا ہے۔ کیوں کہ اللہ کا یہی حکم ہے۔'

کمبخت ایک ہندو شاعر تھا، کہنے لگا کہ 'میری بیوی ایسی ہے کہ آتی ہے تو مجھے کوئی خوشی نہیں ہوتی، اور جاتی ہے تو کوئی رنج نہیں ہوتا۔' یہ بیوی کی تعریف ہے یا توہین! یہ

بیوی کیا رہی بکری ہو گئی، جس کے آنے جانے سے اس پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن جہاں محبت اللہ کے لیے ہو گی وہاں محبت ہمیشہ باقی رہے گی۔ جو ربط ہو وہ اللہ کے واسطے ہو۔ اللہ کی محبت اصل ہے۔ وہ جس سے کہیں گے اس سے ہم محبت کریں گے۔

خود اللہ کے رسول ﷺ کا یہ حال تھا کہ ازواج مطہرات میں گھل مل کر باتیں ہو رہی ہیں۔ اذان کی آواز آجاتی تو ایسا لگتا کہ کسی کو پہچانتے نہیں۔

حضرت شاہ وصی اللہ صاحب کے کوپا گنج کے ایک مرید تھے۔ بڑے امانت دار، لوگ ان پر اتنا ہی اعتماد و اطمینان بھی کرتے تھے۔ مگر ان کا یہ عالم تھا کہ دیگ چڑھی ہے، کھانا جل رہا ہے، ترازو سے سامان تول رہے ہیں، اگر اذان ہو جاتی تو سب کام چھوڑ دیتے، کوئی کام نہیں کرتے۔ ان کا یہ معاملہ سب کو معلوم تھا، اس لیے لوگ ان سے ویسا ہی معاملہ کرتے کہ اذان کے وقت ان کو کوئی پریشانی نہ ہو۔

اصل چیز اللہ کی محبت ہے۔ اسی کے سامنے سر جھکانا، اسی کی عبادت کرنا، کوئی اس کے علاوہ عبادت کے لائق نہیں۔ باقی کسی کو کم طاقت دی گئی ہے کسی کو زیادہ۔ فرشتے بہت طاقت ور ہوتے ہیں مگر یہ سب اپنی طاقت میں اللہ کے محتاج ہیں۔

غیب کا علم صرف اللہ کو ہے:

”عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ“ غیب کہتے ہیں ”مَا غَابَ عَنَّا“ جو ہماری نگاہوں سے غائب ہو۔ ہمارے اعتبار سے جو چیز غائب ہے وہ غیب میں داخل ہے۔ غیب کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اللہ کے اعتبار سے بھی غائب ہو۔ اللہ کے یہاں تو کچھ غائب ہے ہی نہیں، وہاں سب کچھ حاضر ہی حاضر ہے۔ ”لَا تَخْفىٰ مِنْهُ خَافِيَةٌ“ (سورۃ الحاقۃ آیۃ ۱۸) اس سے کوئی چیز مخفی نہیں۔ جو چیز ہم نہیں دیکھ رہے ہیں، جہاں تک ہماری رسائی نہیں ہے، جسے ہم سن نہیں سکتے، اللہ وہ سب جانتے ہیں۔ اور شہادت جو ہمارے سامنے ہے۔ اللہ وہ بھی جانتا ہے۔ شہادت میں بھی ہم سب کچھ نہیں جانتے۔ درخت میں کتنے پتے ہیں، بارش کے قطرات، پہاڑوں کا وزن، یہ وہ چیزیں ہیں جسے ہم نہیں جانتے۔

”یَعۡلَمُ مَا فِی الۡاَرۡحَامِ“(سورہ لقمان آیۃ ۳۴)اور ماں کے پیٹ میں جو ہے اللہ اسے جانتا ہے۔

ایک صاحب کہنے لگے کہ ‘یہ بات اب اللہ کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ اب مشینوں کے ذریعے یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ پیٹ میں کیا ہے؟’ ہم نے کہا کہ ‘آپ کی مشین کا کیا اعتبار! آئے دن مشین سے تحقیق کی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ مشین کہتی ہے کہ بچہ ہے اور بچی پیدا ہوتی۔’ ایک صاحب نے ہم سے کہا کہ ‘دعا کر دیجیے کہ لڑکا پیدا ہو۔’ ہم نے کہا ‘ٹھیک ہے مگر جو بھی ہو وہ اللہ کی نعمت ہے۔’ پیدایش کے قریب اس نے الٹرا ساؤنڈ کرالیا۔ ہم نے منع بھی کیا تھا مگر وہ نہیں مانا۔ اس میں لڑکی نکلی۔ ہم نے اسے سمجھایا کہ ‘جو بھی ہے وہ اللہ کی رحمت ہے۔’ خیر جب پیدائش ہوئی تو لڑکا تھا۔ اس طرح کے کئی واقعات ہو چکے ہیں، جس سے مشین کا کوئی اعتبار نہیں رہ جاتا۔ دوسرے یہ کہ وہ زیادہ سے زیادہ یہی تو بتائے گی کہ لڑکا ہے یا لڑکی؟ اور اس کے علاوہ وہ مردہ ہوگا یا زندہ؟ زندہ ہوگا تو پاگل ہوگا، عقل مند ہوگا، عالم ہوگا، جاہل ہوگا، کیا کمائے گا، کیا کھائے گا، کیا کرے گا، کہاں جائے گا، کہاں مرے گا، اس طرح کے ڈھیروں سوالات، اس کی زندگی کی پوری تاریخ، یہ تو نہیں بتائے گی۔ جب کہ قرآن کہتا ہے ”یَعۡلَمُ مَا فِی الۡاَرۡحَام“ اللہ اس رحم کی پوری زندگی کے سارے حالات کو جانتا ہے۔

ایک نجومی نے ایک شخص کے بچے کے بارے میں بہت کچھ بتایا، اس کے تمام اچھے اوصاف کو بیان کر دیا کہ یہ بچہ ایسا ہوگا، ویسا ہوگا، تو اس نے ایک تھپڑ لگایا اور کہا کہ ‘کمبخت! اتنے سارے اوصاف بیان کر دیئے، یہ سب مذکر کے اوصاف ہیں۔ تم کو ابھی تک یہی نہیں معلوم ہوا کہ یہ بچہ ہے یا بچی؟’ تو غیب جاننے والے صرف خدا ہیں، اللہ کے علاوہ کوئی غیب کی بات نہیں جانتا اِلا یہ کہ کسی کو بتا دیں۔

اللہ کھلے چھپے ہر کام سے واقف ہے:

”عَالِمُ الۡغَیۡبِ وَالشَّھَادَۃِ“ اس میں امید کا بھی پہلو اور خوف کا بھی پہلو

ہے۔ خوف کا پہلو تو یہ ہے کہ آدمی چاہے جتنا چھپ کر عبادت کرے یا گناہ کرے، اللہ اسے جانتے ہیں۔

ایک نبی تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں سونے کا طشت ملا۔ انھوں نے اسے مٹی میں چھپا دیا۔ واپس آئے تو باہر پڑا تھا، پھر چھپا دیا۔ پھر کسی موقع سے باہر دیکھا، پھر چھپا دیا۔ اسی طرح موقع بموقع کئی بار چھپایا، اور وہ ہر بار باہر پڑا ہوا ملتا۔ تو اللہ سے پوچھا کہ ’خدایا! یہ کیا ماجرا ہے؟‘ اللہ نے فرمایا کہ ’میں اسے ظاہر کر کے تمھیں ایک بات بتاتا ہوں کہ ’تم نیکی چاہے جتنی چھپ کر کرو، میں اسے ظاہر کر دوں گا، تم مت ظاہر کرو۔‘

حضرت طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کے یہاں ایک مہمان آئے۔ کھانا اتنا نہیں تھا کہ میزبان بھی اس میں شریک ہو سکے۔ تھوڑا سا کھانا تھا۔ دوسری طرف عربوں میں یہ دستور تھا کہ مہمان بغیر میزبان کے نہیں کھاتا۔ انھوں نے اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ ’جب کھانے پر بیٹھوں تو تم چراغ درست کرنے کے بہانے اسے بجھا دینا۔‘ اندھیرا ہو گیا تو یہ خالی ہاتھ پلیٹ کی طرف بڑھاتے اور پھر منہ میں لے جاتے، اور اخیر تک ایک لقمہ بھی نہیں کھایا مگر مہمان کو احساس دلاتے رہے کہ کھانے میں وہ بھی شریک ہیں۔ جس کام کی خبر سامنے بیٹھنے والے کو نہ ہو سکی، اللہ نے اسے ایسا ظاہر کیا کہ رہتی دنیا تک اسے جان گئی۔ ”وَيُوثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ“(سورہ حشر آیة ۹) وہ لوگ اپنے اوپر (دوسروں کو) ترجیح دیتے ہیں گو خود ان کو کتنی ہی سخت حاجت ہو۔

جنگ کا موقع ہے۔ ضرورت ہے کہ ہر ایک اپنی قدرت کے بقدر اس میں مدد کرے۔ کچھ لوگ آئے، ان کے پاس اپنی جان کے سوا کچھ بھی موجود نہیں۔ کہنے لگے کہ ’سواری مل جائے تو ہم بھی چلیں۔‘ مگر وہاں تو ایک سواری میں کئی لوگ شریک ہیں، انھیں کہاں سے لا کر دیا جاتا۔ دیکھا کہ ہم اس عبادت میں شریک ہونے سے محروم رہیں گے تو بے اختیار آنسو نکل گئے۔ دعا کرنے لگے کہ ’یا اللہ! ہمارے پاس سواری موجود نہیں ہے مگر خدایا! ہم کو کسی نے تکلیف دی ہو تو ہم اسے معاف کرتے ہیں۔‘ ادھر یہ ہوا، ادھر وحی کے

ذریعہ ان کی تعریف ہونے لگی" وَلَا عَلَى الَّذِينَ اِذَا مَا اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا اَجِدُ مَا اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَاَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ"۔ (سورہ توبہ آیۃ ۹۲) اور ان پر بھی کوئی حرج نہیں جو آپ کے پاس آتے ہیں کہ آپ انھیں سواری مہیا کر دیں تو آپ جواب دیتے ہیں کہ میں تو تمھاری سواری کے لیے کچھ بھی نہیں پاتا تو وہ رنج و غم سے اپنی آنکھوں سے آنسو بہاتے ہوئے لوٹ جاتے ہیں کہ انھیں خرچ کرنے کے لیے کچھ بھی میسر نہیں ہے۔

خوف کی فضا یہ ہے کہ اللہ ہمارے سارے کاموں کو جانتا ہے، خواہ ہم کتنوں چھپ کر کریں، وہ اسے ظاہر کر دیں گے۔ "يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرِ" (سورہ مومن آیۃ ۱۹) وہ آنکھ کی خیانت اور دلوں کے بھیدوں کو جانتا ہے۔ اس لیے آدمی کو ڈرنا چاہیے کہ کوئی گناہ نہ ہو۔

یہ تو خوف کی فضا تھی۔ امید کی فضا یہ ہے کہ وہ ہمارے نیک اعمال نہیں جانے تو اس کی جزا کون دے گا۔ اس لیے اس کا جاننا ضروری ہے۔

مجھے اس پر یاد آ رہا ہے کہ حدیث میں آتا ہے کہ 'اللہ نے پہاڑوں کو پیدا کیا تو فرشتوں نے پوچھا کہ 'بار الٰہا! اس سے زیادہ کوئی اور مخلوق مضبوط اور طاقت ور ہے؟ فرمایا 'ہاں، لوہا اس سے زیادہ مضبوط ہے۔ اس سے پہاڑ کو کاٹا جا سکتا ہے۔' کہنے لگے کہ 'اس سے زیادہ طاقت ور تو کوئی اور مخلوق نہیں ہوگی؟' فرمایا 'اس سے زیادہ طاقت ور آگ ہے۔ پھر اسی طرح اس سے طاقت ور پانی ہے۔ اس سے طاقت ور ہوا ہے۔' اب سنیے! اس سے بھی زیادہ طاقت ور کا نام! 'اس سے زیادہ طاقت ور مومن کے داہنے ہاتھ کا وہ صدقہ ہے جو اس طرح دیتا ہے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی ہے۔' اتنا اِخفا کا اہتمام کیا گیا کہ کسی کو خبر نہیں ہوتی، لینے والے کو معلوم نہیں ہو سکا کہ کس نے دیا؟ حتی کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہوتی۔ اب اگر خدا کے علم میں بھی نہ آئے تو اس کی جزا کون دے گا؟ اس لیے امید کا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے کاموں کو جانتا ہے، ہمارے اچھے کاموں کا اچھا بدلہ ملے گا۔ "وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا" (سورہ کھف آیۃ

۴۹) جو کچھ کرے گا (اچھا یا برا) وہاں موجود پائے گا۔ "فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ "(سورہ زلزال آیة ۸/۷) پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔

یہ اللہ کی وہ نگاہ ہے جس سے رائی برابر چیزیں بھی مخفی نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ عشا کی نماز پڑھ رہے تھے۔ امام نے نماز میں سورہ 'زلزال' پڑھ دی۔ امام صاحب پر ایک حال طاری ہوگیا، نماز ہوگئی۔ امام صاحب داڑھی پر ہاتھ رکھے کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے کہ 'اے وہ پروردگار! جو بھلائی کا بدلہ بھلائی سے اور برائی کا بدلہ برائی سے دے گا، اپنے بندے نعمان پر رحم فرما'۔ مسجد کے سارے لوگ چلے گئے۔ مؤذن انتظار میں رہا کہ حال ختم ہو تو چراغ وغیرہ بجھا کر جائے۔ دیر ہوگئی اور حال ختم نہیں ہوا۔ بالآخر وہ چلا گیا، جب فجر کے وقت آیا تو دیکھا کہ امام صاحب اسی حال میں کھڑے ہیں، داڑھی پکڑے ہوئے ہیں اور چراغ اسی طرح جل رہا ہے۔ جس چراغ میں رات میں تیل موجود نہیں تھا وہ پوری رات اسی طاقت کے ساتھ جل رہا تھا! فجر کا وقت ہوگیا تھا، مؤذن نے اذان دیدی۔ جیسے ہی اذان کے کلمات کان میں پڑے، حال ختم ہوگیا، اور چراغ بھی گل ہوگیا۔ امام صاحب گھر گئے اور ایسے فریش ہوکر آئے کہ معلوم ہوتا تھا کہ پوری رات سوکر آئے ہوں۔ مؤذن نے امام صاحب کے انتقال کے بعد اس واقعہ کو نقل کیا۔ اسے امام یافعی نے نقل کیا ہے۔

"هُوَ الرَّحْمَانُ الرَّحِيْمُ" رحمان کا تعلق دنیا وآخرت دونوں سے ہے۔ اور رحیم کا تعلق صرف آخرت سے ہے۔ یہ جملہ بھی ایسا ہے کہ اس میں امید وخوف دونوں کا پہلو موجود ہے۔ جب وہ رحیم ہے تو ہر ایک کے ساتھ رحمت ہر طرح کی ہوسکتی ہے۔ ظالم ومظلوم کے ساتھ یکساں معاملہ رحمت کے خلاف ہے۔ مظلوم پر رحمت کا تقاضہ یہ ہے کہ ظالم کو سزا دی جائے، ورنہ ظالم کو سزا نہ ملے اور دونوں جنت میں چلے جائیں تو مظلوم کے ساتھ کیا انصاف ہوا؟ اور خود ظالم کو سزا دینا، یہ بھی ظالم پر رحمت ہی کے تقاضے

سے ہوتا ہے۔

”اَلْمَلِكُ“ وہی بادشاہ ہے۔ دنیا کے جتنے بادشاہ ہوئے ہیں، ان کی بادشاہت کی کیا حقیقت ہے۔ آج ہے کل ختم۔ ابھی سب کا بادشاہ بنا ہوا ہے، پبلک خلاف ہوگئی یا موت آگئی تو منٹوں میں بادشاہت ختم۔ وہی اکیلا بادشاہ ہے جو ہمیشہ سے ہے اور کبھی اس کی بادشاہت ختم نہیں ہوگی۔

”اَلْقُدُّوْسُ“ ہر ایسی چیز جو شان پاک کے مناسب نہیں، اللہ اس سے پاک ہے۔

”اَلسَّلَامُ“ لوگوں کو سلامتی دیتے ہیں۔

”اَلْمُوْمِنُ“ اللہ ہی امن دیتے ہیں۔

”اَلْمُهَيْمِنُ“ اللہ ہی ہر چیز کے محافظ ہیں۔

ایک بزرگ حضرت عزیر کہیں تشریف لے جارہے تھے۔ ایک بستی پر گزر ہوا جسے کسی بادشاہ نے ویران کردیا تھا۔ اسے دیکھ کر کہنے لگے ”اَوْ كَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا قال اَنّٰى يُحْيِىْ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِئَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ“۔(سوره آل عمران آية ۲۵۹) یا اس شخص کے مانند کہ جس کا گزر اس بستی پر ہوا جو چھت کے بل اوندھی پڑی ہوئی تھی۔ وہ کہنے لگا کہ اس کی موت کے بعد اللہ تعالیٰ اسے کس طرح زندہ کرے گا؟ تو اللہ نے اسے ماردیا سو سال کے لیے، پھر اٹھایا۔

اللہ نے فوراً دکھایا۔ اسی وقت ان کی موت ہوگئی۔ یہ ایسی جگہ تھی کہ کوئی ان کو دفن کرنے والا بھی نہیں تھا۔ ان کی سواری کا گدھا بھی مرگیا۔ سو سال تک ایسے ہی مردہ پڑے رہے۔ گدھا مکمل سڑ گل گیا، ہڈیاں چمکنے لگیں۔ ان کے ساتھ ایک ٹوکری تھی، جس میں انجیر اور شہد وغیرہ تھا۔ اس میں سو سال گزرنے پر بھی کوئی تغیر نہیں ہوا۔ سو سال بعد جب اللہ نے زندہ کیا تو پوچھا کہ ”كَمْ لَبِثْتَ “کتنے دن اس حال میں رہے؟ ان کو خیال آیا کہ صبح آیا تھا اور ابھی سورج ڈوب رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک دو دن۔ کہا ”قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ“ اللہ نے فرمایا کہ نہیں ”قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِئَةَ عَامٍ “(سوره آل

عمران آیة ۲۵۹) **مکمل** سو سال تک اس حال میں رہے۔ جس چیز کی اللہ کی طرف سے حفاظت ونگرانی کی گئی وہ سو سال تک **مکمل** محفوظ رہی۔ کھانا سڑا گلا نہیں۔ خود ان کے بدن میں کہیں کوئی اثر نہیں تھا اور گدھا ختم ہو چکا تھا۔

ہمارے ایک دوست تھے۔ ایک بار تیز آندھی چلی، جس سے درخت گر گئے، راستے بند ہو گئے۔ ان کے چھت پر لکڑیاں رکھی ہوئی تھیں، وہ ادھر سے ادھر ہو گئیں، مگر اسی چھت پر ایک ٹوکری میں کھانے کا کچھ سامان رکھا ہوا تھا، وہ ٹوکری جوں کی توں پڑی رہی:

''جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے''

''اَلۡعَزِیۡزُ'' غلبہ والا ہے۔ ہر شے پر غالب ہے۔ کوئی شے ایسی نہیں جو اللہ کے ہاتھ کو پکڑ لے۔

''اَلۡجَبَّارُ'' بہت ہی قوت والا ہے۔ ہر شکستہ چیز کو جوڑنے والا ہے۔ بیمار جو موت کے قریب ہو جائے اسے جِلا دے۔

''اَلۡمُتَکَبِّرُ'' بڑائی والا ہے۔ بڑائی صرف اسی کے لیے زیبا ہے۔ باقی ساری مخلوقات کمزور ہیں۔ اگر ان میں بڑائی آجائے تو یہ جھوٹے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ فرماتا ہے کہ ''اَلۡکِبۡرِیَاءُ رِدَائِیۡ وَالۡعَظۡمَةُ اِزَارِیۡ فَمَنۡ نَازَعَنِیۡ وَاحِداً مِنۡهُمَاقَذَفۡتُه فِی النَّارِ''(اخرجه الامام احمد وابوداؤد وابن ماجه) بڑائی میری چادر ہے اور عظمت میری ردا ہے۔ جو مجھ سے چھیننا چاہے گا اسے میں جہنم میں ڈال دوں گا۔

''سَبۡحَانَ اللّٰهِ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ'' اللہ ان چیزوں سے پاک جسے مشرکین بیان کرتے ہیں۔

''هُوَاللّٰهُ الۡخَالِقُ الۡبَارِئُ'' خالق کہتے ہیں ڈھانچہ تیار کرنے والے کو۔ اور باری کہتے ہیں اس میں روح ڈال کر متحرک کرنے والے کو۔ اللہ ہی ہیں جو چیزوں کو پیدا کرتے ہیں، اس کا ڈھانچہ بناتے ہیں، پھر اس میں روح ڈال کر اسے متحرک کرتے ہیں، اور مختلف کاموں پر لگاتے ہیں۔

”اَلۡمُصَوِّرُ“ وہ صورت بنانے والے ہیں۔ پانی کا ناپاک قطرہ ہوتا ہے، اس پر کتنی اچھی صورت بناتے ہیں۔ جانوروں کا پانی ہو تو جانوروں کی صورت، انسان کا پانی ہو تو انسان کی صورت۔ پھر اللہ کے کارخانے میں اتنی شکلیں موجود ہیں کہ اربوں کھربوں انسان ہیں اور سب کے پاس آنکھ، کان، ناک ہے مگر باوجود اس کے ہر ایک میں تھوڑا تھوڑا فرق رکھا ہے، جس سے ایک دوسرے سے پہچانا جا سکے۔ یہ تصویر بنانا صرف اللہ کی شان ہے، اس کے علاوہ کوئی اور بنائے گا تو مار کھائے گا۔

”لَهُ الۡاَسۡمَاءُ الۡحُسۡنىٰ“ اس کے بہت سے اچھے اچھے نام ہیں۔ جو کچھ زمین و آسمان میں ہیں، سب اس کی تسبیح پڑھتی ہیں، خواہ زبانِ حال سے ہو یا زبانِ قال سے۔ اور واقعہ یہی ہے۔ ہمارے اعتبار سے یہ چیزیں نہ بولتی ہوں مگر اللہ کی یہ ساری چیزیں تسبیح پڑھتی ہیں۔ اور اللہ ہر ایک کی زبان اور اس کی تسبیح کو سمجھتا ہے۔ ”وَاِن مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ وَلٰکِن لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِيۡحَهُمۡ“ (سورہ بنی اسرائیل آیۃ ۴۴) ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو اسے پاکیزگی اور تعریف کے ساتھ یاد نہ کرتی ہو۔ ہاں مگر یہ ہے کہ تم ان کی تسبیح (زبان) نہیں سمجھتے۔ پیغمبروں کی صحبت سے بہت سے لوگوں نے سنا بھی ہے۔ صدیق اکبر ؓ نے فرمایا کہ ’ہم حضور ﷺ کے ساتھ کھانا کھا رہے ہوتے اور کھانے کی تسبیح سن لیتے تھے۔‘

”وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ“ وہ عزت اور غلبے والا ہے۔

”اَلۡحَكِيۡمُ“ حکمت والا ہے۔ فرمایا ”وَمَا خَلَقۡتَ هٰذا بَاطِلًا“ (سورۃ نساء آیۃ ۱۹۲) سب چیزیں حکمت کے تقاضے سے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہ آئے تو اس سے سروکار نہیں۔ ہم نہ سمجھ کر کہہ دیں کہ یہ کیوں پیدا کر دیا، اس کے پیدا کرنے میں کیا مصلحت تھی۔

ہم نے بچپن میں پڑھا تھا کہ ایک صاحب نے چوہا کی مینگنیاں دیکھی تو کہنے لگے کہ ’اسے پیدا کرنے میں کیا حکمت تھی؟‘ کچھ دنوں کے بعد ان کے پیٹ میں درد ہوا۔

حکیم صاحب کے پاس گئے۔ حکیم صاحب نے نسخہ لکھا۔ جب دوکاندار کے پاس گئے تو وہ دیگر دواؤں کے نکالنے کے بعد ہنس کر کہنے لگا کہ 'ایک دوا ہمارے پاس نہیں ہے، وہ آپ کے گھر مل جائے گی۔ وہ کیا چیز تھی؟ یہی چوہے کی مینگنیاں تھی۔ تب ان کی سمجھ میں بات آئی کہ میں نے جو تحقیر کی تھی، وہی سمجھایا گیا ہے۔

''وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ'' وہ کمال قدرت کی وجہ سے سب پر غالب ہے اور کمال حکمت کی وجہ سے اس کا سب کام حکمت کے عین مطابق ہے۔ کسی کو اعتراض کی مجال نہیں ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک بزرگ کے کپڑے پر چھپکلی نے پیشاب کر دیا۔ کہنے لگے کہ 'اللہ نے اسے کس کام کے لیے پیدا کیا ہے؟ ندا آئی کہ 'چھپکلی بھی پوچھ رہی ہے کہ آپ کس کام کے لیے بنائے گئے ہیں؟' نہ یہ اس کی حکمت جانے اور نہ وہ اس کی حکمت جانے، سب کی حکمت اللہ جانتے ہیں۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی فرماتے ہیں کہ 'ہرگز ہرگز اللہ کے کسی کام پر اعتراض نہ کرو، ورنہ اللہ کا غضب نازل ہو جائے گا۔'

اللہ ہم سب کو سمجھ عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمين

❑❑❑

۲۵ر شوال المکرّم ۱۴۲۷ھ بروز سنیچر، بعد نماز مغرب
بمقام مدرسہ فلاح المسلمین گواپوکھر بھوارہ مدھوبنی

رسول اللہ ﷺ کی خاص صفت

شفقت ورحمت

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہ وَنَسْتَعِیْنُہ وَنَسْتَغْفِرُہ وَنُوْمِنُ بِہ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہ وَ مَن یُّضْلِلْہ فَلَا ھَادِیَ لَہ۔ وَنَشْھَدُ اَن لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہ لَا شَرِیْکَ لَہ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مَحَمّداً عَبْدُہ وَرَسُوْلُہ اَرْسَلَہ بِالْحَقِّ بَشِیْراً وَنَذِیْراً ۔ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہ وَاَصْحَابِہ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً۔
اَمَّابَعْدُ:

فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمان الرحیم

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللّٰہِ لِنْتَ لَھُمْ وَلَوْ کُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْھُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَھُمْ وَشَاوِرْھُمْ فِیْ الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلٰی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ(١٥٩)[سورہ آل عمران]

ترجمہ: **پس اللہ کی طرف سے مہربانی کی وجہ سے تم ان کے واسطے نرم ہو گئے، اور اگر تم بدخو اور سخت دل ہوتے تو یہ تمھارے پاس سے کنارہ ہو جاتے۔ ان کو معاف کر دو، ان کے لیے مغفرت طلب کرو، اور ان سے معاملات میں مشورہ کرو۔ جب تم نے عزم کر لیا تو اب اللہ پر بھروسہ کرو، بلاشبہ اللہ بھروسہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔**

عبدیت کے لیے علم اور ادب دونوں ضروری ہے:

رسول اکرم ﷺ دنیا میں تشریف لائے تاکہ دنیا آپ پر ایمان لائے اور آپ کی

پیروی کرے۔ پیروی تو ہر عمل میں کرنی ہے مگر کچھ بنیادی باتیں ایسی ہیں جن میں پیروی ہوجائے تو باقی اور تمام پر چلنا آسان ہوجائے۔

اللہ نے اپنے رسول کی صفات وحالات اور آپ کے مزاج وطبیعت کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ اللہ کا بیان ہے اور ظاہر ہے کہ نبی کی سیرت ومزاج کو بیان کرنے میں اللہ کا بیان کتنا اہم ہوگا۔ کیوں کہ اللہ نے نبی کے مزاج کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالا ہے، تو ان سے بڑھ کر کون واقف ہوگا؟ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَادِیْبِیْ وَعَلَّمَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمِیْ“۔ (اوردہ الشوکانی فی الفوائد المجموعۃ) میرے رب نے مجھے بہترین ادب سکھایا اور میرے رب نے مجھے عمدہ ترین تعلیم دی۔ اس حدیث میں علم اور ادب کی تصریح کی گئی ہے کہ مجھے یہ دونوں چیزیں اللہ نے سکھلائی ہیں۔ علم اور ادب کی اہمیت سب لوگ جانتے ہیں۔ آدمی انھیں دونوں چیزوں سے آدمی بنتا ہے۔ پڑھا لکھا نہ ہو مگر باادب ہو، یا عالم ہو اور بے ادب ہو، یہ دونوں کچھ معتبر نہیں۔ اللہ نے اپنے رسول کو یہ دونوں چیزیں بدرجہ اتم عطا فرمائی ہیں۔ پھر تمام انسانوں کو آپ ہی سے علم اور ادب دونوں سیکھنے ہیں۔ اگر آپ سے علم نہیں سیکھا تو محروم ہے، وہ نہیں جان پائے گا کہ اللہ کی رضامندی کس چیز میں ہے؟ اور ناراضی کس چیز میں ہے؟ اور اگر ادب نہیں سیکھا تو وہ بے ادب ہے ”مَغْضُوْبُ عَلَیْھِمْ“ (جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا) میں داخل ہوگا۔

آیت جو میں نے تلاوت کی ہے اس میں اللہ تبارک وتعالی نے نبی کے مزاج اور طبیعت کا ایک رنگ بیان کیا ہے۔ تمام صفات اور خصایلِ حمیدہ کی بنیاد اسی رنگِ طبیعت پر ہے، اسے اچھی طرح سمجھنا اور یاد رکھنا چاہیے۔

اُمتِ اِجابت اور اُمتِ دعوت:

حضور اکرم ﷺ تن تنہا نہیں بلکہ آپ کے ساتھ پوری قوم اور جماعت تھی۔ آپ کو دو طرح کی جماعتوں سے سابقہ تھا، ایک وہ جماعت تھی جو آپ پر ایمان رکھتی تھی، آپ

کی باتوں کو مان رہی تھی۔ اصطلاحاً اسے 'امتِ اجابت' کہا جاتا ہے۔ اور دوسری جماعت وہ تھی جو آپ کو نہیں مانتی تھی بلکہ آپ کی مخالفت کے درپے تھی۔ یہ 'امتِ دعوت' تھی۔ یعنی ایک جانثاروں کی جماعت تھی اور دوسری مخالفین کی جماعت تھی، ان دونوں سے آپ کا سابقہ تھا۔ ان دونوں جماعتوں کے ساتھ آپ کا کیا طرزِ عمل رہا؟ وہی اس آیت میں بتایا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی صفتِ خاص:

ایک جگہ ارشاد ہے "وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِيْنَ" (سورة الانبياء آية ۱۰۷) اور ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔ اللہ کی خاص صفت رحمان ورحیم ہے، اسی سے متصف ہوکر حضور ﷺ دنیا میں تشریف لائے۔ ساری دنیا اللہ کی رحمت کے سائے میں ہے، تو حضور کی رحمت کے سائے میں بھی ہوئی۔ آپ تمام عالم کے لیے، مخالفین کے لیے بھی اور موافقین کے لیے بھی رحمت بنا کر بھیجے گئے۔ یہ رحمت آپ میں کہاں سے آئی؟ اللہ فرماتے ہیں "فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ" اللہ کی خاص مہربانی ہے کہ تمھارے مزاج میں نرمی ہے، سختی نہیں ہے۔ مزاج کی نرمی کو اللہ نے اپنی رحمت کی طرف منسوب کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ "اِنَّ الرِفْقَ لَا يَكُوْنُ فِيْ شَيْئٍ اِلَّا زَانَه وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَيْئٍ اِلَّا شَانَه" (صحيح مسلم) نرمی جس چیز میں بھی ہوتی ہے اسے زینت بخش دیتی ہے اور جس چیز سے بھی نرمی نکال دی جاتی ہے اسے بدصورت کر دیتی ہے۔ دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے "اِنَّكَ لَعَلىٰ خُلُقٍ عَظِيْمٍ" (سورة القلم آية ۳) اور بے شک تو بہت بڑے (عمدہ) اخلاق پر ہے۔ یعنی آپ کے اخلاق کا دائرہ سارے عالم کے لیے ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی رحمتِ عام:

اللہ نے آپ کو ایسا نرم بنایا تھا کہ جانوروں پر بھی آپ کی مہربانی کا اثر تھا۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضور ﷺ کے پاس کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے، ایک بوڑھا اونٹ آیا اور سیدھا حضور ﷺ کے پاس پہنچ گیا، اور اپنی زبان میں کچھ کہنے لگا۔ ہم ان جانوروں کی زبان نہیں سمجھتے مگر جسے اللہ سمجھ عطا فرما دے، وہ ان کی زبان سمجھتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام پرندوں کی بولی سمجھتے تھے، آپ کو جانوروں کی بولی کا علم عطا ہوا تھا۔ اونٹ نے کچھ کہا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ’اونٹ کا مالک کون ہے؟‘ وہ صاحب مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ ’یہ تمھاری شکایت کر رہا ہے کہ اب میں بوڑھا ہو گیا، بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہوں، تو میرا مالک مجھے بھوکا رکھتا ہے۔‘ آپ نے انھیں تنبیہ کی کہ ’اسے کھانا کھلایا کرو یا اسے بیچ دو۔‘

آپ ﷺ کے اخلاق اور رحمت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ“ (رواہ احمد ومالك والبخاری فی الادب المفرد) میں اس لیے مبعوث ہوا ہوں کہ عمدہ اخلاق کی تکمیل کروں۔ اور اسے آپ نے مکمل کر دیا۔ آپ بہتر سے بہتر اخلاق کی تعلیم دیتے اور خود بھی بہتر اخلاق کا برتاؤ کرتے تھے۔ اس عمدہ اخلاق کا سرچشمہ یہ ہے کہ مزاج میں نرمی تھی۔ آپ اپنے کسی صاحبزادے یا نواسے کو پیار کر رہے تھے کہ ایک صاحب کہنے لگے کہ ’یا رسول اللہ! آپ بچوں سے پیار کرتے ہیں؟ میرے پاس تو دس بچے ہیں، میں نے کسی کو بوسہ تک نہیں دیا‘ آپ نے فرمایا کہ ’اللہ نے تیرے دل سے رحمت نکال دی ہے تو میں کیا کروں؟‘

امورِ شریعت میں مداہنت جائز نہیں:

الغرض آپ بہت نرم دل تھے، کہیں کہیں آپ کو سختی کا بھی حکم دیا گیا ہے ”وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ“ (سورة توبه آیة ۷۳) اور آپ ان پر (کفار و منافقین پر) سخت ہو جائیں۔ مگر یہ امر غالباً وجوب کا نہیں تھا۔ اسی لیے جہاں مناسب موقع ہوتا آپ نرمی فرماتے۔ گناہوں کی سزاؤں میں مداہنت جائز نہیں ہے، اگر جرم ثابت ہو جائے تو سزا

دی جائے گی۔ آپ اس مسئلہ میں بہت زیادہ صاحب عزیمت تھے کہ یہ اللہ کا قانون ہے۔

بنی مخزوم کے معزز گھرانے کی ایک خاتون نے چوری کرلی، جرم ثابت ہوگیا۔ حکم ہوا ہاتھ کاٹا جائے۔ بڑے گھرانے کی عورت تھی، لوگوں کو خیال ہوا کہ ایک تو عورت ہے، دوسرے بڑے گھرانے کی ہے۔ ہاتھ کاٹنے سے بڑی سبکی ہوگی۔ لہٰذا کسی طرح اس سے بچالیا جائے، مگر ظاہر ہے کہ کس کی ہمت تھی کہ حضور ﷺ کے پاس اس کی سفارش لے کر جائے۔ لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا اور طے کیا کہ زید بن حارثہ کے صاحبزادے حضرت اسامہ کو حضور ﷺ کے پاس بھیجیں۔ کیوں کہ حضور اکرم ﷺ نے زید بن حارثہ کو ایک وقت میں منہ بولا بیٹا بنالیا تھا اور وہ بیٹے کی طرح عزیز تھے۔ ان کی شہادت کے بعد ان کے بیٹے حضرت اسامہ کو آپ بہت عزیز رکھتے تھے۔ خود حضرت زید بن حارثہ کا واقعہ بھی مزاج نبوی کے نرمی کی دلیل ہے۔ انہیں بچپن میں دشمنوں نے گھر سے اٹھالیا تھا، اور مکہ لاکر بیچ دیا تھا۔ حضرت حکیم بن حزام نے جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے رشتہ دار تھے، خرید لیا تھا، اور حضرت خدیجہ کو ہدیہ کردیا تھا۔ جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا آپ سے نکاح ہوا تو حضرت زید رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے پاس آگئے۔ اُدھر اُن کے ماں باپ اپنے بچے کی یاد میں پریشان جہاں سراغ ملتا فوراً پہنچ جاتے۔ کچھ لوگوں نے ان کو بتایا کہ تمھارا بچہ مکہ میں نظر آیا ہے۔ ان کے والد تلاش کرتے ہوئے حضور ﷺ کے پاس آئے، اور کہا کہ 'یہ ہمارا بچہ ہے، اسے ڈاکوؤں نے اٹھالیا تھا۔ آپ کا جو مال خرچ ہوا ہے، ہم دینے کے لیے تیار ہیں، آپ جس قدر مال چاہیں ہم سے لے لیں، مگر ہمارا بچہ ہمیں واپس کردیں۔' آپ ﷺ نے فرمایا کہ 'مجھے آزاد کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اور مجھے تمھارے مال کی بھی ضرورت نہیں ہے، مگر آپ ذرا خود زید سے پوچھ لیں، وہ جانا چاہے تو شوق سے اسے لے جائیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وحی کا نزول شروع نہیں ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے زید کو بلایا اور پوچھا کہ 'یہ تمھارے والد ہیں؟' انھوں نے اقرار کیا کہ

'ہاں'، آپ ﷺ نے فرمایا کہ 'یہ تمھیں لینے آئے ہیں۔' باپ نے سمجھایا کہ تم میرے ساتھ چلو۔ حضرت زید بن حارثہ تھوڑی دیر سوچتے رہے پھر بولے کہ 'میں انہیں چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ یہاں مجھے ماں باپ دونوں کی شفقت حاصل ہے۔' باپ پریشان کہ غلامی کی زندگی کو یہ پسند کرتا ہے۔ جب آپ نے حضرت زید کا انکار اور نہ جانے پر اصرار دیکھا تو آپ نے ان کے والد کے سامنے انھیں غلامی سے آزاد کر دیا اور اپنا بیٹا بنا لیا۔ باپ کی آنکھ میں شکریہ کے آنسو آ گئے۔ ان کی شہادت غزوۂ موتہ میں ہوئی۔ یہ عرب تھے اور خوبصورت تھے مگر ان کی بیوی ام ایمن حبشی تھیں۔ حضرت اسامہ کالے پیدا ہوئے۔ لوگ شک کرنے لگے کہ یہ زید کے لڑکے ہیں یا نہیں؟ اس سے آپ ﷺ کو بہت رنج ہوا کہ لوگ زید کے بارے میں بدگمان ہیں، بڑی محبت تھی ان سے آپ کو۔

ایک بار باپ بیٹا چادر اوڑھ کر سوئے ہوئے تھے، صرف دونوں کا پاؤں کھلا ہوا تھا۔ اس زمانہ میں قیافہ شناسوں کا ایک مقام تھا، وہ شکل دیکھ کر بتا دیا کرتے تھے کہ کون کیسا ہوگا؟ (میں نے بھی بچپن میں اس فن کی کتابیں پڑھی ہیں) یہ دونوں حضرات سوئے ہوئے تھے، ایک کا پاؤں کالا اور دوسرے کا گورا تھا۔ ایک بڑا قیافہ شناس ادھر سے گزرا، اور بولا کہ 'یہ دونوں باپ بیٹے ہیں۔' آپ ﷺ کو قیافہ شناس کی اس گفتگو سے بڑی مسرت ہوئی۔ کیوں کہ دونوں سے آپ کو بے پناہ محبت تھی، قیافہ شناس کی بات سے لوگوں کا شک دور ہو گیا۔

آپ حضرت اسامہ سے بڑی محبت فرماتے تھے۔ ایک بار کہیں جانا ہوا، حضرت اسامہ کو بھی ساتھ لے جانا تھا مگر یہ ابھی تیار نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے روانگی نہیں ہو رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ اسامہ کی وجہ سے تاخیر ہو رہی ہے۔ کسی نے کہہ دیا کہ 'اس ناک چپٹے سے حضور اتنی محبت فرماتے ہیں؟' یہ بات آپ کو معلوم ہوئی تو آپ کو رنج ہوا۔

الغرض بنی مخزوم کی عورت پر حد لگنا طے ہو گیا تھا۔ لوگوں نے مشورہ سے حضرت اسامہ کو سفارش کے لیے تیار کیا کہ حضور ﷺ کو ان سے بڑی محبت ہے، ان کی بات کا لحاظ

ضرور کریں گے۔ آخر حضور ﷺ ان کے دادا بھی تو تھے۔ یہ جب سفارش کے لیے گئے اور حضور ﷺ کے سامنے اپنی بات رکھی تو چہرۂ انور سرخ ہوگیا، آپ فرمانے لگے کہ ’اگلی امت اسی وجہ سے ہلاک ہوئی کہ ان کے یہاں پیمانہ ایک نہیں تھا۔ بڑے لوگوں اور معمولی حیثیت کے لوگوں کے لیے احکام کے پیمانے الگ الگ تھے۔ یہاں خدا کا حکم سب پر یکساں ہے۔‘ بنی مخزوم کی عورت کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ’اگر نبی کی بیٹی فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرے تو اس کا بھی ہاتھ کاٹا جائے گا۔‘ اللہ کا ارشاد ہے ”لَا تَاخُذُكم بِهِمَا رَافَةٌ فِيُ دِيُنِ اللّٰه“ (سورة النور آية ۲) ان پر اللہ کی شریعت کی حد جاری کرتے ہوئے تمھیں ہرگز ترس نہ کھانا چاہیے۔ یعنی نفاذِ دین میں ذرا بھی نرمی نہیں آنی چاہیے، تاکیداً منع فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ کی رافت، ثبوتِ جرم سے قبل:

آپ ﷺ حد کے نفاذ میں کوئی نرمی نہیں برتتے تھے، مگر جرم کے ثبوت سے پہلے چاہتے تھے کہ کوئی صورت ایسی نکل آئے کہ حد کا نفاذ نہ ہو۔ یہ مزاج میں نرمی کی وجہ سے تھا۔ ایک صاحب آئے کہنے لگے کہ ’یا رسول اللہ! مجھ سے غلطی ہوگئی، میں نے زنا کرلیا ہے۔‘ یہ خود اقرار کررہے ہیں، مگر حضور ﷺ نگاہیں پھیر لیتے ہیں، وہ ادھر سے آتے ہیں، آپ ﷺ نے دوسری طرف اپنا رخ پھیرلیا، دوتین بار اسی طرح ہوا، بالآخر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ’کیا یہ شخص پاگل ہے؟‘ کہا گیا کہ ’نہیں پاگل نہیں ہے‘۔ پوچھا ’شراب پی رکھی ہے؟‘ لوگوں نے منہ سونگھا، اس کی بو موجود نہیں تھی۔ پھر آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ ’جانتے ہو زنا کیا ہے؟‘ انھوں نے بصراحت اقرار کرلیا تب جاکر نفاذِ حد کا فیصلہ ہوا۔

اجرائے حد کے بعد آپ ﷺ کی کیفیت:

ایک شخص نے چوری کی، جب اس کا ہاتھ کاٹا گیا تو چہرۂ انور مرجھا گیا۔ کسی نے پوچھا کہ ’اس کی وجہ سے آپ کو تکلیف ہے؟‘ فرمانے لگے ’کیوں نہیں ہو؟ امت کا ایک فرد ہے، اس کے درد کا احساس نہیں ہوگا؟ البتہ یہ اللہ کا حکم ہے جو نافذ ہو رہا ہے۔ اگر

میرے پاس آنے سے پہلے خود ہی درگذر کرلیا کروتو یہ نہ ہو۔‘

سزا دینے کا حکم ہے مگر اس کی اجازت نہیں ہے کہ جسے سزا دی جارہی ہو اسے برا بھلا کہا جائے، نہیں زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ وہی صاحب جنھوں نے آکر اپنے گناہ کا اقرار کیا تھا اور انہیں سزا ملی، تو کسی نے انہیں برا بھلا کہہ دیا۔ حضور ﷺ کو سخت ناگواری ہوئی اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ ’تم اسے برا کہہ رہے ہو اور حال یہ ہے کہ وہ جنت کی نہروں میں غوطہ زن ہے۔‘

آپ ﷺ کی شفقت کی کوئی حد و نہایت نہیں:

تو حدود کے معاملہ میں آپ صاحبِ عزیمت تھے، اس کے علاوہ مزاج میں بے حد نرمی تھی۔ حضرت زاہر بدوی ایک صحابی ہیں، بڑے بھولے بھالے ہیں۔ حضور ﷺ کے دربار میں آتے تو آپ ان سے خوش طبعی بھی کر لیتے تھے، اور یہ بھی ایسی حرکات کیا کرتے تھے جس سے ہنسی آئے۔ یہ دیہات سے ہدیہ میں گھی، پنیر وغیرہ لاتے تھے اور آپ قبول کرلیا کرتے تھے۔ ایک بار پانچ آدمیوں کو لے کر آئے اور عرض کیا کہ ’ان کا قرض ادا کردیجیے۔‘ آپ ﷺ نے فرمایا ’کیسا قرض؟ میں نے تو ان سے کبھی قرض نہیں لیا۔‘ کہنے لگے ’واہ! جو ہدیہ میں آپ کو پیش کیا کرتا تھا وہ انہیں لوگوں سے لے کر آپ کو دیا کرتا تھا۔‘ آپ ﷺ مسکرانے لگے اور ان لوگوں کا قرض ادا کردیا۔

یہ بڑے سیدھے تھے، کبھی شراب پی لیا کرتے۔ چار پانچ بار پکڑے بھی گئے اور مار بھی پڑی۔ ایک بار حضرت عمرؓ کہنے لگے کہ ’اس پر اللہ کا غضب نازل ہو کہ بار بار مار پڑتی ہے اور شراب سے توبہ نہیں کرتا۔‘ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ’ایسا مت کہو، اسے اللہ اور اس کے رسول سے محبت ہے۔‘ آپ ﷺ کے اس کلمہ کی برکت سے پھر کبھی انھوں نے شراب کو دوبارہ ہاتھ نہیں لگایا۔

ایک صاحب آئے اور عرض کیا کہ ’یا رسول اللہ! رمضان کے دن میں بیوی سے جان بوجھ کر مل لیا ہوں، اب کیا ہوگا؟‘ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ’کفارہ ادا کرو۔‘ یعنی ایک

غلام آزاد کرو۔ کہنے لگے کہ ’اپنی اس گردن کے علاوہ کسی کا مالک نہیں ہوں۔‘ آپ ﷺ نے نہ ڈانٹا اور نہ خفا ہوئے، فرمایا کہ ’دو مہینے مسلسل روزہ رکھو۔‘ کہنے لگے کہ ایک مہینے کے روزہ میں تو یہ مصیبت آئی ہے، دو مہینے مسلسل روزہ میں کیا ہوگا؟‘ حضور ﷺ نے پھر بھی کچھ نہیں کہا، فرمایا کہ ’اچھا، ساٹھ مسکین کو کھانا کھلا دو۔‘ انھوں نے عرض کیا کہ ’میں خود ہی مسکین ہوں، کہاں سے کھانا کھلاؤں؟‘ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود حضور ﷺ نہ ناراض ہوتے ہیں اور نہ کوئی بات کہتے ہیں۔ اتفاق سے اسی مجلس میں ایک صاحب خاصی مقدار میں کھجور لے کر آئے، اور آپ ﷺ کو پیش کیا۔ آپ ﷺ نے وہ کھجوران صاحب کو دے کر فرمایا کہ ’اسے لے جاؤ، اور مدینہ کے غریبوں میں تقسیم کردو۔‘ کہنے لگے کہ ’خدا کی قسم پورے مدینہ میں مجھ سے زیادہ کوئی غریب نہیں ہے۔‘ آپ ﷺ مسکرانے لگے اور فرمایا کہ ’جاؤ تم ہی استعمال کرو، مگر دوسروں کے لیے یہ حکم نہیں ہوگا۔‘

حضرت مولانا ضمیر احمد صاحب جلال پوری ایک بڑے اچھے مقرر تھے۔ فرما رہے تھے کہ ’ایک بار رمضان شریف میں شدید گرمی تھی، افطار کے وقت ایک بوڑھے شخص چبوترے پر پانی چھڑک کر افطاری کا سامان لیے بیٹھے تھے۔ ابھی وقت نہیں ہوا تھا۔ بڑے میاں افطار کے سامان کے علاوہ ایک حقہ بھی ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ’میں گذر رہا تھا تو انھوں نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ ’مولانا! ابھی حقہ پی سکتے ہیں یا نہیں؟‘ میں نے کہا ’نہیں‘، انھوں نے کہا کہ ’ایک دو کش بھی نہیں؟ اس سے کیا فرق پڑ جائے گا؟‘ میں نے کہا کہ ’ایک دو کش بھی نہیں پی سکتے۔‘ کہنے لگے ’جا مولوی! اگر حضور ﷺ ہوتے تو کہہ دیتے کہ ایک دو بار بلا لو (ایک دو کش لے لو) اور واقعہ یہی ہے کہ اگر ذرا بھی گنجایش ہوتی تو آپ ﷺ کی طرف سے اجازت مل جاتی۔

ایک عورت آ کر کہنے لگی کہ ’میرا شوہر عجیب ہے۔ نماز پڑھتی ہوں تو مارتا ہے، روزہ رکھتی ہوں تو تڑوا دیتا ہے، اور خود سورج کے طلوع کے وقت اٹھتا ہے۔‘ اگر ہم اور آپ ہوتے تو بتایئے اس موقع پر ہمارا کیا حال ہوتا؟ مگر حضور ﷺ کو ذرا بھی غصہ نہیں آیا۔

آپ ﷺ نے اس کے شوہر کو بلا کر پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ ’حضور! نماز کے لیے مارنے کا کیا سوال ہوتا ہے؟ البتہ میرے پاس صرف ایک ہی بیوی ہے۔ رات میں نفل نماز لمبی پڑھتی ہے، دو دو سورتیں ایک ایک رکعت میں پڑھتی ہے۔ میں مزدور آدمی ہوں، تھک کر آتا ہوں اور انتظار کرتا ہوں۔ کبھی کبھی لمبی نماز پڑھنے سے منع کرتا ہوں۔ اور پھر یہ نفل روزے بھی خوب رکھتی ہے۔ تو رات اس طرح گذری اور دن بھی روزہ سے گذر جاتا ہے، تو کبھی کبھی روزہ تڑوا دیتا ہوں۔‘ آپ ﷺ نے منع فرمادیا کہ ’اتنی لمبی نماز نہ پڑھا کرے اور شوہر کی اجازت کے بغیر نفل روزہ بھی نہ رکھا کرے۔‘ پھر اس نے کہا کہ ’تھک کر آتا ہوں، گہری نیند لگ جاتی ہے۔ فجر کے وقت بیدار نہیں ہو پاتا، جب آنکھ کھلتی ہے تو فوراً نماز پڑھ لیا کرتا ہوں۔‘ آپ ﷺ نے کوئی سختی نہیں فرمائی، فرمایا کہ بس ٹھیک ہے، ’جب نیند کھلے نماز پڑھ لیا کرو۔‘ ”مَنْ نَامَ عَنْ صَلَاةٍ اَوْنَسِیَهَا فَلْيُصَلِّهَا اِذَا ذَكَرَهَا فَاِنَّ ذَالِكَ وَقْتُهَا۔“ (متفق علیه) جو شخص نماز کے وقت سوتا رہا یا نماز پڑھنا بھول گیا تو جب اسے یاد آئے پڑھ لے۔ کیوں کہ وہی اس کا وقت ہے۔

نوجوان صحابی کی ذہانت:

ایک عورت حضرت عمر ؓ کے دربار میں آکر کہنے لگی کہ ’میرا شوہر بڑا اچھا آدمی ہے، رات بھر نماز پڑھتا ہے اور دن بھر روزہ رکھتا ہے۔‘ حضرت عمر ؓ خوش ہوئے کہ تیرا شوہر واقعی بڑا اچھا ہے، تم اس کی خوب خدمت کیا کرو اور اس کی نافرمانی مت کرو۔

جب وہ جانے لگی تو ایک نوجوان صحابی بیٹھے ہوئے تھے، وہ کہنے لگے کہ ’امیر المومنین! اس عورت نے اپنے شوہر کی تعریف نہیں کی ہے بلکہ شکایت کی ہے کہ رات بھر نماز میں اور دن بھر روزہ میں مشغول رہتا ہے، اور بیوی کی ضرورت کا خیال نہیں رکھتا۔‘ آپ نے عورت کو بلایا اور پوچھا تو معلوم ہوا کہ واقعی یہی بات ہے۔ آپ نے اس کے شوہر کو بلایا اور پوچھا تو اس نے بھی اقرار کیا کہ ’مجھے عبادت کا بہت شوق ہے۔‘ حضرت عمر ؓ نے ان نوجوان صحابی سے کہا کہ ’اس کا سوال تم نے سمجھا ہے تو اس کا فیصلہ بھی

تمھیں کرو۔' تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ 'شوہر تین رات اللہ کی عبادت کرے اور ایک رات بیوی کے پاس گزارے، اور اسی طرح تین دن روزہ رکھے اور ایک دن افطار کرے۔' حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ 'یہ فیصلہ کہاں سے اخذ کیے ہو؟' تو انھوں نے بتایا کہ 'چار بیوی کی اللہ کی طرف سے اجازت ہے۔ اس طرح ایک بیوی کی باری چوتھے دن پر آتی ہے۔ اس لیے میں نے ایسا فیصلہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر ان کی بہت تعریف کی اور فرمایا کہ 'تم بہت ذہین آدمی ہو، سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ تمہاری ذہانت عورت کے سوال کو سمجھنے میں زیادہ تھی؟ یا اس کے جواب میں؟'

آمدم برسر مطلب:

خیر موضوع سے ہٹ گیا۔ بتا یہ رہا تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ بہت زیادہ نرم مزاج تھے۔ اور یہی اثر صحابہ کرام میں بھی تھا۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جلالی تھے۔ ایک صاحب نے پوچھا کہ 'بچوں کے ساتھ ان کا کیا معاملہ ہے؟' بتایا گیا کہ 'بچے ان کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں۔' تو انھوں نے کہا کہ 'تب وہ سخت نہیں ہیں۔' خود حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ 'میرے مزاج میں اتنی نرمی ہے کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے تو میرا کپڑا اتار لیں، اور اللہ کے معاملہ میں اتنی سختی ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے تو میرے سامنے کھڑے نہ ہوں۔' یہ تربیت تھی اللہ کے رسول ﷺ کی۔

اگر آپ ﷺ سخت مزاج ہوتے تو فتح مکہ کے موقع پر ہر ایک کا سر کاٹ دیتے۔ "فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ" آج ہم اس آیت کی تلاوت کر رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مزاج کی یہ نرمی ہمارے اندر بھی آنی چاہیے۔ سختی زیبا نہیں ہے جو چیزوں میں عیب لگاتی ہے۔ بعض صحابی کبھی کبھی سخت ہو جایا کرتے تھے، جیسے ہی تنبہ ہوتا فوراً نرم ہو جاتے۔ ذرا احساس نہیں ہوتا کہ یہ وہی ہیں جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی تربیت کا اثر:

حضرت اُبی بن کعب سید القرا تھے۔ اتنا اچھا قرآن پڑھتے تھے کہ ایک بار

حضور ﷺ کو حکم ہوا کہ اُبی کو سورہ "لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا" سنائیں۔ آپ ﷺ نے حضرت اُبی سے فرمایا کہ 'اللہ کا حکم ہوا ہے کہ میں تمھیں قرآن سناؤں۔' حضرت اُبی ؓ نے عرض کیا کہ "اَللّٰہُ سَمَّانِی" "اللہ نے میرا نام لے کر کہا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ 'ہاں، اللہ نے تمہارا نام لے کر کہا ہے۔' فرطِ مسرت سے رونے لگے۔ (صحیح مسلم)

لوگ دور دور سے حضرت ابی ؓ کے پاس آتے تھے اور ان سے قرآن سیکھتے تھے۔ کوئی وقت خالی نہیں رہتا تھا۔ ایک مصری نوجوان آیا اور ضد کرنے لگا کہ مجھے سکھائیے، تو ناراض ہوگئے۔ جلالی تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قاری حضرات بہت جلالی ہوتے ہیں۔ طالب علم بھی کوئی کم جلالی نہیں تھا، گھٹنوں کے بل قبلہ رو ہوگیا اور کہنے لگا کہ 'یا اللہ! میں آپ سے شکایت کرتا ہوں، میں مصر سے ان کے پاس قرآن پڑھنے آیا ہوں، مگر یہ مجھے ڈانٹتے ہیں۔' اتنا سننا تھا کہ حضرت ابی ؓ ایک دم نرم پڑ گئے۔ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اتنا ناراض تھے۔ تھرا گئے، فرمانے لگے کہ 'رکو رکو! شکایت مت کرو۔' پھر اس سے ایک ہفتہ کی مہلت لی اور فرمایا کہ 'ایک ہفتہ زندہ رہا تو تمھیں ضرور پڑھاؤں گا۔'

طلبِ صادق شرط ہے:

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے یہاں ایک طالب علم آیا۔ آپ صرف دورہ والوں کو پڑھاتے تھے۔ مطبخ کا انتظام نہیں تھا۔ یہ ذمہ داری لوگوں کے سر تھی کہ جو طالب علم آتا تھا اس کا انتظام کسی کے یہاں کر دیا جاتا تھا۔ ہر آدمی ایک ایک طالب علم کو لے جاتا۔ یہ طالب علم آیا اور کہا کہ 'میں پڑھنا چاہتا ہوں۔' آپ نے فرمایا کہ 'پڑھنا تو ٹھیک ہے، مگر ہمارے یہاں مزید آدمی کا انتظام نہیں ہے۔ ہر ایک کے یہاں طالب علم ہو چکے ہیں۔' اس نے کہا کہ 'میں دور سے آیا ہوں، مجھے صرف پڑھنا ہے، روٹی کی فکر نہیں ہے۔ کچھ مل گیا تو کھا لوں گا اور نہیں ملا تو خدا سے کہوں گا کہ 'خدایا! کھلانا نہیں تو زندہ کیوں رکھے ہیں؟ روح لے لیجیے، زندہ مت رکھیے۔' طالب علم کی یہ بات سنی تو آپ نے اسے

روک لیا۔ اتنے میں حکیم ضیاء الدین کے یہاں سے بھیجا ہوا آدمی اسلام پور سے آیا اور کہا کہ کسی طالب علم کا اگر انتظام نہ ہوا ہو تو ہمیں دیدیجیے۔ چنانچہ اس طالب علم کا انتظام ہو گیا۔

نرم مزاجی کی آپ ﷺ نے وصیت فرمائی ہے:

حضور ﷺ کے مزاج میں یہ خاص بات تھی کہ آپ بہت نرم طبیعت کے مالک تھے۔ اور جب یہ صفت انسان میں ہوگی تو وہ بہت اعلیٰ انسان ہوگا۔ اللہ نے فرمایا ”وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ“ اگر تمھارے قلب میں سختی ہوتی تو تمہارے پاس ایک شخص بھی نہیں ٹھہرتا، سب بھاگ کھڑے ہوتے۔ یہی آپ کا مزاج تھا اور یہی تعلیم ساری امت کے لیے ہے۔ باپ، بیٹا، شوہر، بیوی، بھائی، بہن ہر ایک کے لیے لازم ہے کہ نرمی کا پہلو اختیار کرے۔ اسی لیے استاذوں پر یہی حکم ہے کہ وہ طلبہ پر نرمی کریں۔ طلبہ کو بھی یہ حکم ہے۔ صحابہ سے حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ ’میرے جانے کے بعد دور دور سے لوگ تمھارے پاس پڑھنے کے لیے آئیں گے، تم ان کے بارے میں میری طرف سے بھلائی کی وصیت قبول کرو۔‘

دشمنوں کے ساتھ آپ ﷺ کی نرم مزاجی:

صفوان بن امیہ، وہب بن عمیر کو پہاڑ پر لے گیا اور تنہائی میں کہا کہ ’میرے باپ کو محمد نے قتل کیا ہے، تم جو چاہو، مانگو، میں دینے کے لیے تیار ہوں۔ جس طرح بھی ہو محمد کو قتل کر دو۔‘ وہب بن عمیر نے کہا کہ ’اگر تم چھ ماہ تک میرے گھر کا انتظام کر دو تو میں یہ کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔‘ صفوان نے انتظام کی ذمہ داری لے لی۔ پھر اس نے ایک زہریلا چاقو لیا، اتنا زہریلا کہ اس سے صرف ہلکا سا زخم لگانا ہی کافی ہو۔ چاقو لے کر مدینہ آیا۔ حضرت عمر ؓ بھانپ گئے کہ یہ اچھی نیت سے نہیں آیا ہے، اور لوگوں سے کہہ دیا کہ اس کی نیت اچھی نہیں لگتی، اس لیے ہر وقت اس کی نگرانی کی جائے۔ یہ اکیلا حضور ﷺ سے ملنا چاہتا تھا مگر لوگ اسے حضور تک پہنچنے نہیں دیتے تھے۔ حضور ﷺ کو اس کی اطلاع ملی

تو آپ نے فرمایا کہ 'آنے دو۔' آپ ﷺ کی اجازت کے بعد پھر کس کی ہمت تھی کہ منع کرے؟ یہ اکیلا حضور ﷺ کے پاس گیا۔ گفتگو شروع ہوئی تو آپ ﷺ نے اس سے پوچھا کہ 'فلاں پہاڑی پر صفوان بن امیہ کے ساتھ تم نے کیا طے کیا تھا؟' یہ چونکا، کہنے لگا 'کیا مطلب؟' آپ ﷺ نے فرمایا کہ 'ہاں ہاں تم نے کچھ طے کیا تھا، اور تم کیا چیز لے کر میرے پاس آئے ہو؟' اب یہ تھرا گیا۔ پوری صورت حال بیان کی اور کہنے لگا کہ 'وہاں تو ہم دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا موجود نہیں تھا اور آپ کو اس کی اطلاع ہوگئی۔ یقیناً آپ اللہ کے رسول ہیں اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا۔'

آپ ﷺ نے اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ فرمایا تو اس کی زندگی کی کایا پلٹ گئی۔ اگر سختی کا معاملہ ہوتا تو زیادہ سے زیادہ کیا ہوتا کہ اسے ختم کر دیا جاتا، مگر سختی نہیں برتی گئی تو اب یہ حال ہوگیا کہ وہ جانی دشمن آپ ﷺ کا گرویدہ ہوگیا، اور اب کہیں جا ہی نہیں سکتا۔ یہ نرمی اخلاق کی بنیاد اور تواضع کی جڑ ہے، اور جن کے ہاں یہ سنت زندہ ہے، لوگ ان کے گرویدہ ہوگئے ہیں۔

ہمارے اکابر کی اپنے مشایخ کے ساتھ گرویدگی:

ہمارے اکابر میں ایسے لوگ گزرے ہیں کہ ان پر لوگ ایسے گرویدہ ہوگئے کہ سب کچھ چھوٹ جانا منظور ہے مگر ان پر ایک آنچ آئے، منظور نہیں ہے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا بڑے بزرگ تھے۔ حضرت مولانا فضل الرحمان صاحب فرمایا کرتے تھے کہ 'امام ابوحنیفہ اور امام بخاری بہت بڑے تھے، خوب تعریف کرتے مگر اخیر میں فرماتے کہ خواجہ نظام الدین کی تو بات ہی دوسری ہے۔' ع

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

ایک بار حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی حضرت ضامن شہید کی بڑی تعریف کر رہے تھے، اتنی تعریف ہوئی کہ لوگوں کو شبہ ہونے لگا کہ ان کو اپنے پیر حاجی امداد اللہ صاحب سے بھی آگے بڑھا دیا۔ تعریف کرتے کرتے آخر میں فرماتے ہیں 'ہاں بھئی! مگر

ہمارے حاجی صاحب تو کچھ اور ہی ہیں۔'

کرامت کا صدور وظہور خالص اللہ کا فعل ہے:

ایک بار حضرت تھانوی حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوئے، کرامات کا تذکرہ چل پڑا۔ حضرت گنگوہی نے تیس کرامات بیان کیے۔ ایک صاحب بیٹھے تھے کہنے لگے کہ 'کیا یہ سب صحیح ہیں؟' یہ وہم ان لوگوں کو ہوتا ہے جو سمجھتے ہیں کہ یہ اولیا کا فعل ہے۔ اگر وہ یہ سمجھ لیں کہ یہ خالص اللہ کا فعل ہے تو کوئی اعتراض نہ ہو۔ ہمارے ایک دوست سعودی عرب میں پڑھتے تھے، کہنے لگے کہ 'ارے! ان بزرگوں کی کرامات کی بھی کوئی حد ہے؟' میں نے پوچھا کہ 'اللہ کے قدرت کی کوئی حد ہے؟' کہنے لگے کہ 'نہیں'، میں نے کہا کہ 'پھر بزرگوں کے کرامات کی بھی کوئی حد نہیں۔' یہ غلط فہمی اس لیے ہوتی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ کرامتیں ان بزرگوں کی طرف سے ہیں، حالانکہ یہ خالص اللہ کا فعل ہے۔ بزرگ ایک کام چاہتے ہیں، نہیں ہوتا، انبیا چاہتے ہیں، نہیں ہوتا، اور کبھی کبھی بغیر چاہے بڑے بڑے کام ہوجاتے ہیں۔ حضرت تھانوی کے پاس ایک صاحب آئے اور کہنے لگے کہ 'حضرت! کوئی تعویذ دیدیجیے اولاد نہیں ہورہی ہے۔' حضرت نے فرمایا کہ 'ارے اللہ کے بندے! اگر تعویذ سے اولاد ہوتی تو سب سے پہلے میں تعویذ نہیں پہن لیا ہوتا۔ میرے پاس دو دو بیویاں ہیں مگر کوئی اولاد نہیں۔'

میرے پاس ایک صاحب آئے، بیمار تھے۔ سوچا تھا کہ یہاں سے بیماری ٹھیک ہوجائے گی۔ وہ آئے تو میں دوا کھارہا تھا۔ مجھے دوا کھاتے دیکھ کر کہنے لگے کہ 'یہ تو خود ہی دوا کھاتے ہیں، مجھے کیا صحت دیں گے؟' میں نے کہا کہ 'تم ٹھیک کہتے ہو، میں خود ہی صحت کا محتاج ہوں دوسروں کو کیا دوں گا۔' یہ غلط فہمیاں اسی لیے ہوتی ہیں کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ سب کچھ ان بزرگوں کی طرف سے ہی ہوتا ہے۔

نرمی کی سنت اپنانے والوں کا حال:

میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کا تذکرہ کررہا تھا۔ بہت بڑے بزرگ

تھے۔ ان کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ ’کوئی ان کے پاس آنے کی نیت کرتا تو اس کے گناہ چھوٹ جاتے۔‘ انھیں بڑی فکر تھی کہ اسلام کی اشاعت کیسے ہو؟ اجودھیا میں تیرہ خلفا بھیجے، اور سب کی قبر وہیں بنی۔ فرمایا کرتے تھے کہ ’یہ اجودھیا کفرستان ہے۔‘ آج بھی اسی کی وجہ سے پورے ہندوستان میں شور شرابہ چل رہا ہے۔ انہیں بڑی فکر تھی اشاعت اسلام کی۔ ان کے ایک مرید تھے خواجہ برہان الدین۔ بہت بڑے عالم۔ ان سے فرمایا کہ ’برہان! تم دکن چلے جاؤ۔ ان کو اپنے شیخ کی جدائی گوارا نہیں تھی۔ عرض کیا کہ ’جاؤں گا تو نعلین چھوٹ جائے گی۔‘ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ٹھیک ہے ’جوتیاں بھی ساتھ لیتے جاؤ۔‘ دیکھا کہ وار خالی گیا تو کہنے لگے کہ ’یہ مجلس وہاں کہاں نصیب ہوگی؟‘ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ’یہ مجلس بھی لے جاؤ۔‘ لکھا ہے کہ ’سو بڑے عالم جن میں امیر سنجری جیسے لوگ تھے، سب کو خواجہ صاحب نے حکم دیدیا کہ سب برہان الدین کے ساتھ جائیں۔‘ یہ لوگ بھی کمال ہی کے تھے، سب کے سب چلے گئے، کسی نے انکار نہیں کیا، اور سب کی قبر مختلف علاقے میں بنی۔ یہ قافلہ جب نکلا تو ایک خوبصورت مقام پر قیام کیا، اور خواجہ برہان الدین کا وہیں انتقال ہوا۔ وہاں کے بادشاہ نے اس علاقہ میں شہر بسا دیا اور اس علاقہ کا نام برہان پور رکھ دیا۔ یہ بمبئی کے راستہ میں پڑتا ہے۔

خواجہ نظام الدین کی شفقت کا یہ عالم تھا کہ ایک دن کچھ لوگ دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ’ادھر سایہ ہے آ جاؤ!‘ لوگوں نے کہا کہ ’ٹھیک ہے حضرت! کوئی بات نہیں۔‘ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ’ارے! میرا بدن جلا جا رہا ہے اور تم لوگ کہتے ہو کہ ٹھیک ہے۔‘ دوسروں کی تکلیف کا ایسا احساس ہوتا ہے جیسے یہ خود اپنی تکلیف ہو۔ کھانا سامنے آتا، کریلا کی ترکاری ہوتی، ایک آدھ لقمہ کھاتے اور رونے لگتے اور فرماتے کہ ’اللہ کے بہت سے بندے ایسے ہیں جنھیں ایک لقمہ بھی نصیب نہیں ہوتا ہے۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ سب کو کھانا کھلاؤں، مگر کم از کم اتنا تو کرسکتا ہوں کہ ان کے اتباع میں مَیں بھی بھوکا رہوں۔‘ یہ تھا شفقت والا مزاج جو انہیں ملا تھا، اور یہ

انھیں چراغ نبوت سے ملا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کی شفقتِ بے پایاں:

رسول اللہ ﷺ کو بے شمار پریشانیاں لاحق ہوئیں، لوگوں نے مصیبتیں پیدا کیں، ایذائیں دیں مگر آپ ﷺ کبھی بددعا نہیں فرمائی۔ پوری زندگی میں سب سے نمایاں چیز آپ ﷺ کا اخلاق کریمانہ ہی ہے۔ ورنہ تکالیف کے موقع پر طاقت والوں کے لیے بددعا فرما سکتے تھے۔ فرماتے ہیں ’اللہ کا سب سے محبوب بندہ وہ ہے جو اللہ کی مخلوق کے ساتھ اچھا معاملہ کرتا ہو۔‘ مزید فرمایا کہ ’جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں، وہ قیامت میں مجھ سے سب سے زیادہ قریب ہوگا۔‘ آپ ﷺ نے بہت تاکید فرمائی، ہر ایک سے فرمایا کہ سختی کا معاملہ مت کرو۔

حضرت طلحہ انصاری ؓ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ اپنے غلام کو چھڑی سے مار رہے تھے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ ’میں مار رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی، ’اے طلحہ! جتنی قدرت تمھیں اس غلام پر ہے، اس سے زیادہ قدرت خدا کو تم پر ہے۔‘ کہتے ہیں کہ اس آواز کی ہیبت سے چھڑی نیچے گر گئی۔ پیچھے پلٹ کر دیکھا تو اللہ کے رسول ﷺ تشریف فرما تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ’طلحہ! اسے معاف کر دو۔‘ انھوں نے عرض کیا کہ ’یہ بہت غلطی کرتا ہے۔‘ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ’ستر بار بھی غلطی کرے تو اسے معاف کر دو۔‘ یہ انتہائی نرمی کا کرشمہ تھا۔ آپ اللہ کے لیے نرمی کیجیے، اللہ اس کی وجہ سے دوسروں کو نرم کر دے گا۔

رسول اللہ ﷺ کی خاص صفت:

حدیث میں ہے: عَنْ عَبْدِاللّٰہِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ ”اَلرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُھُمُ الرَّحْمَانُ، اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ“ (ترمذی، باب البر و الصلة) رحم کرنے والوں پر اللہ رحم فرماتے ہیں، تم لوگ زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم لوگوں پر رحم کرے گا۔ اللہ نے قرآن میں خاص بندوں کی جو صفت بیان فرمائی ہے، اس میں سب سے پہلا لفظ ’عباد الرحمان‘ ہے۔ یعنی ان بندوں میں بھی رحمت کی

صفت ہوتی ہے۔ یہ رحمان کے بندے ہیں تو خود بھی رحمت وشفقت والے ہوں گے۔ رحمان کے بندے زمین پر چلتے ہیں تو تواضع کے ساتھ چلتے ہیں۔ جو نرم مزاج ہوگا وہ تواضع کے ساتھ چلے گا۔ وہ لڑتے جھگڑتے نہیں ہیں بلکہ ایسی سلامتی کی باتیں کرتے ہیں جن سے کوئی جھگڑا نہ ہو۔ یہ مزاج کی نرمی اللہ اور اس کے رسول کو بہت پسند ہے۔ حکم ہے کہ سب کے ساتھ نرمی کا معاملہ ہو۔ ہر جگہ نرمی ہو، گھر والوں کے ساتھ، باہر والوں کے ساتھ، اپنوں کے ساتھ، غیروں کے ساتھ۔ یہ اللہ کے رسول کا نمایاں وصف ہے۔

اللہ نے فرمایا ”فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ“ یہ آیت بھی خاص موقع پر نازل ہوئی ہے۔ غزوہ احد میں پچاس سواروں کو پہاڑ کی گھاٹی پر مقرر کر دیا گیا اور کہہ دیا گیا کہ ہم ہاریں یا جیتیں، تمھیں یہاں سے ہلنا نہیں ہے۔ جنگ مسلمانوں نے جیت لی۔ جب ان لوگوں نے دیکھا کہ لڑائی ختم ہوگئی ہے اور ہمیں اپنی بہادری دکھانے کا موقع نہیں مل سکا، تو ان میں سے چالیس آدمی میدان جنگ کی طرف بھاگے۔ جو لوگ بہادر ہوتے ہیں انھیں صرف بہادری دکھانے کا موقع ملنا چاہیے، وہ موقع سے کبھی نہیں چوکتے۔

جب بہادر کو بہادری دکھانے کا موقع نہیں ملتا ہے تو اسے بے چینی ہونے لگتی ہے۔ جب ان پچاسوں صحابہ نے دیکھا کہ بہادری دکھانے کا موقع نہیں مل سکا تو چالیس نفر میدان جنگ کی طرف بھاگے اور دس باقی رہ گئے۔ ادھر خالد سیف اللہ جو ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے، اور کفار کی طرف سے لشکر کے ایک حصے کی قیادت کر رہے تھے، جب اس حصے کو خالی دیکھا تو پہاڑ کے پیچھے سے اس پر ہلّا بول دیا۔ بے خبری کا حملہ تھا، خالی نہیں گیا اور بالآخر جنگ کا پانسہ پلٹ گیا، اور اللہ کے رسول ﷺ زخمی ہوگئے اور بہت سے صحابہ شہید ہوگئے۔

یہ جنگی قوانین کے خلاف تھا، سب برخاست کر دیے جانے کے قابل تھے۔ آپ ﷺ کو بڑا تکدر رہا کہ پتہ نہیں یہ لوگ اعتماد کے قابل ہیں یا نہیں؟ اللہ سے شکایت تو نہیں کی مگر تکدر تھا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ ’اللہ کی رحمت سے انھیں معاف

کر دیجیے۔‘ اور صرف معاف ہی نہیں بلکہ ان کے لیے اللہ سے استغفار بھی کیجیے، اور ان پر اعتماد بھی کیجیے اور کاموں میں ان سے مشورہ بھی کیجیے۔ ظاہر ہے کہ مشورہ انھیں سے کیا جاتا ہے جو اعتماد کے قابل ہوں۔

حاصلِ کلام:

آج کے درس کا حاصل یہ ہے کہ ہم بھی اپنے اندر نرمی پیدا کریں۔ جہاں سختی کی بہت ضرورت ہو، وہاں بھی کوشش کر کے نرمی کا پہلو نکال لیں۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اگر نرم ہو جائیں گے تو لوگ سر پر چڑھ جائیں گے۔

اگر ہم اللہ واسطے نرمی اختیار کریں ”اِدْفَعْ بِالَّتِی ھِیَ اَحْسَنُ“ (سورۃ المومنون آیۃ ۹۶) پر عمل کریں تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ اور اگر خطرہ ہو تو اس کا بھی اللہ نے علاج بتایا ہے۔ فرماتے ہیں ”وَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ“ اللہ پر بھروسہ رکھو اس سے سارا کام بن جائے گا۔ ان شاء اللہ

اللہ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

* * *

۲۶؍شوال ۱۴۲۷ھ بروز اتوار بعد نماز مغرب
بمسجد مدرسہ فلاح المسلمین گواپوکھر مدھوبنی بہار

قرآن: ایک دولت بے بہا

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہ وَنَسْتَعِیْنُہ وَنَسْتَغْفِرُہ وَنُوْمِنُ بِہ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہ اللّٰہُ فَلَا مُضِلّ لَہ وَ مَن یُّضْلِلْہ فَلَا ھَادِیَ لَہ۔ وَنَشْھَدُ اَن لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہ لَا شَرِیْكَ لَہ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مَحَمّداً عَبْدُہ وَرَسُوْلُہ اَرْسَلَہ بِالْحَقِّ بَشِیْراً وَنَذِیْراً۔ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہ وَعَلٰی آلِہ وَاَصْحَابِہ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً۔ اَمَّا بَعْدُ:

فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمان الرحیم

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا(۷۰) یُصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَمَنْ یُطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا(۷۱)[سورۃ الاحزاب الجزء۲۲]

قرآن ایک نسخۂ کیمیا:

محترم بزرگو اور دوستو! ابھی عصر کی نماز کے بعد ایک جگہ وعظ تھا تو میں نے اس میں یہی آیت تلاوت کی تھی۔ وقت کم تھا اس لیے اس وقت مناسب سمجھتا ہوں کہ اس آیت کی تفسیر کردوں۔

اللہ تبارک وتعالی نے قرآن پاک میں انسانوں کے لیے ایک ایسا مختصر نسخہ تجویز فرمایا کہ اگر آدمی اس کو اہتمام سے اپنا لے تو ان شاء اللہ اس کے تمام مسائل دنیا کے بھی اور آخرت کے بھی حل ہو جائیں گے۔ اور حکیم کا کمال یہی ہے نسخہ مختصر ہو اور فائدہ زیادہ

ہو۔ حق تعالی سے بڑھ کر کوئی شخص احوال کا جاننے والا اور احوال کو کنٹرول کرنے والا نہیں۔ اللہ تعالی ہی احوال کو پیدا فرماتے ہیں اور وہی کنٹرول کرتے ہیں۔ تو انھوں نے جو نسخہ تجویز کیا ہوگا، جو طریقہ بتایا ہوگا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ مفید ہوگا۔ انسان کوئی نسخہ لکھے تو اس میں غلطی کا احتمال ہوتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نسخہ غلط لکھے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ طبیب نے مرض کو پہچانا ہی نہ ہو۔ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ آدمی بیمار ہوتا ہے، کوئی ڈاکٹر ایک نسخہ لکھتا ہے لیکن دوسرا ڈاکٹر اس کو رد کرتا ہے کہ اس نے مرض کو نہیں پہچانا۔ لہٰذا دوا صحیح نہیں تجویز کی۔ مریض کو یہ نقصان کرے گی۔ اسی طرح سے کبھی انسان مرض تو ٹھیک تشخیص کرلیتا ہے لیکن دوا کی تجویز میں اس سے غلطی ہوجاتی ہے۔ تو انسانوں کے یہاں ہر وقت غلطی کا احتمال رہتا ہے۔ لیکن اللہ کے یہاں غلطی کا کوئی احتمال نہیں۔ خدا تعالی قادر بھی ہیں، جاننے والے بھی ہیں، اپنے علم کی بنیاد پر جو نسخہ تجویز کریں گے وہ بالکل صحیح ہوگا۔ اور اپنی قدرت کی بنیاد پر نسخے کے اندر فائدہ رکھ دینا انھیں کا کام ہے۔ اس لیے قرآن کریم کی تعلیمات ایسا نسخہ ہے کہ اس میں کسی طرح کا ریب وتردد نہیں ہے، اور اسی نسخہ سے فائدہ اٹھا کر کتنے لوگ کامیاب ہوچکے ہیں۔ آج جن لوگوں کی کامیابی کے ہم لوگ گن گاتے ہیں اور لوگوں کے سامنے ان کی تاریخ پیش کرتے ہیں، ظاہر بات ہے کہ ان لوگوں نے اسی نسخہ کو استعمال کیا ہے اور اسی کو برتا ہے جس کا میں تذکرہ کررہا ہوں۔ لیکن ہم لوگ اس کو برت نہیں رہے ہیں۔ اگر ہم برتنے لگ جائیں تو ہمارے ساتھ بھی اللہ تعالی کی مدد ہمارے استعداد کے مطابق ہوہی جائے گی۔ ایسا نہ ہوگا کہ وہاں سے مدد نہ اترے اور وہاں سے کامیابی کا فیصلہ نہ ہو۔ ضرور ہوگا، لیکن بات یہ ہے کہ ہم برتتے نہیں۔ اور قرآن میں نہ جانے ایسے کتنے نسخے ہیں لیکن ہم اپنی غفلت کی وجہ سے جانتے نہیں، ہم کو پتہ نہیں۔ اللہ نے یہی ایک کتاب دنیا بھر کے لیے رکھ دی ہے کہ اگر کسی کو کچھ چاہیے تو اسی سے ملے گا۔ ہم نے اسی سے غفلت اختیار کرلی ہے۔ ہم کو اخبار کی مشغولیت ہے، ہم کو ریڈیو کی مشغولیت ہے، ہم کو ٹیلی ویژن کی مشغولیت ہے، ہم کو دنیا بھر کی اور

کتابوں کی مشغولیت ہے، لیکن جس کتاب کو اصل قرار دیا گیا.... اور درحقیقت کتاب وہی ہے۔ اللہ کے یہاں سارا دارومدار اسی کتاب کے اوپر ہے.... اس کو ہم نے ایک طرف کردیا ہے۔ ”وَقَالَ الرَّسُوْلُ يَا رَبِّ اِنَّ قَوْمِیْ اتَّخَذُوْاهٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا “(سورة الفرقان آية ۳۰) رسول کو شکایت ہے کہ ’اے میرے پروردگار! قرآن کو میری قوم نے چھوڑ دیا، ان لوگوں نے قرآن کو ترک کردیا۔‘ یہ شکایت تو اصلاً کفار کے متعلق ہے لیکن آج ہم دیکھیں تو ہمارے اوپر بھی یہ شکایت منطبق ہورہی ہے کہ ہم نے قرآن کو ترک کردیا ہے۔ قرآن ہمارے گھر سے اور ہماری زندگی سے نکل گیا ہے۔ ہم اس کا اہتمام اور اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ حالاں کہ اسی میں انسان کو مشغول ہونا چاہیے۔ رسول اکرم ﷺ نے تو اپنے زمانے میں کسی کو قرآن کے علاوہ کسی دوسری کتاب پڑھنے کی اجازت نہیں دی۔

حضرت عمر ﵁ کا واقعہ:

حضرت عمر ﵁ ایک مرتبہ یہودیوں کے مدرسہ میں چلے گئے۔ یہود میں بڑے بڑے علما تھے اور ان کے مدرسے بھی قائم تھے، لیکن ان کا دین منسوخ ہوچکا تھا، ان کی کتاب منسوخ ہوچکی تھی۔ حضرت عمر ﵁ کہیں سے گزرتے ہوئے ان کے مدرسہ میں چلے گئے تو جو کتاب وہ لوگ پڑھ رہے تھے، اس کو انھوں نے سنا۔ اس میں وہی مضامین تھے، وہی باتیں تھیں جو قرآن میں نازل ہورہی تھیں۔ حضرت عمر ﵁ کو یہ چیز بہت پسند آئی۔ ایک ورق اس میں سے لکھ کر لائے اور رسول اکرم ﷺ کو یہ کہہ کر سنانے لگے کہ ’یا رسول اللہ! جو بات آپ پر نازل ہوتی ہے، یہی بات تو ان کی کتاب میں بھی آچکی ہے۔‘ یہ کہا اور لگے سنانے۔ ان کا چہرہ کتاب کی طرف ہے لیکن رسول اللہ ﷺ چہرہ سرخ ہوتا جارہا ہے۔ کوئی دوسرے صاحب تھے انھوں نے ٹوکا۔ حضرت عمر خاموش ہوگئے اور دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کا چہرہ متغیر ہے۔ حضرت عمر سمجھ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ’میرے اوپر اللہ کی کتاب نازل ہورہی ہے۔ کیا یہ کتاب تم لوگوں کے لیے کافی نہیں

ہے؟ کہ دوسری طرف جارہے ہو۔ میں تو صاف ستھری اور واضح شریعت لے کر آیا ہوں۔ اب تم کو کسی کتاب کی کیا ضرورت ہے؟' حضرت عمر ؓ نے اس ورق کو ایک طرف ڈال دیا اور کہا" رَضِیتُ بِاللّٰہِ رَبّاً وَبِالإِسلامِ دِیناً وَبِمُحَمَّدٍ نَبِیّاً وَبِالقُرآنِ کِتَاباً"۔ میں راضی ہوں اللہ کو رب مان کر اور اسلام کو دین مان کر اور محمد ﷺ کو نبی مان کر اور قرآن کو کتاب مان کر، کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ تب رسول اللہ ﷺ کا غصہ فرو ہوا۔

رسول اللہ ﷺ کا اہتمام:

اس بات کا آپ نے اپنے زمانہ میں اتنا اہتمام کیا کہ جو کچھ آپ ﷺ ارشاد فرماتے تھے یعنی احادیث اس کو بھی عام طور سے لکھنے کی اجازت نہیں دی۔ خاص خاص صحابہ جو بہت ذی استعداد اور بڑے سمجھ دار تھے، انھیں لکھنے کی اجازت دی تھی۔ باقی عام طور پر ہر شخص کو لکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے کہ قرآن بھی عربی میں نازل ہورہا تھا اور رسول اللہ ﷺ بھی عربی بول رہے تھے اور آپ کی زبان انتہائی فصیح تھی، اندیشہ یہ تھا کہ کہیں قرآن میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث بھی شامل ہوجائے اور امت کو پتہ نہ چلے کہ یہ حدیث ہے یا قرآن ہے؟ کتنا اہتمام کیا گیا قرآن کے لیے۔ نیز آپ تاکید کیا کرتے تھے کہ اس کو بار بار پڑھا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ رات کو اٹھ کر تہجد کے وقت مدینے کی گلیوں میں جایا کرتے تھے اور سنتے تھے کہ کون قرآن پڑھ رہا ہے اور کون نہیں پڑھ رہا ہے۔ لوگ تہجد کی نماز میں اٹھتے اور بلند آواز سے تہجد کی نماز میں قرآن کریم کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ مدینہ شریف کی گلیوں میں قرآن شریف کے پڑھنے کی ایسی آوازیں آتی تھیں جیسے شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ ہر طرف ایسی آوازیں ہوتی تھیں۔ کیوں کہ لوگ قرآن شریف کو پڑھتے تھے اور رسول اللہ ﷺ اس کو سن کر خوش ہوتے تھے۔

حضرت ابوموسی اشعری ؓ کا واقعہ:

حضرت ابوموسی اشعری یمن سے تشریف لائے اور قرآن کریم سیکھا اور حفظ کیا

اور مدینہ طیبہ میں عرصہ تک رہے، اور روزانہ تہجد میں قرآن پڑھتے تھے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ادھر سے گزرے جہاں ان کا قیام تھا۔ ان کی آواز سنی تو آپ کھڑے ہوکر دیر تک سنتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو حضرت ابوموسی اشعری رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ’ابوموسی! رات میں ہم نے تمھارا قرآن سنا۔ ماشاءاللہ تم بہت اچھا پڑھتے ہو، اور تم کو تو آل داؤد کا لحن اور ان کا گلا دیا گیا ہے، جیسے داؤد علیہ السلام کا گلہ بہت اچھا تھا، زبور بہت عمدہ لحن سے پڑھتے تھے، اسی طرح تم قرآن کو بہت اچھا پڑھتے ہو۔‘ تو حضرت ابوموسی اشعری نے عرض کیا کہ ’حضور! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ سن رہے ہیں تو میں اور اچھا پڑھتا۔‘

حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کی تلاوت:

حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ بھی قرآن بہت عمدہ پڑھتے تھے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ’اگر جبرئیل جیسا قرآن سننا ہو تو عبداللہ بن مسعود کا پڑھنا سنو۔‘ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ عبداللہ بن مسعود سے فرمائش کی تھی کہ ’تم مجھے قرآن سناؤ۔‘ حضرت عبداللہ نے عرض کیا کہ ’یا رسول اللہ! قرآن تو آپ ہی پر نازل ہورہا ہے، اسے میں آپ کو سناؤں؟‘ تو ارشاد فرمایا کہ ’ہاں میں چاہتا ہوں کہ اپنے علاوہ دوسرے کی زبان سے سنوں۔‘ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ نے قرآن پڑھنا شروع کیا۔ سورہ نساء کی تلاوت کی اور پڑھتے پڑھتے جب اس آیت پر پہنچے ”فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰؤُلَآءِ شَهِيْدًا“ (سورة النساء آية ۴۱) کیا حال ہوگا جب کہ ہر امت سے ہم ایک گواہ لے آئیں گے اور تم کو ان سب کے اوپر گواہ بنا کر لائیں گے۔ رسول اکرم ﷺ سے کہا جارہا ہے کہ تم کو ہم ساری امتوں پر گواہ بنا کر لائیں گے۔ تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ بس کرو بس کرو۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نگاہ اٹھائی تو آپ کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں، آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ (صحیح مسلم) قرآن پاک اللہ کا کلام سن کر رسول اللہ ﷺ رو رہے تھے۔ کتنا تعلق تھا قرآن کریم

سے۔ آپ خود بھی پڑھتے تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی پڑھنے کی تلقین کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کا قرآن سے شغف:

آپ ﷺ کے قرآن پڑھنے کا حال بتاؤں۔ حضرت حذیفہ ایک صحابی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں مسجد میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نیت باندھے نماز پڑھ رہے ہیں۔ آپ قرآن پاک ہلکی آواز کے ساتھ پڑھ رہے تھے۔ حضرت حذیفہ نے دیکھا کہ آپ نفل پڑھ رہے ہیں، ان کے جی میں آیا کہ میں بھی کھڑا ہو جاؤں۔ چنانچہ یہ بھی نیت باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ سورہ بقرہ پڑھ رہے تھے جو سورہ فاتحہ کے بعد پہلی سورہ ہے۔ ڈھائی پارہ کے قریب ہے۔ آپ پڑھتے جا رہے ہیں۔ آپ کا پڑھنا بہت ٹھہر ٹھہر کر ہوتا تھا۔ بہت اطمینان سے آپ پڑھتے تھے۔ جہاں کہیں کوئی آیتِ رحمت آتی ہے تو رک جاتے ہیں اور رحمت کی دعا کرتے ہیں، اور جہاں کہیں کوئی آیت عذاب کی آتی ہے تو رک جاتے ہیں اور عذاب سے پناہ مانگتے ہیں۔ کبھی روتے ہیں اور کبھی پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ آپ اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے رہے اور حضرت حذیفہ پیچھے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہے۔ حضور ﷺ رکوع کر ہی نہیں رہے ہیں۔ سورہ بقرہ پوری ہو گئی رکوع نہیں کیا۔ ان کو خیال تھا کہ سورہ بقرہ پوری کرنے کے بعد رکوع کریں گے، رکوع نہیں کیا۔ اور سورہ آل عمران شروع کر دی۔ سورہ آل عمران بھی لمبی سورہ ہے، وہ پڑھ ڈالی۔ فرماتے ہیں کہ مجھے خیال ہوا کہ اب رکوع فرمائیں گے۔ اس پر بھی رکوع نہیں کیا، اس کے بعد پھر اور پڑھتے چلے گئے، سورہ نساء شروع کر دی۔ میں نے سوچا کہ اس پر رکوع کر دیں گے، سورہ نساء ختم ہو گئی یعنی سوا پانچ پارے پورے ہو گئے آپ نے رکوع نہیں کیا۔ فرماتے ہیں کہ اتنی لمبی رکعت ہو گئی کہ میری نیت خراب ہونے لگی۔ جی چاہا کہ نماز توڑ کر چلا جاؤں، پتہ نہیں کب رکوع کریں گے؟ لیکن ہمت نہیں پڑی۔ پھر آپ نے پڑھنا شروع کیا سورہ مائدہ شروع ہوئی، وہ بھی ختم ہو گئی۔ سورہ مائدہ ختم ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ سوا چھ پارے مکمل ہو گئے۔ اس کے بعد آپ نے رکوع کیا۔ سنا آپ

نے! سوا چھ پارے کے بعد رکوع کیا اور اس کے بعد دوسری رکعت پڑھی۔ سلام پھیر نے کے بعد حضرت حذیفہ کہنے لگے 'یا رسول اللہ! آپ نے تو آج اتنی لمبی رکعت کی کہ میری تو نیت خراب ہو گئی تھی۔' تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ 'اگر مجھے علم ہو جاتا کہ تم پیچھے کھڑے ہو تو میں پہلے ہی رکوع کر دیتا تا کہ تم پریشان نہ ہوتے۔' مجھے پتہ ہی نہ تھا کہ تم پیچھے کھڑے ہو، میں تو پڑھنے میں محو تھا۔ تو یہ کیفیت تھی قرآن پاک پڑھنے کی۔

رسول اللہ ﷺ کے پاس بہت دور دور سے وفود آیا کرتے تھے۔ طایف سے ایک وفد آیا، آپ نے اس کا استقبال کیا۔ طایف وہی جگہ ہے جہاں آپ پر بڑی مصیبت آئی تھی۔ اسی جگہ سے آپ کو نکالا گیا تھا۔ آپ کی بات قبول نہیں کی گئی تھی۔ آپ کو ستایا گیا تھا۔ آپ کو مارا پیٹا گیا تھا۔ وہیں 'مَلِكُ الْجِبَال' پہاڑوں کا فرشتہ آیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ 'یا رسول اللہ! فرمائیں تو میں دونوں پہاڑوں کو ٹکرا دوں کہ یہ ظالم اسی میں چکنا چور ہو جائیں۔' آپ نے فرمایا تھا کہ 'میں عذاب بنا کر نہیں بھیجا گیا ہوں، بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی اولاد میں سے کوئی اسلام قبول کرنے والا ہو۔' چنانچہ زیادہ دن نہیں گزرے کہ طائف سے ایک وفد آ گیا اور اسلام قبول کرنے کے لیے آیا۔ حضور ﷺ نے ان کا استقبال کیا۔ ان سے بڑی دیر تک باتیں کیں۔ غالباً آپ پچھلے سارے واقعات ان سے بتاتے رہے ہوں گے کہ دیکھو! میں تمھارے یہاں گیا تھا تو کیا سلوک کیا گیا تھا۔ وہ نوجوان جو آپ کی خدمت میں آئے تھے، حضور ﷺ کے وہاں تشریف لے جانے کے وقت یہ بچے رہے ہوں گے۔ ایک روز عشا کی نماز کے بعد آپ نے ان سے فرمایا کہ 'تم لوگ جاگتے رہو، میں کچھ دیر کے بعد آتا ہوں۔' چنانچہ وہ لوگ اپنے خیمے میں جاگتے رہے۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے لیکن دیر میں آئے۔ یہ لوگ آپ کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ 'میں پہلے ہی آنا چاہتا تھا لیکن روزانہ جتنا قرآن پڑھنا مقرر کر رکھا ہے اتنا ابھی نہیں پڑھ سکا تھا۔ اسے پڑھنے میں دیر لگ گئی اور رات کافی گزر گئی۔' خیر ان سے جو باتیں کرنی تھیں پھر وہ کیں۔

صحابہ کرام ؓ کا قرآن سے شغف:

رسول اللہ ﷺ کو قرآن سے عشق تھا اور صحابہ کرام کے اندر بھی قرآن کا عشق پیدا فرمادیا۔ حضرت جابر ؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوہِ ذات الرقاع میں نکلے تو ایک مسلمان نے کسی مشرک کی عورت کو قتل کر دیا۔ اس مشرک نے قسم کھائی کہ جب تک میں محمد کے ساتھیوں میں سے کسی ایک کا خون نہ بہادوں، باز نہیں آ سکتا۔ چنانچہ وہ تلاش میں نکلا اور نبی کریم ﷺ کے نقش قدم کو تلاش کرتا ہوا آپ کے پیچھے پیچھے چلا۔ نبی کریم ﷺ ایک منزل میں اترے اور فرمایا: ’ہماری حفاظت کون کرے گا؟‘ تو ایک مہاجر اور ایک انصاری اس مہم کے لیے مستعد ہوئے۔ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ: ’تم دونوں گھاٹی کے سرے پر رہو۔‘ جب دونوں گھاٹی کے سرے کی طرف چلے اور وہاں پہنچے تو مہاجر صحابی لیٹ گئے اور انصاری صحابی کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ وہ مشرک آیا، جب اس نے دور سے انصاری صحابی کو دیکھا تو پہچان لیا کہ یہی قوم کا محافظ و نگہبان ہے۔ اس کافر نے آپ پر تیر چلایا جو آپ کو لگا تو آپ نے اسے نکالا، یہاں تک کہ اس نے آپ کو تین تیر مارے۔ پھر آپ نے رکوع اور سجدہ کیا، پھر اپنے مہاجر ساتھی کو جگایا۔ جب اس مشرک کو معلوم ہوا کہ یہ لوگ ہوشیار اور چوکنا ہو گئے ہیں تو بھاگ گیا۔ جب مہاجر نے انصاری کا خون دیکھا تو کہا: ’سبحان اللہ! آپ نے پہلے ہی تیر میں مجھے کیوں نہیں بیدار کیا؟‘ تو انصاری صحابی نے کہا: ’میں (نماز میں قرآن کی) ایک سورۃ پڑھ رہا تھا، مجھے یہ اچھا نہیں لگا کہ میں اسے بند کروں۔‘ (ابوداؤد)

اللہ اکبر! تیر پر تیر کھا رہے ہیں لیکن قرآن کی تلاوت کر رہے ہیں۔ جی نہیں چاہ رہا ہے کہ چھوڑ دیں۔ زخم بھی ان کے لیے تکلیف دہ نہیں بن رہا ہے۔ قرآن کی لذت ایسی ہے کہ اس لذت کی محویت میں انھیں پتہ نہیں چل رہا ہے کہ انھیں کوئی زخم لگ رہا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جب کسی سے محبت ہوتی ہے، تعلق ہوتا ہے تو ہزار سر پر کوڑے لگیں تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔

مشہور ہے کہ ایک آدمی کسی کا عاشق تھا۔ عشق کی بنیاد پر لوگوں نے اسے پیٹنا شروع کیا۔ جس سے اس کو عشق تھا وہ کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس کو کوڑے پر کوڑے لگ رہے ہیں۔ ننانوے کوڑے لگے لیکن وہ مسکراتا رہا، کچھ نہیں بولا۔ جب سواں کوڑا لگا تو ایک دم چلایا ’ہائے‘۔ کسی نے پوچھا کہ ننانوے کوڑے لگے لیکن تم کو چوٹ نہیں لگی اور آخری کوڑے پر چوٹ لگ گئی؟ کہنے لگا کہ ننانوے کوڑے تک میرا محبوب مجھے دیکھ رہا تھا تو مجھے احساس بھی نہیں ہورہا تھا اور جب سواں کوڑا لگا ہے تو وہ چلا گیا تھا۔ اب وہ میرے سامنے نہیں ہے بس چیخ نکل گئی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ تو ہمہ وقت ان حضرات کے سامنے ہیں۔ چوں کہ اللہ تعالیٰ سے ان کو محبت تھی، تعلق تھا اس لیے تیر لگنے کی پرواہ نہیں۔ صحابہ کرام کی شان یہ تھی۔

مفتی محمد حسن صاحب امرتسری کا واقعہ:

ابھی ایک جگہ ہم نے بیان کیا تھا کہ ہمارے اکابر میں بعض لوگوں کی شان یہ تھی۔ بہت دور کی بات نہیں ہے تیس سال پہلے کی بات ہے یا اس سے کچھ زیادہ ہوا۔ ایک بزرگ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ ان کے پاؤں میں فیل پاؤں تھا پھر پھوڑا بن گیا۔ دس سال تک اس کو جھیلتے رہے۔ ڈاکٹروں نے آخر کہہ دیا کہ ’حضرت! جب تک پاؤں نہیں کاٹا جائے گا اس وقت تک آپ صحت مند نہیں ہوں گے۔ اب یہ کینسر بن رہا ہے۔ پورے جسم میں پھیل جائے گا۔‘ تو حضرت نے فرمایا کہ ’اگر ضروری ہو تو کاٹ دو۔‘ ڈاکٹروں نے کہا کہ ’حضرت! ہم ضروری سمجھتے ہیں۔‘ فرمایا ’بہتر ہے کاٹ دو۔‘ ران سے کاٹنا تھا یعنی پوری ران کی ہڈی کاٹنی تھی۔ آپریشن روم لے گئے۔ کلوروفام سونگھانا تھا کہ بے ہوش ہو جائیں اور آپریشن کیا جائے۔ حضرت نے فرمایا کہ ’اس کی ضرورت نہیں ہے۔‘ لوگوں نے کہا کہ ’بہت تکلیف دہ آپریشن ہے‘ تو فرمایا کہ ’نہیں بے ہوش مت کرو، ایسے ہی کاٹ دو‘ کہا کہ ’حضرت! برداشت نہیں ہوگا۔ گوشت کاٹا جائے گا، ہڈی کاٹی جائے گی۔‘ فرمایا ’کچھ حرج نہیں، ایسے ہی کاٹ دو۔ نہیں

برداشت ہوگا تو دیکھا جائے گا لیکن مجھے بے ہوش مت کرو۔' مجبوراً اسی طرح کاٹنے کا عمل شروع کیا گیا۔ انھوں نے پاؤں پھیلا دیا اور تکیہ پیچھے لگا کر اس کا سہارا لے کر بیٹھ گئے۔ ہاتھ میں تسبیح لے لی اور پڑھتے رہے۔ پاؤں کٹتا رہا، اپنی آنکھوں سے پاؤں کٹتے ہوئے دیکھتے رہے اور تسبیح پڑھتے رہے۔ ڈھائی گھنٹے لگے پاؤں کے کٹنے اور ٹانکا لگنے میں۔ ڈھائی گھنٹہ تک وہ تسبیح پڑھتے رہے اور پاؤں کٹتا رہا۔ چہرے پر شکن نہیں آئی، نہ جانے کون سا دل تھا! لوگوں نے بعد میں پوچھا کہ 'حضرت! تکلیف نہیں ہو رہی تھی؟' فرمایا کہ 'ہوئی تھی لیکن اس تکلیف پر مجھے جو اجر ملنے والا تھا، اللہ نے اسے میرے سامنے کر دیا تھا۔ میں اس کی لذت میں اتنا محو ہو گیا کہ پھر تکلیف کا خیال باقی نہیں رہا۔' جب محبت ہوتی ہے، تعلق ہوتا ہے تو آدمی اسی طرح محو ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک سے تعلق اور محبت ہوتی ہے تو آدمی اس کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔

حضرت عثمان غنیؓ کا ارشاد:

حضرت عثمان غنیؓ ارشاد فرماتے ہیں.... اللہ تعالی ان کو غریق رحمت کرے، بہت بزرگ صحابی تھے۔ قرآن پاک کو انھوں نے ہی جمع کیا ہے اور انھیں کے طفیل ہم تک پہنچا ہے۔ ان کے پڑھنے کا یہ عالم تھا کہ انھیں کے ایک شاگرد فرماتے ہیں کہ میں مسجد حرام میں خانہ کعبہ کی طرف بڑھ رہا تھا نماز پڑھنے کے لیے۔ پیچھے سے کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو سیدنا عثمان غنی تھے۔ بوڑھے ہو چکے تھے۔ ستر سال عمر تھی۔ خلیفۃ المسلمین تھے۔ میں ٹھہر گیا۔ حضرت امیر المومنین آگے بڑھ گئے اور خانہ کعبہ کے قریب جا کر نیت باندھ لی۔ قرآن پاک پڑھنا شروع کیا۔ سورہ فاتحہ پڑھی، پھر سورہ بقرہ کی تلاوت شروع کی۔ کہتے ہیں کہ میں کھڑا بیٹھا ان کے قرآن پاک کو پڑھتے سنتا رہا۔ ایک رکعت میں تیس پارہ پورا قرآن پڑھ ڈالا۔ بڑھاپے کے عالم میں ستر سال کی عمر ہے، پنڈلیاں کمزور ہو چکی ہیں لیکن ایک رکعت میں پورا قرآن پڑھ لیا۔ اور ایک ہی رکعت پر سلام پھیر کر چلے گئے۔ حضرت عثمان غنی کے یہاں ایک رکعت کی نماز ہوتی ہے۔

جس وقت ان کی شہادت ہوئی ہے اس وقت بھی قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ بہترین حافظ تھے لیکن قرآن پاک کھول کر تلاوت کر رہے تھے۔ اور اسی حالت میں ان کو شہید کر دیا گیا تھا۔ ان کا خون قرآن پاک پر پڑا اور آج تک اس مصحف پر خون کا دھبہ موجود ہے۔.... وہ فرماتے ہیں کہ ’’اے لوگو! اگر تمھارا دل پاک وصاف ہو تو قرآن پاک پڑھنے سے کبھی نہیں اکتاؤ گے۔‘‘ قرآن پاک پڑھنے سے اکتاہٹ ہوتی ہے تو ضرور کچھ نہ کچھ کمزوری ہے۔ کچھ نہ کچھ گندگی ہے۔ قرآن کریم پاک چیز ہے اور ہمارے دل کی گندگی اس سے دل اچاٹ کر دیتی ہے۔ ورنہ اگر ہمارے دل میں نجاست نہ ہوتی، گندگی نہ ہوتی تو قرآن پاک کے پڑھنے سے کبھی بھی انسان نہیں اکتا سکتا۔ یہ تو وہ کلام ہے کہ بار بار انسان پڑھتا رہے۔ فرشتے اتر آتے ہیں، اللہ کی رحمت نازل ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ متوجہ ہو جاتے ہیں۔ بزرگوں کی روحیں حتیٰ کہ انبیا کی روحیں بھی اس پر آ جاتی ہیں۔ اللہ کی طرف سے حضرات انبیاے کرام انتقال کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ ان کی ارواح بھی متوجہ ہو جاتی ہے۔

شیخ حافظ عبداللہ صاحب کا واقعہ:

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ میرے والد کے شیخ حافظ عبداللہ صاحب تھے۔ وہ ایک دوسرے بزرگ قاری صاحب سے قرآن کی تکمیل کے لیے گئے۔ حافظ عبداللہ صاحب قرآن پاک بہت اچھا پڑھتے تھے۔ ایک مرتبہ استاذ بیٹھے قرآن سن رہے ہیں اور شاگرد قرآن سنا رہا ہے۔ استاذ کا رخ دوسری طرف ہے اور شاگرد کا رخ دروازے کی طرف ہے۔ شاگرد سنائے جا رہا ہے اور حافظ صاحب سر جھکائے سن رہے ہیں۔ اتنے میں دیکھا کہ چند لوگ بہت عمدہ لباس پہنے صافہ باندھے ہوئے تشریف لائے۔ خوبصورت داڑھی اور خوشبو ایسی عمدہ تھی کہ بس کچھ نہ پوچھیے! استاذ تو قرآن سننے میں محو تھے لیکن شاگرد کی نگاہ پڑ گئی۔ ان میں سے جو بزرگ ترین شخص معلوم ہو رہے تھے، انھوں نے کہا ’ہاں بیٹا! پڑھو، بہت عمدہ پڑھتے ہو ماشاء اللہ، اسی طرح

پڑھتے رہو۔' یہ سن کر ان کے اوپر ایک جھرجھری کی کیفیت طاری ہوگئی اور وہ اتنا کہہ کر چل دیے۔ ان کا تسلسل جاری رہا اور استاذ سر جھکائے سنتے رہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ اتنے میں ایک بزرگ تشریف لائے۔ انھوں نے پوچھا کہ 'کوئی صاحب یہاں سے گزرے ہیں؟' تو شاگرد نے بتایا کہ 'ایسے ایسے چند لوگ تھے جو یہاں تشریف لائے تھے۔' انھوں نے کہا کہ 'وہ رسول اللہ ﷺ تھے۔ تمھارا قرآن سننے کے لیے آئے تھے۔' اللہ اکبر!

یہ بات کوئی محال نہیں ہے۔ آدمی خواب میں یا بیداری میں، بے خودی کی کیفیت میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کرسکتا ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "مَنْ رَآنِی فِی الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِی فَاِنَّ الشَّیْطَانَ لَا یَتَخَیَّلُ بِی" (بخاری) جس نے خواب میں میری زیارت کی، اس نے میری ہی زیارت کی۔ کیوں کہ شیطان میری شکل میں متخیل نہیں ہوسکتا۔

قرآن سے شغف کی برکت:

اس زیارت پر ایک بات اور مجھے یاد آئی۔ واقعی اللہ کے دین کی جو لوگ خدمت کرتے ہیں خدائے تعالیٰ کا ان کے ساتھ کیا عجیب معاملہ ہوتا ہے۔ آپ کے صوبہ بہار میں ایک گاؤں دمکا ہے جو اب دیوگھر بن گیا ہے۔ ہمارا کبھی کبھی وہاں جانا ہوا کرتا ہے۔ وہاں ایک گاؤں میں ایک مولوی صاحب کا بہت چرچا تھا، ان کی بڑی شہرت تھی۔ نوجوان مولوی تھے ۲۸ ر سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ بڑا کام کیا، بڑی خدمت کی۔ بے چارے کو صرف چند روپے ملتے تھے۔ انھوں نے اس پورے علاقہ میں بہت کام کیا۔ صورت حال یہ تھی کہ وہاں کے لوگ ابتدا میں ان کے مخالف تھے لیکن وہ اپنی دھن میں لگے رہے اور جتنے بڑے بڑے مخالفین تھے اللہ نے ان کو ایسا رام کیا اور ان کے سامنے ایسا جھکایا کہ واقعی خدا کی قدرت یاد آتی ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک بات بتادوں کہ ایک شخص ان کا بڑا مخالف تھا۔ وہ کسی طرح ان کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اللہ نے انتظام یہ کیا کہ

اس کا اکلوتا لڑکا بیمار ہوگیا۔ اور بیماری بھی ٹی بی کی ہوگئی۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے کی بات ہے، اس وقت ٹی بی ایک مشکل بیماری تھی اب تو مشکل نہیں رہ گئی۔ اور پھر وہ دیہات کا رہنے والا۔ دیہات بھی ایسا کہ گیارہ بارہ میل تک کوئی بازار نہیں نہ اِدھر نہ اُدھر۔ اب تو مرنا یقینی ہوگیا۔ کسی نے کہا کہ ’مولوی صاحب سے دعا کراؤ۔‘ کہا ’ارے ہم اس مولوی سے دعا نہیں کرائیں گے۔‘ لیکن بیٹا اکلوتا تھا، مر رہا تھا۔ مجبوراً مولوی صاحب سے دعا کی درخواست کی۔ مولوی صاحب جھاڑ پھونک کے آدمی نہیں تھے لیکن انھوں نے کمال کر دیا۔ اس مریض کے پاس قرآن شریف کھول کر بیٹھ گئے۔ حافظ نہ تھے ناظرہ خواں تھے۔ لیکن دن بھر اس کے پاس بیٹھے قرآن شریف پڑھتے رہے اور دم کرتے رہے۔ دن بھر میں تیسوں پارے پڑھ ڈالے۔ پھر ایک دو دن نہیں، چالیس دن تک ہر روز ایک ختم کر کے دم کرتے رہے اور وہ بغیر کسی علاج کے بھلا چنگا ہوگیا، مکمل تندرست ہوگیا۔ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کبھی ٹی بی ہوئی تھی۔ اب تو وہ اپنے گاؤں کا اپنے علاقے کا مکھیا ہے۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ اس کا پورا گھرانہ مرید ہوگیا۔ اللہ نے ان سے بڑا کام لیا۔

خدمت دین کی برکت:

اخیر میں خود مولوی صاحب کو ٹی بی ہوگئی۔ پہلے سے بیمار تھے، ٹی بی کا اثر ہوا۔ علاج کا معقول انتظام نہیں تھا، وہ بے چارے بیمار رہے یہاں تک کہ ان کا آخری وقت آ گیا۔ جس دن انتقال ہوا اسی دن کی بات میں آپ کو بتاؤں۔ انھوں نے دین کی خدمت خلوص کے ساتھ کی تھی تو اس کا صلہ لوگوں نے یہیں دیکھ لیا۔ اور آخرت میں جو ملا ہوگا وہ تو اپنی جگہ۔ ان کے انتقال کا جب وقت قریب ہوا تو وہ مغرب کا وقت تھا۔ گاؤں کے سیدھے سادھے لوگ ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اپنے اپنے طور پر خدمت کر رہے تھے۔ نماز مغرب کا وقت قریب ہوگیا تو انھوں نے کہا کہ ’مجھے تیمّم کرا دو، نماز ایسے ہی لیٹے لیٹے پڑھوں گا‘ اس لیے کہ بیٹھنے کی طاقت نہیں تھی۔ آپ لوگ جا کر مسجد میں نماز پڑھ لیں۔ چنانچہ لوگوں نے ان کو تیمّم کرا دیا اور مسجد نماز پڑھنے کے لیے چلے گئے۔ وہ

وہیں نماز پڑھنے لگے۔ مسجد میں لوگوں نے سلام پھیرا ہی تھا کہ کسی بچے نے زور سے چلا کر کہا کہ ’مولوی صاحب گر گئے ہیں۔‘ لوگ فوراً دوڑے ہوئے گئے تو دیکھا کہ چارپائی کے نیچے بیٹھے ہوئے چارپائی کی پٹی پکڑے ہانپ رہے ہیں۔ لوگوں نے پوچھا کہ ’نیچے کیسے آ گئے؟‘ کہنے لگے کہ جب نماز پڑھ چکا تو اس کے فوراً بعد حضور اکرم ﷺ تشریف لائے۔ آپ کو دیکھ کر مجھے قابو نہیں رہا، میں جلدی سے اٹھا اور اٹھ کر مصافحہ کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ’تم آ جاؤ ہم تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔‘ یہ فرما کر آپ تشریف لے گئے۔ لوگوں نے جلدی سے ان کو اٹھا کر چارپائی پر لٹایا اور لٹاتے ہی ان کا دم نکل گیا۔ آپ خیال کیجیے کہ اللہ تعالی نے ان کو دین کی خدمت کا بدلہ دنیا ہی میں دکھلا دیا۔ سب لوگوں نے دیکھ لیا کہ یہ دین کا سچا خادم تھا اور سچی خدمت کی تھی۔ اس طرح اللہ تعالی نے رسول اللہ ﷺ کی روح طیبہ کو ان کے اوپر ظاہر کر دیا۔ یہ کوئی اَنہونی بات نہیں ہے، ایسا ہوسکتا ہے۔ لیکن سب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ خدائے تعالی جو چاہتے ہیں وہی ہوسکتا ہے۔

قرآن کا دیکھنا بھی باعثِ ثواب ہے:

غرض قرآن پاک کا پڑھنا ایک ایسا مقدس اور عظیم کام ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ کی بے حد وحساب رحمت ہوتی ہے۔ آدمی قرآن پڑھے، اس کی تلاوت کرے تو خیر و برکت کا مخزن بن جائے گا۔ لیکن ہم نے قرآن کو گھر سے نکال دیا ہے۔ ہم دنیا بھر کی چیزیں پڑھتے ہیں، ہمارے گھر میں دنیا بھر کی خرافات ہوتی ہیں لیکن ہم نہیں پڑھتے ہیں تو قرآن نہیں پڑھتے ہیں۔ نہ ہم اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں نہ اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ بچپن میں ہم نے دیکھا ہے کہ گھروں سے صبح کے وقت قرآن پاک کے تلاوت کرنے کی آوازیں آتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے پڑھتے تھے، گھر کی عورتیں پڑھتی تھیں بڑے بوڑھے پڑھتے تھے، پورے گھر میں قرآن پڑھا جاتا تھا۔ لیکن اب تو ہمارے یہاں صبح کا وقت ہی بدل گیا۔ کہیں آٹھ بجے دن میں، کہیں دس بجے دن میں صبح ہوتی ہے۔ اٹھے جلدی سے بستر پر چائے پی اور منہ صاف کیا، کھایا پیا چل دئے۔ گویا قرآن سے کوئی

مطلب ہی نہیں رہ گیا۔

میرے دوستو! قرآن اللہ تعالی نے ہماری ہدایت کے لیے اتارا تھا اور ہمارے لیے اتارا تھا کہ اس کے ذریعے ہم اللہ کا قرب حاصل کریں۔ اگر ہم اتنی بڑی دولت کو اپنے گھر میں رکھتے ہوئے محروم ہو جائیں تو ہم سے بڑا بد قسمت کوئی نہیں ہو سکتا۔ کچھ نہ کچھ تلاوت روز کرنی چاہیے، آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ قرآن پاک وہ چیز ہے کہ اس کو سمجھئے تو نور علی نور اور نہ سمجھئے تب بھی اس میں برکت ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ’’خَمسٌ مِنَ الْعِبَادَةِ قِلَّةُ الطَّعَامِ وَالْقُعُوْدُ فِی الْمَسْجِدِ وَالنَّظَرُ اَلَی الْکَعْبَةِ وَالنَّظْرُ اِلیٰ الْمُصْحَفِ وَالنَّظْرُ اِلیٰ وَجْهِ الْعَالِمِ‘‘(رواہ فی مسند الفردوس) پانچ کام عبادت میں داخل ہیں (۱) کم کھانا (۲) مسجد میں بیٹھنا (۳) کعبہ کو دیکھنا (۴) قرآن شریف کو دیکھنا (۵) عالم ربانی کو دیکھنا۔ یہ پانچ چیزیں ایسی ہیں کہ صرف ان کو دیکھنا ہی ثواب ہے۔

قرآن کو دیکھنے کی برکت:

ہمارے استاذ محترم فرما رہے تھے کہ ایک بزرگ ایک بستی سے گزرے۔ دیکھا کہ ایک قبر نئی نئی بنی ہوئی ہے اور اس قبر پر نور ہے۔ صاحبِ کشف تھے، اس لیے محسوس کیا کہ اس قبر پر نور چھایا ہوا ہے اور آسمان تک پھیلا ہوا ہے۔ انھیں خیال ہوا کہ کس کی قبر ہے؟ کوئی بزرگ ہیں کوئی اللہ والے ہیں۔ گاؤں میں پہنچے، گاؤں والوں سے پوچھا کہ ’قبر کس کی ہے؟‘ لوگوں نے بتایا کہ ’فلاں صاحب کی ہے۔‘ پوچھا ’کیا بزرگ تھے؟ بہت نیک تھے؟ اللہ والے تھے؟‘ لوگوں نے کہا کہ ’نہیں معمولی کاشتکار تھے، کھیتی کرتے تھے، دیانت داری سے کام لیتے تھے اور کوئی خاص بات نہیں تھی۔ پڑھے لکھے بھی نہیں تھے جاہل تھے۔ ہاں نماز پانچوں وقت کی پڑھتے تھے۔‘ انھوں نے دل میں سوچا کہ اتنا نوران کی قبر پر کیسے ہے؟ ان کی بیوی کے پاس گئے۔ ان کی بیوی حیات تھیں۔ پوچھا کہ ’آپ کے شوہر بہت بزرگ آدمی تھے؟‘ کہا ’نہیں کچھ بھی نہیں تھے۔ صرف کھیتی کرتے تھے، ہل

بیل والے تھے، پابندی سے نماز پڑھتے تھے۔' کہا 'نہیں کوئی خاص عمل ان کا ضرور ہے۔' بیوی نے پوچھا کہ 'بات کیا ہے؟' کہا 'اگر تمھیں کوئی بات معلوم ہو تو بتا دو۔' بیوی نے کہا 'کوئی خاص بات تو نہیں ہے، ہاں ان کا ایک عمل تھا۔ یہ دیکھیے قرآن شریف ہے۔ یہی ان کا ایک عمل تھا کہ روزانہ فجر کے بعد قرآن پاک کھول لیتے تھے اور اس کی ہر سطر پر انگلی پھیرتے تھے اور کہتے تھے کہ 'پروردگار! یہ آپ کا کلام ہے اور حق ہے۔' ہر ہر سطر پر ایک پارہ روزانہ اسی طرح انگلی پھیرتے تھے۔ کچھ آتا نہیں تھا، قرآن پڑھ نہیں سکتے تھے لیکن یہ الفاظ ہر سطر پر دہراتے تھے۔' فرمایا 'بس بس یہی بات ہے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی قبر کو نورانی بنا دیا ہے۔' قرآن پڑھ نہیں سکتے تھے مگر اتنی ہی بات ان کے لیے بہت کافی ہوگئی۔

قرآن پاک کو ہم عزت واحترام کے ساتھ جیسے بھی پڑھیں اللہ تعالیٰ اس پر ثواب عنایت فرمائیں گے۔ اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی اس کو پڑھے اور سمجھے۔ اس لیے کہ قرآن پاک میں اللہ نے بہت سی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ اور سمجھنے کے بعد اس پر عمل کرے۔ یہ سب سے بڑی بات ہے۔ لیکن اگر کوئی نہیں سمجھ رہا ہے تو قرآن پاک کی تلاوت سے محروم نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بہت محرومی کی بات ہے۔

خدا کو خواب میں دیکھنا ممکن ہے:

ایک بات اور بتاتا چلوں۔ حضرت امام احمد بن حنبل علیہ الرحمۃ نے اللہ تعالیٰ کو ایک مرتبہ خواب میں دیکھا۔ اور میں یہ بھی بتا دوں کہ اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ہاں یہ ہے کہ آدمی اپنی استعداد کے مطابق دیکھے گا۔ یہ نہیں کہ اس نے جس شکل و صورت میں دیکھا وہی شکل وصورت اللہ کی ہے۔ خدائے تعالیٰ شکل وصورت سے پاک ہیں، لیکن خواب میں ایسا ہوتا ہے۔ تو انھوں نے خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا تو سوچا کہ زیارت ہوگئی ہے تو کچھ پوچھ لینا چاہیے۔

حافظ بادشاہ کا واقعہ:

جو آدمی جس دھن میں ہوتا ہے، جس خیال میں ہوتا ہے خواب میں بھی وہی چیز آتی ہیں۔ اس دھن کے متعلق ایک بات اور بتا تا چلوں۔ ابھی چند روز پہلے بیان کیا تھا کہ گونڈہ کے ایک حافظ ہیں انھیں قرآن سے بے حد عشق ہے۔ بہت پڑھتے ہیں۔ قرآن ان کو اتنا عمدہ یاد ہے کہ متشابہات لگنے کا ان کے یہاں کوئی سوال نہیں۔ اور اس کو بھی روک کر ایک بات اور بتاؤں کہ آپ کے اسی صوبہ بہار کے ضلع چمپارن میں حافظ بادشاہ صاحب گزرے ہیں۔ نابینا تھے۔ آپ لوگوں میں سے بہت سے لوگوں نے ان کا نام سنا ہوگا۔ قرآن پاک زندگی بھر ان کا مشغلہ رہا۔ انھوں نے اپنے والد سے ایک مرتبہ پوچھا کہ ’ابا جان! آپ کو قرآن کیسا یاد ہے؟‘ ارشاد فرمایا کہ ’مجھے قرآن ایسا یاد ہے جیسے لوگوں کو سورہ فاتحہ یاد ہوتی ہے۔‘ سورہ فاتحہ سب کو یاد ہوتی ہے، سات آیتیں سب پڑھ لیتے ہیں۔ باپ نے پوچھا کہ ’بیٹے! تم کو قرآن کیسا یاد ہے؟‘ کہنے لگے ’ابا جان! مجھ کو قرآن پاک ایسا یاد ہے جیسا کہ سب لوگوں کو بسم اللہ الرحمان الرحیم یاد ہوتی ہے۔‘ سورہ فاتحہ تو بہت سے لوگوں کو نہیں یاد ہوتی لیکن بسم اللہ الرحمان الرحیم سے تو کوئی مسلمان محروم نہیں۔ حافظ بادشاہ کی قبر ندی کے کنارے تھی۔ ندی کے کنارے مدرسہ ہے اور اسی میں ان کی قبر ہے۔ ۲۵؍سال کے بعد ان کے شاگرد نے خواب میں دیکھا کہ فرما رہے ہیں کہ ’ندی کاٹتے ہوئے آرہی ہے، میری قبر منتقل کر دو۔ انھوں نے سوچا کہ پچیس سال ہو گئے ہیں، پتہ نہیں ان کی لاش ہوگی یا نہیں؟ خواب میں فرما رہے ہیں۔ خواب کی بات کا اعتبار کیا؟ علما سے مسئلہ پوچھا، علما کو تذبذب ہوا کہ کیا کیا جائے؟ قبر کھول کر ہٹانا بھی مناسب نہیں ہے۔ لیکن وہ خواب میں بتا رہے ہیں تو لوگوں نے نگراں مقرر کیے کہ دیکھیں قبر کٹ بھی رہی کہ نہیں؟ دیکھا تو واقعی سیلاب آیا ہوا تھا اور اس کا پانی کاٹتا ہوا چلا آرہا تھا۔ بالآخر مجبور ہو کر لوگوں نے قبر کو کھول دیا۔ دیکھا تو حافظ بادشاہ کا جسم تو جسم ہے کفن تک نہیں سڑا تھا اور محفوظ تھا۔ لوگوں نے ان کی لاش ہٹا کر دوسری جگہ منتقل کر دی۔ یہ کس کی برکت

تھی؟ یہ صرف قرآن کی برکت تھی۔ واقعی قرآن پاک عجیب چیز ہے۔

قرآن کی دھن:

غرض میں یہ بتلا رہا تھا کہ آدمی کو جب دھن ہوجاتی ہے تو کیا کیا کرتا ہے۔ وہ حافظ صاحب جن کا تذکرہ میں کر رہا تھا، ان کو دھن ہوگئی تو خواب میں ایک دن انھوں نے قرآن پاک پڑھنا شروع کیا۔ ان کے والد بھی وہیں سوئے ہوئے تھے، وہ بھی بہت بہترین حافظ تھے۔ ان کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کہ بیٹا قرآن پڑھ رہا ہے تو جلدی سے اٹھے وضو کیا اور قرآن لے کر بیٹھ گئے، سننے لگے۔ چودہ پارے انھوں نے خواب میں پڑھ ڈالے اور بالکل صحیح صحیح پڑھا۔ جب کسی چیز کی دھن لگ جاتی ہے تو خواب میں بھی اس کا ظہور ہوتا ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ کا خواب:

امام احمد بن حنبلؒ کو ایک بات کی دھن تھی کہ اللہ راضی ہو، اللہ کا قرب حاصل ہو۔ خواب میں دیکھا تو پوچھ دیا کہ ’یا اللہ! آپ کا قرب حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ کیسے ہم آپ کا قرب حاصل کریں؟ کیسے ہم آپ کی ولایت حاصل کریں؟ کیسے ہم آپ کے نزدیکی بن جائیں؟‘ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ” بِتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ“ قرآن کریم کی تلاوت سے۔ قرآن کی تلاوت کروگے تو میرے قریب ہوتے جاؤگے۔

قرآن سب کے لیے:

حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے ایک بات اور پوچھی۔ اس لیے کہ امت میں ہر طرح کے لوگ ہیں، بہت سمجھ دار لوگ بھی ہیں اور بہت کم سمجھ لوگ بھی ہیں۔ اور قرآن کریم سب کے لیے اترا ہے۔ صرف اہل علم کے لیے نہیں اترا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ ’اے پروردگار! میری امت میں کمزور لوگ بھی ہیں اور بوڑھے بھی اور جن کی زبان نہیں ٹوٹتی، زبان سے کلمات صحیح ادا نہیں ہوتے، ایسے لوگ بھی ہیں اور عجمی بھی ہیں۔ ان کو قرآن پڑھنا ہوگا تو ’ذال‘ کو ’جیم‘ کہیں گے۔ بہار میں تو قرآن ایسے ہی پڑھا جاتا ہے۔ ”گیــر

الـمـگـجوب اَلیھم و لاالجالین'' والاقرآن تو ہمارے یہاں کثرت سے رائج ہے۔ قرآن صحیح پڑھنا چاہیے لیکن کتنے بوڑھے ایسے ہیں جو قرآن صحیح نہیں پڑھ پاتے۔ ان کی زبان سے قرآن کے الفاظ صحیح نہیں ادا ہو پاتے۔ تو میری امت میں ایسے لوگ بھی ہیں۔ قرآن وہ بھی پڑھیں گے تو 'پروردگار! قرآن آسان فرما دیجیے۔' حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں کہ 'خدا نے میری دعا سن لی اور قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا۔' سات طریقہ پر قرآن پڑھا جا سکتا ہے۔ سات حرفوں سے سات قرأت مراد نہیں ہے۔ سات قرأتیں تو ایک ہی حرف پر ہیں۔ یعنی قریش کی لغت پر۔ یہاں سات لغتیں مراد ہیں۔ خود صحابہ کرام مختلف انداز میں قرآن پڑھتے تھے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ سناؤں۔ حضرت عمر ؓ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک صحابی ہشام بن حکیم ؓ نماز میں سورہ فرقان کی تلاوت کر رہے تھے۔ حضرت عمر ؓ سننے لگے، انھیں محسوس ہوا کہ میں جس طریقہ پر پڑھتا ہوں یہ اس کے خلاف پڑھ رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ 'ابھی حضور ﷺ زندہ ہیں اور یہ قرآن غلط پڑھ رہا ہے۔' ان کے ہاتھ میں چادر تھی، قریب تھا ان کی گردن میں چادر ڈال کر اور لپیٹ کر گھسیٹتے ہوئے لے جائیں۔ اس لیے کہ حضرت عمر ؓ جلالی آدمی تھے۔ لیکن انھوں نے توقف کیا۔ نماز پڑھنے کے بعد سلام پھیرا نہیں تھا کہ ان کی گردن میں چادر لپیٹی اور کہا کہ 'قرآن غلط پڑھتے ہو!' انھوں نے کہا 'نہیں مجھے حضور ﷺ نے ایسے ہی پڑھایا ہے۔' کہا 'نہیں غلط کہتے ہو، حضور ﷺ نے مجھے دوسری طرح پڑھایا ہے۔' فوراً حضور ﷺ کے خدمت میں لے گئے اور کہا 'یا رسول اللہ! آپ زندہ ہیں اور یہ قرآن غلط پڑھ رہا ہے۔' آپ نے فرمایا 'کیسے پڑھتے ہو؟ پڑھو۔' حضرت ہشام ؓ نے پڑھا تو فرمایا 'بالکل صحیح ہے۔' حضرت عمر ؓ نے عرض کیا کہ 'آپ نے تو مجھے دوسری طرح سے پڑھایا ہے۔' آپ ﷺ نے فرمایا کہ 'تم پڑھو۔' انھوں نے پڑھا تو فرمایا کہ 'یہ بھی ٹھیک ہے۔'

اللہ تعالیٰ نے قرآن کو سات حرفوں پر نازل فرمایا ہے تاکہ آسانی ہو۔ مضمون ہر

جگہ ایک ہی رہے گا الفاظ میں کچھ فرق ہو جائے گا۔ اب حضرت عثمان نے قریش کی لغت پر قرآن کو اکٹھا کر دیا تا کہ انتشار نہ ہو۔ حضور ﷺ کے زمانہ میں سات حرفوں کی ضرورت تھی، اب ایک حرف کافی ہے۔ اس وقت الفاظ کا فرق صرف اتنا رہا کہ سات قرأتیں ہیں اور ان قرأت میں ادائیگی کے طریقوں میں فرق ہے۔ امت کو اس کی وجہ سے آسانی ہے۔

تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اللہ تعالی نے سب کے لیے قرآن کو آسان کیا ہے۔ اگر آپ قاری نہیں ہیں اور قرأت سے آپ نہیں پڑھ پاتے تو قرآن مت چھوڑیے۔ اگر آپ کی زبان سے کوئی حرف صحیح نہیں نکل رہا ہے تو اس سے متاثر ہو کر تلاوت نہ چھوڑیے۔ قرآن پڑھتے رہیے۔ دل میں عشق و محبت ہوگی، قرآن سے سچا تعلق ہوگا تو باوجود غلطی کے اللہ تعالی قبول فرمالیں گے۔

حضرت حسن بصری کا واقعہ:

حضرت حسن بصرہ کے رہنے والے تھے، بہت اچھا قرآن پڑھتے تھے۔ اسی زمانہ میں ایک بزرگ تھے حضرت حبیب عجمی، وہ قرآن صحیح نہیں پڑھ پاتے تھے۔ حضرت حبیب عجمی بڑے بزرگ تھے۔ ایک مرتبہ وہ نماز پڑھ رہے تھے اور اس میں قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ حضرت حسن ان کے پیچھے کھڑے ہو گئے کہ ان کی اقتدا میں نماز پڑھ لیں۔ ان سے قرآن پڑھنے میں غلطی ہو رہی تھی۔ حسن بصری نماز توڑ کر چلے گئے کہ یہ شخص قرآن غلط پڑھتا ہے، اس کے پیچھے نماز نہیں ہوگی۔ اسی رات خواب میں کسی فرشتے کو دیکھا۔ فرشتے سے پوچھا کہ 'سب سے اچھا عمل کیا ہے؟' فرشتے نے کہا کہ 'اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ 'سب سے اچھا عمل آج کل حبیب عجمی کے پیچھے نماز پڑھنا ہے۔' اللہ اکبر! یہ حبیب عجمی جو قرآن غلط پڑھ رہے تھے ان کے پیچھے نماز پڑھنا سب سے اچھا عمل ہے۔

اللہ تعالی دل دیکھتے ہیں تلفظ نہیں:

تو میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ آپ قرأت نہ سیکھیے۔ قرآن صحیح مت پڑھیے۔

قرآن صحیح پڑھنے کی کوشش کرنا ضروری ہے، کوشش کرنا چاہیے لیکن اگر کوئی مجبور ہے، اسے موقع نہیں ہے اور وہ قرآن صحیح نہیں پڑھ پاتا۔ اگر کسی قاری کو سنائے تو قاری صاحب فوراً فتوی ٹھونک دیں کہ بالکل غلط پڑھتے ہو۔ لیکن ہم نہیں فتوی دیتے، رسول اللہ ﷺ فتوی نہیں دیتے۔ ان کا فتوی یہ ہے کہ اگر تم قرآن صحیح نہیں پڑھ پاتے ہو، تمھاری زبان سے حروف صحیح نہیں ادا ہو پاتے تب بھی پڑھو۔ جیسے اردو بگڑی ہوئی ہو تب بھی اردو ہے۔ ہم صحیح اردو میں بولیں گے تو کہیں گے کہ ”میں باغ میں گیا تھا“۔ اگر غلط بولیں گے تو کہیں گے کہ ”ہم بغیا میں گئے رہے“۔ تو معنی دنوں کا ایک ہی رہا یا الگ الگ ہو گیا؟ معنی ایک ہی رہا، اس میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ البتہ ذرا سا لہجے میں، ادائیگی میں اور مخرج میں فرق پڑ گیا۔ دل میں جو بات ہے حقیقی بات ہے تو تھوڑا سا الفاظ میں ہیر پھیر ہو جائے تو اللہ تعالی اس کا دل دیکھیں گے، زبان نہیں دیکھیں گے۔

ہمارے یہ حاجی عبدالاحد صاحب تشریف رکھتے ہیں یہ ایک لطیفہ سناتے ہیں کہ ایک مولانا صاحب کے یہاں ایک دیہاتی آیا۔ اس نے پوچھا کہ ’حضرت! نماز میں کیسے نیت کی جاتی ہے؟‘ انھوں نے کہا کہ ’تم کو معلوم نہیں ہے کہ کیسے نیت کی جاتی ہے؟‘ اس نے کہا کہ ’ارے صاحب! ہم جاہل آدمی ہیں، ہم کو کیا معلوم کی کیسے نیت کی جاتی ہے؟‘ کہا ’اتنے دن سے نماز پڑھ رہے ہو، کبھی تو نیت کی ہوگی؟‘ کہا ’ہاں کی تو ہے۔‘ کہا ’کیسے کرتے ہو؟‘ تو اس نے کہا کہ ’جب ہم کو کچھ آتا جاتا نہیں ہے تو ہم یہی کہتے ہیں ”انجان بندہ ماہی، سو جان صاحب تو ہی، اٹھو بیٹھو ماہی قبول کرو تو ہی“۔ دل میں اس کے ایک بات تھی وہ دل کی بات کہہ رہا تھا اپنی زبان سے۔ ہم انجان ہیں، ہم کچھ نہیں جانتے پروردگار! جاننے والے تو آپ ہی ہیں۔ ہم تو صرف اٹھ بیٹھ لیتے ہیں آپ کے حکم کے مطابق۔ قبول آپ ہی کرنے والے ہیں۔ تو کبھی زبان نہیں اچھی ہوتی لیکن دل بڑا اچھا ہوتا ہے۔ ایسے لوگ حضور ﷺ کے یہاں بہت مقبول رہے ہیں۔ ایک صحابی تھے وہ سورہ رحمان کی آیت ” مُتَّکِئِیْنَ عَلٰی رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَعَبْقَرِیٍّ حِسَانٍ “(سورۃ الرحمن

آیۃ ۷۶) کو " مُتَّكِئِينَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَعَبَاقَرِيٍّ حِسَانٍ " پڑھتے تھے۔ 'عبقری' ان کی زبان پر نہیں آتا تھا، وہ 'عباقری' پڑھتے تھے۔ حضور ﷺ اس پر مسکراتے تھے کہ ٹھیک پڑھتے ہو۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جن کے بارے میں میں بتا چکا ہوں کہ وہ حضرت جبرئیل جیسا قرآن پڑھتے تھے۔ ان کی زبان میں "ح" کا مخرج نہیں تھا۔ وہ جس قبیلے کے تھے وہاں 'ح' کا مخرج نہیں تھا، 'ح' کی جگہ 'ع' تھا۔ چنانچہ الحمدللہ رب العالمین کو پڑھتے تھے العمدلله رب العالمین۔ لیکن حضور ﷺ اس کو قبول کرتے تھے۔ دیکھیے حرف بدل رہا ہے لیکن حضور ﷺ قبول فرما رہے ہیں۔

اصل مدعا:

یہ سن کر آپ لوگ کسی فتنے میں مت پڑیئے گا۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ قرآن غلط ہی پڑھتے رہیے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ اس باب میں سہولت ہے۔ یہ سہولت رسول اللہ ﷺ نے دی ہے۔ اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں کہ اگر قرآن صحیح نہیں پڑھ پا رہے ہیں تو قرآن مت ترک کیجیے۔ تب بھی پڑھتے رہیے اس کا پڑھنا اسی حالت میں باعث ثواب بنے گا۔ اس لیے کہ اللہ تعالی دل کو دیکھتے ہیں، صرف زبان کو نہیں دیکھتے۔ حدیث میں آتا ہے "عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَ اَجْسَامِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكم "(رواہ مسلم) اللہ تعالی تمھاری صورتوں اور جسم کو نہیں دیکھتے، البتہ تمھارے دل کو دیکھتے ہیں تمھاری نیتوں کو دیکھتے ہیں کہ بندہ نیت کیسی لے کر آیا ہے؟ اگر اس کو قرآن سے عشق ہے، وہ پڑھنا چاہتا ہے لیکن صحیح نہیں ادا ہو رہا ہے تو اللہ تعالی فرشتوں سے کہتے ہیں کہ صحیح لکھو۔ اس کا پڑھنا غلط مت لکھنا، بالکل صحیح پڑھنا لکھنا۔ خدا کی رحمت تو رحمتِ عام و رحمتِ تمام ہے۔ وہ اتنی سی بات پر فکر نہیں کرتے جتنا ہم لوگ کرتے ہیں لیکن دل صحیح ہو تب۔ اگر دل غلط ہوگا تو بہت مواخذہ ہوگا۔ دل درست ہو تو کیا کہنا۔

غرض میں یہ کہہ رہا ہوں کہ قرآن پاک پڑھنا چاہیے۔ رسول اکرم ﷺ نے ہر

ایک کو قرآن پڑھا دیا ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ 'پروردگار! میری امت میں کمزور بھی ہیں، بوڑھے بھی ہیں، جوان بھی ہیں، بچے بھی ہیں، عورتیں بھی ہیں'۔ عورتوں کا لہجہ بالکل الگ نرالا ہوتا ہے۔ ہم لوگ سنیں تو ہنسی آوے۔ عجیب نرالے انداز سے پڑھتی ہیں۔ ہمارے علاقے میں ایک بڑے قاری ہیں۔ امام القرا ہیں اِس زمانے کے۔ آپ کے بہار ہی کے رہنے والے ہیں۔ ان کی بیوی ماشاءاللہ پوری بہاری ہے۔ قرآن کریم وہی 'جیم' والا پڑھتی ہے۔ ایک دن انھوں نے سوچا کہ میں اتنا بڑا قاری ہوں اور میری بیوی بالکل قرأت جانتی ہی نہیں ہے۔ بیوی سے کہا کہ 'قرآن پڑھو'۔ اس نے 'اعوج بالله من السيتان الرجيم' کہا۔ انھوں نے کہا کہ 'ارے! غلط پڑھتی ہو، ایسے نہیں پڑھا جاتا'۔ پھر قاری صاحب نے اپنی قرأت میں 'اعوذ بالله من الشيطان الرجيم' کہا۔ اس نے کہا کہ 'آپ غلط پڑھتے ہیں، ہم کو مولوی صاحب نے ایسے ہی 'اعوج بالله من السيتان الرجيم' پڑھایا ہے۔ آپ غلط پڑھتے ہیں'۔ اب ہزار قاری صاحب کہہ رہے کہ 'یہی صحیح ہے، تم غلط پڑھ رہی ہو'۔ وہ کہہ رہی ہے 'نہیں نہیں رہنے دیجیے، میں ہی صحیح پڑھتی ہوں'۔ میں نے قاری صاحب سے کہا کہ آپ انھیں اسی طرح پڑھنے دیجیے۔ ان کا دل اچھا ہے۔ اب قرآن پر ان کی زبان نہیں ٹوٹے گی، بوڑھی ہوگئی ہیں، مت محنت کیجیے۔ آپ کو اس پر ثواب ملے گا اور ان کو اُس پر ثواب ملے گا۔

ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالی اپنے نادان اور کم پڑھے لکھے بندوں کو چھانٹ دیں گے کہ ہمارے یہ بندے ٹھیک نہیں ہیں، کم پڑھے لکھے ہیں، ان کو قرآن پڑھنا نہیں آتا تھا۔ جیسے آتا ہو ویسے تلاوت کیجیے، قبول کرنے والا پروردگار بڑا مہربان ہے۔ اس کی مہربانی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس لیے قرآن پاک کی ہمیشہ تلاوت کرتے رہنا چاہیے۔ نہ تلاوت ہو سکے تو دوسروں سے پڑھوا کر سننا چاہیے۔ اس کا بھی موقع نہ ہو تو خود ہی قرآن پاک کھول کر اس کی زیارت ہی کرنی چاہیے کہ پروردگار! ہمارا اس پر ایمان ہے اور یہ حق ہے۔ اللہ تعالی کبھی بھی نواز دیں گے۔

قرآن کی تلاوت ہر حال میں مفید ہے:

میرے دوستو! قرآن عجیب چیز ہے جو اللہ تعالی نے ہم کو دی ہے (میں دوسری بات بیان کرنے والا تھا لیکن دوسری بات چل پڑی لیکن یہ بھی بہت ضروری اور مفید ہے) قرآن پاک سے بےتعلقی کی وجہ سے ہمارا کام بگڑ رہا ہے۔ قرآن پاک سے ہم جتنا تعلق پیدا کریں گے اتنا ہی ہمارا کام بنے گا۔

تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضرت امام احمد ابن حنبل نے اللہ تعالی سے پوچھا کہ 'پروردگار! قرآن پاک پڑھنے سے آپ کا قرب حاصل ہوگا۔ لیکن یہ ارشاد فرمائیں کہ سمجھ کر پڑھنے سے قرب حاصل ہوگا یا بغیر سمجھے بھی ہو جائے گا' اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا کہ 'سمجھ کر پڑھے یا بغیر سمجھے پڑھے ہر صورت میں قرب اور رضا حاصل ہوگی۔' کتنی بڑی مہربانی ہے یہ خدائے تعالی کی۔ یہ ایسی دولت ہے جو ہمیں مفت میں ملی ہوئی ہے اور ہم اس سے محروم ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالی نے اس میں ایسی برکت رکھی ہے اور ایسی نورانیت رکھی ہے کہ اس کی کوئی حد و انتہا نہیں۔

میرے دوستو! قرآن پاک کا اہتمام کیجیے۔ عورتوں سے بھی اہتمام کرائیے اور بچوں سے بھی اہتمام کرائیے۔ قرآن پاک کے مکاتب، قرآن پاک کے اساتذہ، قرآن پاک کے پڑھانے والے، یہ بڑی قیمتی شے ہیں۔ ان کے لیے مچھلیاں تک پانی میں دعا کرتی ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَ عَلَّمَه" (بخاری وابوداود) تم میں سے سب سے بہتر انسان وہ ہے جو قرآن پاک پڑھے اور پڑھائے۔ ہم نے قرآن پڑھانے والوں کو حقیر سمجھ رکھا ہے۔ واللہ آج ہم حقیر سمجھیں گے لیکن کل ان کی عزت سامنے آئے گی جب کہ وہ قرآن پڑھاتے ہوئے اللہ کے حضور پہنچ جائیں گے، تب ان کی عزت سمجھ میں آئے گی۔ ہمارے سمجھنے کا کیا اعتبار؟ ہم تو آج کسی کو عزت والا سمجھتے ہیں اور پھر کل اسی کو ذلیل سمجھنے لگتے ہیں۔ بات تو وہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول فرما دیں۔ خدا اور اس کے رسول نے

جس کو عزت دی وہ عزت والا ہے اور جس کو خدا اور رسول نے عزت نہیں دی وہ عزت والا نہیں ہے۔ اللہ نے قرآن پڑھنے اور پڑھانے والے کو عزت بخشی ہے۔ ہمارے معیار کا کوئی اعتبار نہیں۔ ہمارا معیار ٹوٹتا پھوٹتا رہتا ہے۔

دنیا کے معیار کا کیا اعتبار؟:

ایک جگہ دریا میں کشتی چل رہی تھی، اس میں تین چار عربی کے طلبہ بھی بیٹھ گئے۔ ملاح کشتی چلا رہا تھا، خوب سیلاب آیا ہوا تھا، لہریں چل رہی تھیں، کشتی اسی میں چلی تو طلبہ کو شرارت سوجھی۔ ملاح سے کہنے لگے کہ ’ارے تم نے کچھ پڑھا ہے؟‘ ملاح نے کہا ’نہیں صاحب! میں نے کچھ نہیں پڑھا‘۔ ’ارے کچھ عربی وربی پڑھی ہے‘؟ ’نہیں صاحب!‘ ’ارے نحو وصرف پڑھی ہے‘؟ وہ بے چارہ نحو وصرف کیا جانے وہ تو صرف ’نہ ہو‘ جانتا تھا۔ کہا ’کچھ منطق پڑھی ہے‘؟ ’نہیں صاحب! ہم منطق ونطق کیا جانیں‘؟ ’اچھا تمھاری عمر کتنی ہوگی؟‘ کہنے لگا ’چالیس سال‘۔ انھوں نے کہا کہ ’زیادہ سے زیادہ اسّی سال جیو گے اور پڑھا لکھا کچھ نہیں۔ نہ نحو وصرف پڑھی نہ منطق پڑھی نہ اور کوئی علم پڑھا تو آدھی عمر تو تم گنوادی‘۔ وہ بے چارہ ملاح چپ ہوگیا کچھ نہیں بولا۔ اب کشتی جو آگے چلی تو ایک بھنور میں پھنس گئی اور ادھر ادھر ڈولنے لگی۔ مولوی صاحبان کی حالت خراب۔ ملاح نے پوچھا کہ ’مولانا صاحب! تیرنا سیکھا ہے؟‘ کہا ’نہیں صاحب! تیرنا تو ہم لوگوں نے نہیں سیکھا ہے۔ کشتی کو کسی طرح بچاؤ‘۔ ملاح نے کہا کہ ’تب تو آپ لوگوں نے پوری زندگی گنوادی‘۔

ہمارے معیار کا یہی کا حال ہے۔ ابھی تو وہ لوگ کامیاب تھے، یہ ناکام تھا۔ اب یہ کامیاب ہے اور وہ لوگ ناکام ہیں۔ تو ہمارے معیار کا کیا اعتبار؟ ہم کسی کو کامیاب کہہ دیں تو کیا؟ اور ہم کسی کو ناکام کہہ دیں تو کیا؟ ہم کسی کو اچھا کہیں تو کیا؟ ہم کسی کو برا کہیں تو کیا؟ اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ اعتبار پروردگار کا ہے، اس کے رسول کا ہے۔ وہ کہہ دیں کہ یہ بہتر ہے تو وہ بہتر۔ وہ کہہ دیں کہ یہ برا ہے تو برا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ“ (بخاری وابوداود) تم میں سے

سب سے بہتر انسان وہ ہے جو قرآن پڑھے اور پڑھائے۔ یہ مکتب میں بیٹھے ہوئے مولوی صاحب میاں جی لوگ پڑھاتے ہیں۔ ہم ان کی عزت نہیں کرتے، ان کی عزت اللہ تعالی کرتے ہیں۔ دنیا کی مخلوقات ان کی عزت کرتی ہے، پرندے ان کی عزت کرتے ہیں، مچھلیاں ان کی عزت کرتی ہیں۔ سب ان کے لیے دعا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ قرآن پڑھا رہے ہیں، اللہ کا کلام پڑھا رہے ہیں۔ ان کی عزت کرنی ضروری ہے۔ ان کو جتنی عزت کی نگاہ سے دیکھیں گے، اتنا ہی ہمارے گھر میں علم آئے گا، ہمارے گھر میں قرآن آئے گا، ہمارے گھر میں دین آئے گا۔ ایسی زبردست دولت اللہ نے ہم کو دی ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں ہوسکتی۔

دو انمول دولت جن کی قدر ضروری:

ایک بزرگ تھے شیخ صدرالدین عارف۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ’اللہ نے مسلمانوں کو دو ایسی دولتیں دی ہیں کہ دنیا کی کسی اور قوم کے پاس نہ وہ دولت ہے اور نہ آئندہ کبھی ملے گی۔ ایک دولت رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ ہے۔‘ اگرچہ آپ ہمارے درمیان نہیں ہیں، آپ دنیا سے تشریف لے گئے لیکن قبر میں زندہ ہیں اور امت کے لیے فکر رکھتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں۔ ایسی شخصیت اللہ تعالی نے ہمیں عطا کی ہے کہ ساری دنیا میں اس کا جواب نہیں ہے۔ ساری دنیا ہی نہیں، زمین و آسمان میں اس کا کوئی جواب نہیں۔ حضور اکرم ﷺ کی شکل میں ہمیں بہت عظیم دولت ملی ہے لیکن مسلمان ان کی بھی ناقدری کرتا ہے۔ ان کے احکام کی اطاعت نہیں کرتا۔ یہ حضور ﷺ کی ناقدری ہے۔ قدر یہ ہے کہ ان کے احکام کا اتباع کیا جائے، ان کے احکام پر جان دینے کے لیے انسان تیار رہے۔ اور دوسری بہت بڑی دولت قرآن پاک کی دولت ہے۔ یہ اللہ کی صفت ہے، اللہ کا کلام ہے۔ دنیا کی ہر چیز مخلوق ہے، اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے لیکن قرآن پاک مخلوق نہیں ہے۔ قرآن پاک اللہ کی صفت ہے جو ہمارے درمیان میں آگئی ہے۔ یہ دولت بہت بڑی دولت ہے۔ دنیا میں اور کسی کو یہ نصیب نہیں ہے۔ اس کی قدردانی کیا

ہے؟ اس کی قدر دانی یہی ہے کہ ہم جی جان سے اس میں لگ جائیں، اس کی تلاوت کریں، اس کو پڑھیں، اس کو سمجھنے کی کوشش کریں، علما سے اس کا معنی و مفہوم سمجھیں۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے۔

○○○

دل اور زبان کی حفاظت راس التقوی ہے

آمدم بر سر مطلب:

بہر حال میں نے قرآن پاک کے فضائل پر بہت ساری چیزیں بیان کر دیں، اب میں تھک بھی گیا ہوں، اس لیے اب اس بات کو ختم کر کے جو موضوع اٹھایا تھا اور جتنا بیان کیا تھا پھر بیان کر دیتا ہوں۔ اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں ”یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا“ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور درست بات بولو۔

مختصر طور پر سمجھ لیجیے کہ انسان کے جسم میں دو ایسی چیزیں ہیں جس سے انسان انسان بنتا ہے۔ اگر یہ دو چیزیں انسان کے جسم میں نہ ہوں تو انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں۔ پیٹ ہر ایک کے پاس ہے، آنکھ ہر ایک کے پاس ہے، کان ہر ایک کے پاس ہے، ناک ہر ایک کے پاس ہے، پاؤں ہر ایک کے پاس ہے۔ جتنے جانور ہیں سب کے پاس یہ چیزیں ہیں۔ پھر انسان اور جانور میں جو فرق کرنے والی چیز ہے وہ کیا ہے؟ ایک تو اس کا دل ہے۔ سمجھنے والا دل جو دوسرے جانوروں کو نہیں ملا ہے۔ گوشت کا لوتھڑا تو ہر ایک کے پاس ہے لیکن اس لوتھڑے میں جو استعداد سمجھنے کی ہے اور سوچنے کی ہے اور خیالات کی ہے، وہ استعداد کسی اور جانور میں اللہ تعالی نے نہیں دی ہے۔ اور دوسری چیز زبان ہے۔ اس زبان سے انسان بولتا ہے، اپنی بات دوسروں کو سمجھاتا ہے اور دوسرے کی بات سمجھتا ہے۔ یہی دو چیزیں ہیں جس سے انسان انسان بنتا ہے۔ عربی کا مقولہ ہے ”اَلْاِنْسَانُ ھُمَا الْاَصْغَرَانِ اَحَدُھُمَا اَلْقَلْبُ وَآخَرُھُمَا اَلْلِسَانِ“ انسان دو چھوٹی چیزوں کا نام ہے۔ دونوں چیزیں اپنے حجم کے اعتبار سے چھوٹی ہیں۔ ایک تو دل ہے

اور دوسرے زبان ہے۔ انھیں دونوں چیزوں سے انسان انسان بنتا ہے۔ اللہ تعالی نے قرآن پاک میں انھیں دونوں چیزوں کی اصلاح کا حکم دیا ہے۔ ناک، کان، آنکھ سب کی اصلاح ہوجائے گی سب تندرست ہوجائیں گے، اگر صرف دو چیزوں پر دھیان رکھا جائے۔ ایک دل اور دوسرے زبان۔ دل کا دھیان یہ ہے کہ اللہ کا ڈر پیدا کیا جائے، خدائے تعالی کا خوف پیدا کیا جائے، تقوی پیدا کیا جائے، شرک سے بچا جائے، کفر سے بچا جائے، بدعات سے بچا جائے، ایک دوسرے کی عداوت اور دشمنی سے بچا جائے۔ یہ دل کی طہارت ہے۔ یہ تقوی ہے، یہ اللہ سے ڈرنا ہے۔ دل ٹھیک کرو سارا معاملہ دل ہی پر ہے۔ نبی کریم ﷺ کا مشہور ارشاد ہے "عَنِ النُّعمَانِ بِنِ بَشِیُرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنهُمَا قَالَ: سَمِعتُ رَسُوُلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوُلُ: اَلَا وَاِنَّ فِی الُجَسَدِ مُضُغَۃٌ۔ اِذَا صَلُحَتُ صَلُحَ الُجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتُ فَسَدَ الُجَسَدُ کُلُّہٗ۔ اَلا وَھِیَ الُقَلبُ" (اخرجہ البخاری فی الصحیح) سنو! انسان کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ اگر وہ درست ہوجائے تو سب درست ہوجائے۔ اگر وہ بگڑ جائے تو سب بگڑ جائے۔ سنو! وہ دل ہے۔ دل بناؤ سب بن جائے گا، دل کو بگاڑو سب بگڑ جائے گا۔ دل کی اصلاح کس میں ہے؟ دل کی اصلاح تقوی میں ہے، اللہ سے ڈرنے میں ہے۔ اللہ کا ڈر جب پیدا ہوگا تو انسان تنہائی میں ہوگا تو بھی گناہ نہیں کرے گا اور مجمع میں ہوگا تو بھی گناہ نہیں کرے گا۔

تقوی کی برکت:

ایک واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ کا بتاؤں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ ٹہل رہے تھے، تہجد کے وقت کی بات ہے۔ ایک مکان کے پاس گزرے، ایک بوڑھی عورت اپنی بچی سے کہہ رہی تھی کہ 'بیٹی! دودھ بیچنا ہے اس میں پانی ملا دو' دودھ بیچنے والوں کی شریعت یہی ہے کہ بغیر پانی ملائے دودھ بیچنا جائز نہیں ہے۔ اور واقعی ان کی فن کاری کا کمال ہے کہ پانی جو مفت میں ملنے والی چیز ہے، اس پر بھی پیسہ لے لیتے ہیں۔ اور پیسہ بھی دودھ کے بھاؤ لیتے ہیں۔ پہلے بھی لوگ گڑبڑ کرتے رہے ہیں۔ وہ بے چاری بوڑھی

عورت کوئی نومسلم رہی ہوگی جس کو صاف صاف احکام کا پورے طور پر علم نہیں رہا ہوگا۔ کہنے لگی کہ ’بیٹی! دودھ میں پانی ملادو کل بیچنا ہے نا۔‘ بڑھیا کی بیٹی کہتی ہے ’اماں جان! امیر المومنین نے اعلان کیا ہے کہ دودھ میں پانی نہ ملایا جائے۔ اس لیے میں تو نہیں ملاتی۔‘ بڑھیا کہتی ہے کہ ’کوئی امیر المومنین دیکھ رہے ہیں؟ ملادو۔‘ اور اتفاق دیکھیے کہ امیر المومنین سن رہے تھے۔ ان کے سننے کی حالت میں کہہ رہی ہے کہ کوئی امیر المومنین دیکھ رہے ہیں۔ اس لڑکی نے جواب دیا اور بہت اچھا جواب دیا کہ ’اماں جان! امیر المومنین نہیں دیکھ رہے ہیں لیکن جس پروردگار کا حکم امیر المومنین نے پہنچایا ہے، وہ پروردگار دیکھ رہا ہے۔ اس لیے میں دودھ میں پانی نہیں ملاسکتی۔‘ حضرت عمرؓ نے اس مکان پر نشان لگادیا اور چلے آئے۔ صبح کو پتہ لگایا کہ وہ لڑکی کس عمر کی ہے؟ کیسی ہے؟ اس کا نکاح ہوا ہے یا نہیں؟ پتہ چلا کہ نکاح نہیں ہوا ہے، بالغ ہے۔ اپنے صاحبزادے سے انھوں نے نکاح کا پیغام پہنچوایا کہ یہ لڑکی متقی ہے، تنہائی میں بھی خدا سے ڈرتی ہے۔ لہٰذا اپنے لڑکے سے نکاح کردیا۔ حضرت عاصم ان کے صاحبزادے کا نام تھا۔ اس لڑکی کے نواسے حضرت عمر بن عبدالعزیز علیہ الرحمہ ہیں جو خلیفہ راشد ہوئے ہیں اور پانچویں خلیفہ کہلاتے ہیں۔ آپ خیال کیجیے کہ ایک لڑکی کا تقوی حضرت عمرؓ کی نگاہ میں کتنا مقبول ہوا۔ صرف حضرت عمر نہیں بلکہ اللہ تعالی کی نگاہ میں مقبول ہوا اور ان سے جو اولاد پیدا ہو رہی ہیں وہ ایسی صالح اولاد پیدا ہو رہی ہیں کہ تابعین میں ان کا جواب نہیں۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ ”اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقَاکُمْ“ (سورۃ الحجرات آیۃ ۱۳) کہ خدا کے نزدیک معزز اور مقرب وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

زبان پر نسلِ انسانی کا انحصار ہے:

اور دوسری چیز زبان ہے اور زبان کا عمل اللہ اکبر! وہ ہے کہ ساری نسلِ انسانی زبان پر قایم ہے۔ ہماری اور آپ کی جو نسل ہے وہ زبان پر قایم ہے۔ اس لیے کہ نکاح کس سے ہوتا ہے؟ دل سے تو ہوتا نہیں ہے، زبان ہی سے ہوتا ہے۔ قاضی کہتا ہے کہ میں

نے فلاں عورت کو تمھارے نکاح میں دیا، تم نے قبول کیا؟ وہ کہتا ہے میں نے قبول کیا۔ زبان ہی سے قاضی بولا کہ میں نے نکاح کر دیا اور زبان ہی سے یہ بولا کہ میں نے قبول کیا۔ اب ایک اجنبی عورت اس کی بیوی بن گئی اور دونوں کے اتصال سے جو بچہ ہوا وہ پاکیزہ بچہ ہے، حلال ہے، درست ہے۔ اب اس کی نسل چل رہی ہے۔ یہ نسل درست ہوتی ہے کس سے؟ زبان سے۔ اگر یہی زبان سے بولا نہ ہوتا اور کوئی مرد کسی عورت سے تعلق پیدا کر لیتا اور اس سے بچہ ہوتا تو اس کا کوئی باپ نہیں ہوتا۔ وہ بلا باپ کا بچہ ہوتا، اس بچے کی کوئی نسل نہیں ہوتی، شریعت نے اس کی نسل کو ختم کر دیا ہے۔ اس لیے کہ زبان کے بول وہاں نہیں ہے اور یہاں زبان کی بول موجود ہے۔ ساری نسل انسانی ہم اور آپ جتنے ہیں سب اپنے اپنے باپ کی طرف منسوب ہوتے ہیں تو کس واسطے سے منسوب ہوتے ہیں؟ یہی زبان کے بول ہی تو ہیں۔ نکاح ہوا ہے جس کی وجہ سے ہماری نسل چل رہی ہے۔

صحتِ زبان وقلب کی اہمیت:

غرض زبان کی اتنی اہمیت ہے کہ پوری نسل انسانی اسی زبان پر قایم ہے اور باقی ہے اور یہی زبان ہے کہ آدمی اسی سے کہہ دیتا ہے کہ میں نے تم کو طلاق دیدیا، بس نکاح ختم۔ اب بیوی اس کی بیوی نہیں رہی۔ یہ کہاں سے عمل ہوا ہے؟ زبان ہی سے عمل ہوا ہے۔ اسی زبان کے عمل سے عورت بیوی بنتی ہے اور اسی زبان کے عمل سے بیوی نکاح سے نکل جاتی ہے۔ اب دیکھنا جائز نہیں، اس کو چھونا جائز نہیں، اس سے صحبت کرنا جائز نہیں۔ بالکل الگ ہوگئی۔ کوئی رشتہ اور ایسا نہیں ہے جو زبان سے قایم ہو۔ صرف یہی ایک رشتہ ہے جو زبان سے قایم ہوتا ہے۔ ورنہ ماں باپ کا رشتہ، دادا کا رشتہ، بھائی کا رشتہ یہ سب خون سے ثابت ہوتا ہے، خون سے بنتا ہے۔ اور بیوی کا رشتہ زبان سے بنتا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ بیوی کا رشتہ قوی ترین رشتہ بن گیا۔ زبان سے بنا ہوا رشتہ اتنا قوی بن گیا کہ پوری نسلِ انسانی اسی پر قایم ہے۔ تو زبان کی اہمیت آپ نے سمجھی کتنی

ہے؟ اس کو درست کرنا ہے، ٹھیک کرنا ہے۔ انھیں دونوں سے انسان، انسان ہے۔

تو دل ٹھیک کریں زبان ٹھیک کریں۔ دل میں کفر نہ ہو، شرک نہ ہو، کینہ نہ ہو، عداوت نہ ہو۔ اور زبان پر کوئی بری بات نہ ہو۔ نہ غیبت ہو، نہ شکایت ہو، نہ جھوٹ ہو اور نہ چغلی ہو۔ انسان جو برائیوں میں ملوث ہوتا ہے اسی زبان کی وجہ سے ہوتا ہے۔ زبان کو روکے رکھیں اور دل کو درست کریں۔ جب یہ دونوں چیزیں ٹھیک ہو جائیں گی تو اللہ تعالی اس کے عوض میں کیا عطا فرمائیں گے؟ فرماتے ہیں ’’يُصۡلِحۡ لَكُمۡ اَعۡمَالَكُمۡ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ‘‘ کہ تمھارے اعمال کو درست کر دیں گے اور تمھارے گناہوں کو بخش دیں گے۔ اعمال کو درست کرنے کا مطلب کیا ہے؟ ایک مطلب تو یہ ہے کہ انسان جب اپنی زبان ٹھیک کر لے گا تو خود بخود اللہ تعالی اس کو اچھے کاموں کی توفیق عطا فرما دیں گے۔ وہ برے کاموں کی طرف جائے گا ہی نہیں، بری چیزوں کو اس کا دل قبول نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ اس کا دل تندرست ہو گیا ہے اور اس کی زبان درست ہو گئی ہے۔ تندرست آدمی کے منھ میں اگر مکھی چلے جائے تو قبول نہیں کرتا، اگر معدہ میں چلی گئی تو قے ہو جاتی ہے۔ اس کو نکال دیتا ہے۔ بیمار آدمی اس ناگواری کو برداشت کر سکتا ہے لیکن تندرست آدمی کوئی ناگوار چیز اپنے منھ میں ڈالنا برداشت نہیں کرے گا۔ ایسے ہی جس کا دل تندرست ہو گیا، جس کی زبان تندرست ہو گئی، اگر خدانخواستہ اس نے کوئی غلط کام کر بھی لیا تو اس کو غلطی کا احساس فوراً ہو جائے گا اور اس سے باز آ جائے گا۔

اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ دل اور زبان کو ٹھیک کر لو تو میں تمھیں اچھے اعمال کی توفیق دوں گا۔ اگر کوئی کام بگڑا بھی ہو گا تو ہم اسے بنا دیں گے۔ اللہ تعالی بگڑے ہوئے کاموں کے بنانے پر قادر ہیں۔ بظاہر ہم سے غلطی ہو جائے گی لیکن اللہ تعالی اسے درست کر دیں گے۔ ایسے کتنے واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ آدمی کوئی کام کرتا ہے، اس میں بظاہر غلطی معلوم ہوتی ہے لیکن بعد میں پتہ چلتا ہے کہ بالکل صحیح ہوا۔ اللہ تعالی اسی کو درست کر دیتے ہیں۔ ’’يُصۡلِحۡ لَكُمۡ اَعۡمَالَكُمۡ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ‘‘ اللہ تعالی تمھارے

اعمال کو درست فرما دیں گے اور تمھارے گناہوں کو معاف کر دیں گے۔ دنیا میں ہم کو کیا چاہیے؟ یہی کہ ہمارے کام بنتے رہیں۔ اور آخرت میں ہمیں کیا چاہیے یہی کہ ہمارے گناہ معاف ہو جائیں۔ غرض اس نسخہ میں دنیا کی بھی کامیابی ہے اور آخرت کی بھی کامیابی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد ایک جامع بات ارشاد فرمائی "وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا" جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی، اس نے بڑی کامیابی حاصل کر لی۔ بس یہی بنیادی بات ہے کہ ہمیشہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنی چاہیے۔ یہی کامیابی کی کنجی ہے۔ اسی میں دنیا و آخرت کی فلاح ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین

❑❑❑

قرآن کی عظمت

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہ وَنَسْتَعِیْنُہ وَنَسْتَغْفِرُہ وَنُوْمِنُ بِہ وَنَتَوَکّلُ عَلَیْہ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یّھْدِہ اللّٰہُ فَلَا مُضِلّ لَہ وَ مَن یُّضْلِلُہ فَلَا ھَادِیَ لَہ۔ وَنَشْھَدُ اَن لّاَاِلٰہَ اِلّا اللّٰہُ وَحْدَہ لَا شَرِیْكَ لَہ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیَّدَنَا وَمَوْلَانَا مَحَمّداً عَبْدُہ وَرَسُوْلُہ اَرْسَلَہ بِالْحَقِّ بَشِیْراً وَنَذِیْراً ۔ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہ وَعَلٰی آلِہ وَاَصْحَابِہ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً۔ اَمَّابَعْدُ:

فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمان الرحیم

لَوْ اَنْزَلْنَاھٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰی جَبَلٍ لَرَاَیْتَہُ خَاشِعًا مُتَصَدِّعًا مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ و تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُھَا لِلنَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ (۲۱) [سورہ حشر]

ترجمہ: **اگر ہم اتارتے اس قرآن کو کسی پہاڑ کے اوپر تو تم دیکھتے اس کو کہ وہ دب جاتا، پھٹ جاتا اللہ کے خوف سے۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تا کہ وہ غور و فکر کریں۔**

کلام اللہ کی عظمت:

جب اللہ کا کلام نازل ہو رہا تھا تو اہل ایمان اس سے بہت متأثر تھے۔ بڑی عظمت اللہ کے کلام کی ان کے نزدیک تھی، لیکن کفار پر کوئی اثر نہیں تھا۔ اس لیے وہ اس کی تکذیب کرتے اور کہتے کہ ”لَا تَسْمَعُوْا لِھٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِیْہِ لَعَلَّکُمْ تَغْلِبُوْنَ“ (سورۃ حم السجدۃ آیۃ ۲۶) اس قرآن کو مت سنو، ادھر اپنا کان مت لگاؤ، اور جب پڑھا جائے تو لغو کام کرتے رہو تا کہ تم اس پر غالب آ جاؤ۔ اللہ کے کلام کا حق یہ ہے

کہ آدمی اس سے متأثر ہوجائے۔ اللہ کی ذات سب سے بڑی ہے اس لیے اس کا کلام بھی سب سے بڑا ہے، مگر یہ کفار اس سے متأثر نہیں ہوتے تھے۔ اللہ تعالی اس کی عظمت بیان فرما رہے ہیں کہ ’یہ ایسے مرتبہ اور شان والا کلام ہے کہ پہاڑ جو بہت طاقتور ٹھوس اور سخت مخلوق ہے، اس پر یہ کلام نازل فرمادیں تو وہ دب جائے گا، پھٹ جائے گا، اس میں ذرا شعور پیدا کردیا جائے تو وہ اس کے بوجھ کو برداشت نہیں کرسکتا۔ اور واقعی ایسا ہی ہے، جب پہلی بار قرآن کریم کا نزول ہوا تو اللہ کے رسول ﷺ جو بہت طاقت ور تھے۔ اور یہ طاقت روحانی بھی تھی، جسمانی بھی تھی اور قلبی تھی، سب طاقتیں تھیں مگر جب ابتداے وحی میں قرآن کی چند آیتیں نازل ہوئیں تو فرمایا کہ ”لَقَدْ خَشِيتُ عَلَىٰ نَفْسِیْ“ (بخاری) مجھے اپنی جان جانے کا اندیشہ ہونے لگا۔ سخت جاڑے میں چند کلمات نازل ہوتے تو ایسی کیفیت ہوتی کہ چہرۂ انور پر پسینے کے قطرات نظر آنے لگتے۔

ایک نئے صحابی نے حجۃ الوداع کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ’حضور ﷺ پر جب وحی نازل ہوتی ہے تو آپ کی کیفیت کیسی ہوتی؟ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں تو نہیں جانتا، آپ اس کیفیت کو جانتے ہیں، جب وحی نازل ہو تو آپ مجھے بتلا دیجیے گا، تاکہ میں بھی دیکھ سکوں۔‘ آپ ﷺ خیمہ میں تشریف رکھتے تھے، ایک صاحب آئے اور کوئی مسئلہ پوچھا۔ آپ خاموش رہے جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد چہرۂ انور کا رنگ بدلنے لگا۔ وحی نازل ہونے کے اثرات ظاہر ہونے لگے، تو جلدی سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان صاحب کو بلایا کہ ’دیکھو وحی نازل ہورہی ہے۔‘ وحی کے نزول کے وقت زبردست بوجھ پڑتا تھا، ایسا وزن ہوتا تھا کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کاتب وحی ہیں، فرماتے ہیں کہ ’ایک بار بستر پر بیٹھا تھا، حضور ﷺ کا زانو میرے زانو کے اوپر تھا۔ اتنے میں ”غَيْرُ أُولِی الضَّرَرِ“ (سورۃ النساء آیۃ ۹۵) کا ٹکڑا نازل ہوا۔ صرف اتنے ٹکڑے کے نازل ہونے سے ایسا لگا کہ میری ہڈی چور ہوجائے گی۔ اندازہ لگایئے کہ اتنا وزن تھا جسے اللہ کے رسول ﷺ نے برداشت کیا اور ہمیں آسان کر کے پیش کیا جو آج بچہ بچہ پڑھ

رہا ہے۔ ” وَلَقَدۡ يَسَّرۡنَا الۡقُرۡآنَ لِلذِّكۡرِ فَهَلۡ مِنۡ مُدَّكِرٍ “ (سورة القمر آية ۱۷) ہم نے قرآن کو آسان کر دیا نصیحت کے لیے، تو کیا ہے کوئی نصیحت پکڑنے والا۔ لیکن آسان ہونے کے باوجود اس کا وزن بہت زیادہ ہے۔ اسی طرح اس کے پڑھنے والے دنیا والوں کی نظر میں چاہے جو ہوں، مگر اللہ کی نظر میں حافظوں اور عالموں کا وزن بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ محض حافظ قرآن کا وزن یہ ہے کہ حدیث میں آتا ہے کہ ”لِحَامِلِ الۡقُرۡآنِ اِذَا عَمِلَ بِهٖ فَاَحَلَّ حَلَالَهٗ وَحَرَّمَ حَرَامَهٗ يَشۡفَعُ فِیۡ عَشَرَةٍ مِنۡ اَهۡلِ بَيۡتِهٖ يَوۡمَ الۡقِيَامَةِ كُلُّهُمۡ قَدۡ وَجَبَتۡ لَهُ النَّارُ“ (شعب الايمان للبيهقى) حافظِ قرآن جو قرآن کی حلال کردہ چیزوں کو حلال اور حرام کردہ چیزوں کو حرام سمجھتا ہے، وہ قیامت کے دن اپنے گھر کے ایسے دس افراد کی سفارش کرے گا جن کا جہنمی ہونا طے ہو چکا ہو۔

خود یہ قرآن کریم اپنے پڑھنے والوں کے بارے میں شفارش کرے گا۔ عَنۡ اَبِی اُمَامَةَ ؓ قَالَ: سَمِعۡتُ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوۡلُ: اِقۡرَؤُوا الۡقُرۡآنَ فَاِنَّهٗ يَأۡتِیۡ يَوۡمَ الۡقِيَامَةِ شَفِيۡعاً لِاَصۡحَابِهٖ“ (صحيح مسلم) حضرت ابوامامہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قرآن پڑھا کرو، کیوں کہ یہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کے لیے شفارسی ہوگا۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ ”عَنۡ اَبِی هُرَيۡرَةَ ؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: سُوۡرَةٌ مِنَ الۡقُرۡآنِ ثَلَاثُوۡنَ آيَةً تَشۡفَعُ لِصَاحِبِهَا حَتّٰى يُغۡفَرَ لَهٗ: تَبَارَكَ الَّذِی بِيَدِهِ الۡمُلۡكُ“ (سنن ابوداؤد) حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ قرآن کی ایک سورہ جو تیس آیتوں والی ہے، اپنے پڑھنے والے کی سفارش کرے گی یہاں تک کہ اس کی مغفرت ہو جائے۔ اور وہ تبارک الذی بیدہ الملک ہے (سورہ ملک)

حضرت ابوہریرہ ؓ سے مروی ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”يَجِیۡئُ الۡقُرۡآنُ يَوۡمَ الۡقِيَامَةِ فَيَقُوۡلُ: يَا رَبِّ حَلِّهٖ، فَيُلۡبَسُ تَاجَ الۡكَرَامَةِ، ثُمَّ يَقُوۡلُ: يَا رَبِّ زِدۡهُ، فَيُلۡبَسُ حُلَّةَ الۡكَرَامَةِ، ثُمَّ يَقُوۡلُ: يَا رَبِّ ارۡضَ

عَنُه، فَيَرُضَى عَنُه، فَيُقَالُ لَه: أَقُرأُ وَارُق وَتُزَادُ بِكُلِّ آيَةٍ حَسَنَةً" (ترمذی) قرآن قیامت کے دن پیش ہوگا، پس کہے گا 'اے میرے رب! اسے (صاحبِ قرآن کو) جوڑا پہنا۔' تو اسے کرامت (عزت وشرافت) کا تاج پہنایا جائے گا۔ پھر وہ کہے گا 'اے میرے رب! اسے اَور دے۔' تو اسے کرامت کا جوڑا پہنایا جائے گا۔ وہ پھر کہے گا 'اے میرے رب! اس سے تو راضی ہوجا۔' تو اللہ اس سے راضی ہوجائے گا۔ اس سے (صاحبِ قرآن) کہا جائے گا 'پڑھتا جا اور چڑھتا جا، تیرے لیے ہر آیت کے ساتھ ایک نیکی کا اضافہ کیا جاتا رہے گا۔

یہ ہے قرآن کا وزن اور اس کی عظمت کہ اگر اللہ تعالی نے آسان نہیں کیا ہوتا تو مومن کا دل شق ہوجاتا۔ قیامت میں اس کا وزن ظاہر ہوگا، اور میدان قیامت میں سب سے زیادہ وزن اسی کا ہوگا۔ "اَهُلُ الُقُرآنِ هُمُ اَهُلُ اللّٰهِ خَاصَّةً" اہل قرآن ہی اہل اللہ ہیں۔

حافظِ قرآن کا مرتبہ:

اسی لیے حاملِ قرآن سے کہا جائے گا "اِقُرَءُ وَارُتَقِ وَرَتِّلُ كَمَا كُنُتَ تُرَتِّلُ فِي الدُّنُيَا فَاِنَّ مَنُزِّلَتَكَ عِنُدَ آخِرِ آيَةٍ تَقُرَأُ بِهَا" (اخرجه ترمذی عن ابن عمر ﷺ) صاحبِ قرآن سے کہا جائے گا کہ پڑھتا جا اور چڑھتا جا۔ اور ویسے ہی ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جس طرح تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر ترتیل کے ساتھ پڑھتا تھا۔ پس تیری منزل وہ ہوگی جہاں تیری آخری آیت کی تلاوت ختم ہوگی۔ جو پورے قرآن کا حافظ ہے اس سے بھی کہا جائے گا اور جو پورے قرآن کا حافظ نہیں ہے، کہیں کہیں سے یاد ہے، مختلف سورتیں یاد ہیں، اس سے بھی کہا جائے گا۔ اس قرآن کا اتنا وزن ہوگا کہ حافظِ قرآن کا آخری مقام وہاں ہوگا جہاں وہ قرآن ختم کردے۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ ایک حدیث سے مستنبط ہوتا ہے کہ حافظ قرآن سے کہا جائے کہ پڑھتے رہو اور چڑھتے رہو۔ دنیا میں جب پڑھتے تھے تو تھک جاتے تھے۔ کچھ اللہ کے بندے دنیا میں بھی قرآن پڑھتے نہیں تھکتے۔ حضرت عثمان غنی ؓ ستر

برس کے ہیں، ان کے ایک شاگرد فرماتے ہیں کہ میں مسجد حرام آیا اور ارادہ کیا کہ نماز پڑھوں۔ اتنے میں کسی نے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ دیکھا تو امیر المومنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہیں۔ میں ایک طرف ہو گیا، آگے بڑھ کر انھوں نے نماز کی نیت باندھ لی، اور ایک رکعت میں اس ستر سالہ بوڑھے نے پورا قرآن 'والناس' تک پڑھ ڈالا۔ کون سی طاقت ہے جو انھیں پڑھوا رہی ہے؟ اب تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہم ان سے کہتے ہیں آپ سے نہیں ہو گا جو اس پر ایمان رکھتے ہیں ان سے تو ہوا ہے اور ہو گا۔

بتاؤ! اللہ کی طرف سے برکت اور طاقت کے قائل ہو کہ نہیں؟ وہ انسان ہیں مگر انھیں اس میں اللہ کی طرف سے ایسی غذا ملتی ہے کہ اگر نہ کریں تو کمزور ہو جائیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے اس امت میں نہ جانے کتنے ایسے لوگ گذرے ہیں جن کا قرآن سے شغف اور تعلق کا حال سنیں تو یقین نہیں آئے گا، مگر واقعی ایسا ہی ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

ایک محسوس مثال:

ہمارے یہاں ایک بڑے عالم گزرے ہیں۔ تھے تو پہلوان مگر جسم کوئی غیر معمولی نہیں تھا۔ دیکھنے میں احساس نہیں ہوتا تھا کہ یہ صاحب بھی اندر سے کچھ ہیں۔ ایک بار درخت کی ایک شاخ جھکا کر بکری کو پتے کھلا رہے تھے۔ ان کی پہلوانی کا شہرہ بھی دور دور تک تھا۔ ایک غیر مسلم پہلوان نے بھی خوب تعریف سن رکھی تھی، سوچا چلوں دیکھ تو لوں کیسے مولوی صاحب ہیں۔ ذرا مقابلہ ہو ہی جائے۔ ان سے ملنے نکلا، گاؤں کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک صاحب شاخ جھکائے بکریوں کو پتے کھلا رہے ہیں۔ پوچھا 'اس گاؤں میں کوئی فلاں مولوی صاحب ہیں؟' فرمایا 'ہاں'، پوچھا 'وہ پہلوان بھی ہیں؟' فرمایا 'مگر تم کو ان سے کیا کام ہے؟' اس نے کہا کہ 'میں نے ان کی پہلوانی کا بہت شہرہ سن رکھا ہے، سوچا مقابلہ ہو ہی جائے۔ میں بھی دیکھ لوں کہ کچھ ہیں بھی یا صرف ایسے ہی شہرت ہے؟' اس نے بلانے کے لیے کہا، انھوں نے کہا کہ 'آپ اس ٹہنی کو پکڑ یئے

تا کہ بکری کھاتی رہے، میں ابھی بلا دیتا ہوں۔ یہ خود ایک ہاتھ سے پکڑے تھے مگر اس سے کہا کہ 'دونوں ہاتھ سے پکڑیئے۔' جب اس نے پکڑ لیا تو اِنھوں نے ٹہنی چھوڑ دی اور پہلوان صاحب شاخ سمیت سیدھے اوپر چلے گئے۔ تب اس کو سمجھ میں آیا کہ وہ پہلوان یہی صاحب ہیں۔ پوچھا آپ ہی وہ مولوی صاحب ہیں کیا؟ انھوں نے کہا 'ہاں میں ہی ہوں۔' یہ جسم کے اعتبار سے بڑے نہیں تھے، ڈیل ڈول عام آدمیوں جیسا تھا، مگر طاقت کا اتنا بڑا فرق تھا۔ ایسے ہی عبادات میں ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ امت میں بہت سے گزرے ہیں جن کے اوقات میں، سونے جاگنے میں، کھانے پینے میں بڑی برکت رہی ہے۔ کھانے میں برکت کے تو بہت سے لوگ قائل ہیں، اور یہ برکت اللہ کے رسول ﷺ کو علی وجہ الاتم حاصل تھی۔

کھانے میں برکت:

غزوہِ خندق کے موقع پر خندق کی کھدائی کا کٹھن کام مسلمان کر رہے تھے۔ ایک تو یہ کام مشقت بھرا اور پھر پہلا تجربہ تھا اس نوعیت کے کام کا۔ دوسرے سب فاقہ میں مبتلا تھے، پیٹ پر پتھر باندھ کر کام کر رہے تھے۔ خود حضور اکرم ﷺ دو دو پتھر باندھے ہوئے تھے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے جب یہ حالت دیکھی کہ حضور ﷺ بھی بھوکے ہیں تو چپکے سے گھر گئے، اور بیوی سے کہہ دیا کہ 'آج حضور ﷺ ہمارے یہاں مہمان ہونے والے ہیں۔ میں بکری کا بچہ ذبح کر دیتا ہوں، تم جلدی سے کھانا تیار کرو۔' جب کھانا تیار ہوگیا تو آپ ﷺ کے پاس آئے۔ کھانے کی مقدار ہی کیا تھی، چپکے سے حضور ﷺ سے کہا کہ 'کھانا تیار ہے، دو چار آدمی جن کو آپ مناسب سمجھیں اپنے ساتھ لے لیں اور گھر چلیں۔' حضور ﷺ نے اعلان کر دیا کہ 'آج جابر کے یہاں سب کی دعوت ہے، سب لوگ چلے چلو۔' کل چودہ سو آدمی تھے، سب کے سب بھوکے تھے، سب کو خوشی ہوئی مگر حضرت جابر کی جان نکل گئی کہ یہ کیا ہوگیا؟ دو چار دس آدمیوں کا کھانا ہے اور چودہ سو لوگ شریک ہوں گے۔ کسی کو ایک لقمہ بھی ڈھنگ سے نہیں ملے گا۔ دوڑے ہوئے گھر گئے، بیوی کو

صورت حال بتائی۔ بیوی نے پوچھا کہ سب کو آپ نے دعوت دی ہے یا حضور ﷺ لا رہے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا حضور ﷺ لا رہے ہیں۔ وہ مومنہ بندی کہنے لگی کہ ’اگر حضور ﷺ لا رہے ہیں تو ہمیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔‘ حضور ﷺ تشریف لائے، آٹا گوندھا ہوا رکھا تھا۔ آپ نے اسے منگوایا اور لعاب دہن اس میں ڈال دیا، اور کہہ دیا کہ ’پورے مدینہ کی عورتوں کو بلا لاؤ۔‘ اس تھوڑے سے آٹے کو بنانے کے لیے پورے مدینہ کی عورتیں آگئیں۔ سالن میں بھی آپ ﷺ نے لعاب دہن ڈال دیا۔ کھانا تیار ہوگیا، اس تھوڑے سے کھانے کو چودہ سو آدمیوں نے مکمل سیر ہو کر کھایا، اور سارا کھانا ویسا کہ ویسا ہی بچا بھی رہا۔

برکت کا ایک اور واقعہ:

حضرت جابر ؓ کے ساتھ برکتوں کا واقعہ کئی مرتبہ پیش آیا۔ باپ کا انتقال ہوگیا۔ یہودیوں کے مقروض تھے۔ بھائی میں یہ اکیلے تھے۔ ساری ذمہ داری ان پر آرہی۔ ادھر یہودیوں نے قرض کا مطالبہ شروع کیا، انھوں نے سوچا کہ کھجور تیار ہو جائے تو ادا کردوں گا، مگر کھجور کی مقدار اتنی نہیں تھی کہ سارا قرض ادا ہو جائے۔ حضور ﷺ کے پاس آئے، سارا ماجرا کہہ سنایا، اور درخواست کہ آپ سفارش کردیں کہ ’کچھ اس سال لے لیں اور کچھ آئندہ سال لے لیں۔‘ حضور ﷺ سمجھ رہے تھے کہ یہودی ماننے والے نہیں ہیں۔ آپ ﷺ نے حضرت جابر ؓ سے کہہ دیا کہ ’میں تمھارے باغ میں آؤں گا۔‘ آپ ﷺ تشریف لے گئے اور کبھی اِس درخت کے پاس اور کبھی اُس درخت کے پاس کھڑے رہے۔ صدیق اکبر ؓ ساتھ تھے۔ فرمانے لگے کہ ’جابر! اب دیکھنا کیا ہوتا ہے؟‘ جب کھجور پک گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ’ہر قسم کی کھجور کو علاحدہ علاحدہ رکھ کر ڈھک دینا۔‘ جب یہ سب ہوگیا تو حضور ﷺ تشریف لائے اور سب سے چھوٹی ٹکڑی کے پاس بیٹھ گئے، اور سارے قرض خواہوں کا قرض ادا کرنا شروع کردیا۔ سب کا قرض ادا ہوگیا اور وہ حصہ جوں کا توں باقی رہا۔ (بخاری)

اللہ والوں کے یہاں ہر چیز میں برکت ہوتی ہے:

کھانے میں برکت کے سب قائل ہیں۔ اللہ والوں کے یہاں ہر چیز میں برکت ہے۔ تھوڑے وقت میں بہت سا کام کر لیتے ہیں جو عام آدمی کے بس کا نہیں ہوتا۔ ’کثرتِ عبادت بدعت یا عزیمت‘ ایک کتاب ہے، اس میں لکھا ہے کہ ایک صاحب دمشق کی جامع مسجد میں نماز پڑھنے آئے۔ جماعت میں ابھی وقت تھا، انھوں نے نیت باندھ لی اور اس تھوڑے وقت میں جو زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ رہا ہوگا، چوبیس پارہ پڑھ لیے۔ یہ سب اَنہونی بات نہیں ہے، حضور ﷺ کی برکت کی وجہ سے آپ کے متبعین کے یہاں کرامات کا وجود ہے جو معجزہ کی فرع ہے۔

قرآن ایک زندہ معجزہ:

غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ قرآن کریم اتنا وزنی کلام ہے کہ ہماری گنہگار زبان سے ادا نہ ہو سکے مگر اللہ نے اتنا آسان کر دیا ہے کہ بچہ بچہ آسانی سے پڑھ لیتا ہے۔ جون پور میں ایک حافظ رحمت اللہ صاحب تھے، وہ ایک بچے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ یہ بچہ اپنے استاذ کو پچیس دور سنا چکا ہے۔

جامعہ اسلامیہ بنارس میں ایک بار جلسہ ہو رہا تھا۔ حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی اور مولانا محمد یونس صاحب شیخ الحدیث سہارن پور تشریف لائے ہوئے تھے۔ میں بھی تھا۔ جن طلبہ نے حفظ قرآن کی تکمیل کی تھی ان کے سروں پر دستار باندھی گئی۔ اس میں ایک طالب علم تھا جو اسکول میں پڑھتا تھا۔ امتحان کے بعد اسکول میں چھٹی ہوئی تو اسے شوق ہوا کہ قرآن کریم حفظ کروں۔ وہ جامعہ اسلامیہ میں آنا شروع کر دیا، اور صرف ڈھائی مہینہ کے مختصر وقفہ میں پورا قرآن یاد کر لیا۔ یہ قرآن کا معجزہ ہے۔ میں نے اس موقع پر کہا بھی کہ ’کم مدت میں قرآن کا یاد کرنا بہت آسان ہے، مگر اسے یاد رکھنا بڑا مشکل ہے۔ اسے یاد بھی ہے یا نہیں؟‘ تو اساتذہ کہنے لگے کہ ’لوگ اس طالب علم سے بہت بھاگتے ہیں، ایک مجلس میں دس پارہ سے کم سناتا ہی نہیں۔‘ اس لیے

اس سے اساتذہ بھاگتے ہیں کہ سنانے بیٹھے گا تو رکنے کا نام نہیں لے گا۔ ہم سوچتے رہے کہ یا اللہ! تیری قدرت بھی کتنی عجیب ہے، ڈھائی مہینہ میں اتنا اچھا حافظ ہو گیا۔ یہ سب نبی کریم ﷺ کی برکت ہے جو چاہے امتحان کر کے دیکھ لے۔

شاہ عالم گیر اورنگزیب نے پچاس برس کے بعد قرآن حفظ کیا۔ حضرت نظام الدین اولیا نے چالیس مقامات یاد کر رکھے تھے۔ بڑھاپے میں کہنے لگے کہ ’کیا یاد کیا؟ اس سے نہ دین کا فائدہ اور نہ دنیا کا۔‘ اس کی تلافی میں قرآن پاک حفظ کرنا شروع کر دیا، اور پورا قرآن حفظ کر لیا۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ’نہ میں نے زندگی میں اتنا زبردست یاد کیا اور نہ اتنا زبردست بھولا۔‘ بہت بڑے محدث تھے۔ اتفاق سے ان کے گاؤں میں کوئی تراویح پڑھانے والا نہیں تھا۔ ماں نے طعنہ دیا کہ ’بڑے محدث بنے بیٹھے ہو، قرآن تو یاد نہیں ہے کہ تراویح پڑھا دو۔‘ بڑی غیرت آئی اور صرف تین دن میں پورا قرآن یاد کر لیا۔ ڈھائی مہینہ اور ایک مہینہ میں قرآن یاد کرنا تو ہے مگر انھوں نے صرف تین دن میں یاد کر لیا۔ یہ تھا ان کا یاد کرنا۔ اور بہت بڑی بھول یہ ہوئی کہ ان کی داڑھی گھنی نہیں تھی، صرف سامنے تھوڑی سی تھی۔ یہ جب بڑی ہو گئی تو ہوا میں اِدھر اُدھر لہرانے لگی، تو انھوں نے سوچا کہ ایک مشت کے نیچے کاٹ دوں۔ ہاتھ میں داڑھی پکڑی اور نیچے سے کاٹنے کے بجائے اوپر سے کاٹ دی۔ کہتے ہیں کہ ’مارے شرم کے مہینوں گھر سے باہر نہیں نکلا۔‘

قرآن کا یاد کرنا بھی ایک معجزہ ہے۔ اس کا حقیقی نور اگر ظاہر ہو جائے تو قلب انسانی برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ جس طرح وزنی پتھر پانی میں ڈالنے کے بعد ہلکا ہو جاتا ہے، اسی طرح اس دنیا میں قرآن کو ہلکا کر دیا گیا ہے۔ آنکھ بند ہونے کے بعد اس کا وزن ظاہر ہو جائے گا۔ اتنا وزن ہوگا کہ پوچھیے مت، بلکہ دنیا میں بھی جو لوگ قرآن پر صحیح عمل کرتے ہیں وہ اس دنیا میں بھی بہت وزن رکھتے ہیں، اور آخرت میں تو ان کے وزن کا پوچھنا ہی کیا۔

حفاظ کے لیے بشارت:

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "مَنْ قَرَأَ حَرْفاً مِنْ کِتَابِ اللّٰہِ فَلَه بِه حَسَنَةٌ وَ الْحَسَنَةُ بِعَشَرِ اَمْثَالِهَا۔ لَا اَقُوْلُ الم حَرْفٌ وَلٰكِنْ اَلِفٌ حَرْفٌ وَلَامٌ حَرْفٌ وَمِيْمٌ حَرْفٌ" (رواہ الترمذی عن ابن مسعود) جس نے کتاب اللہ کا ایک حرف پڑھا اسے اس کے بدلے ایک نیکی ملے گی، اور ایک نیکی دس گنا بڑھا دی جائے گی۔ میں نہیں کہتا کہ "الم" ایک حرف ہے۔ بلکہ 'الف' ایک حرف ہے، اور 'لام' ایک حرف ہے، اور 'میم' ایک حرف ہے۔

قرآن کے ہر حرف کے بدلے ایک نیکی ہے۔ اور آپ نے مثال دی کہ 'الم' میں تین حرف ہیں، تو تین نیکی ہوئی۔ اور ہر نیکی دس نیکی کے برابر۔ تو صرف 'الم' پر تیس نیکی ہوئی جس کا معنی کوئی نہیں جانتا۔ بغیر جانے پڑھے تو یہ حال ہے، اور اگر پوری معرفت کے ساتھ جان کر پڑھے تو ثواب اتنا ہی بڑھتا رہے گا۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ قرآن کے حافظوں سے کہا جائے گا کہ 'پڑھتا جا اور چڑھتا جا' ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ "أَیُّ الْعَمَلِ اَحَبَّ اِلَى اللّٰهِ؟" کون سا عمل اللہ کو زیادہ پسند ہے؟ تو آپ نے فرمایا: "اَلْحَالُّ الْمُرْتَحِلُ"۔ پھر سوال ہوا "مَا الْحَالُّ الْمُرْتَحِلُ؟" الحال (اترنے والا) المرتحل (کوچ کرنے والا) سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا کہ: اَلَّذِیْ یَضْرِبُ مِنْ اَوَّلِ الْقُرْآنِ اِلٰى آخِرِهِ، كُلَّمَا حَلَّ اِرْتَحَلَ" (رواہ الترمذی) جو قرآن شروع سے آخر تک پڑھتا ہے۔ جب بھی وہ اترتا ہے تو کوچ کر دیتا ہے۔

بہترین مسافر وہ ہے جو منزل پر رکے نہیں، پھر چل پڑے۔ محدثین فرماتے ہیں کہ 'اس حدیث کا مصداق حافظِ قرآن ہے۔ جب وہ 'والناس' پر پہنچتا ہے تو شیطان کو بڑی خوشی ہوتی ہے، مگر وہ پھر سورہ فاتحہ شروع کر دیتا ہے تو شیطان مایوس ہو جاتا ہے۔ دنیا میں صاحبِ قرآن کا یہی معمول ہے کہ 'والناس' پر قرآن ختم کرے اور پھر سورہ فاتحہ

شروع کر دے۔ اگر یہی چیز آخرت میں ہو جائے کہ ' والناس ' پر ختم کرے پھر شروع کرے پھر ختم کرے پھر شروع کرے تو بھلا بتائیے کہ اس کے درجات کا کوئی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

خدا کی رحمت بے حد وحساب ہے:

ایک بار دربار رسالت میں سیدنا عمر فاروق ؓ موجود تھے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ 'سبحان اللہ' اور 'الحمد للہ' جنت کے درخت ہیں، جتنا چاہو لگاؤ۔' تو انھوں نے عرض کیا کہ 'ہم تو بہت لگالیں گے۔' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ 'اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے۔ جتنا چاہو لگالو، وہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔'

جنت میں جمعہ کے دن بازار لگے گا۔ سب سے خوبصورت شکل جمعہ کے دن کی ہوگی۔ اس دن لوگوں سے کہا جائے کہ جو چاہو مانگو، سب کچھ ملے گا۔ بندہ سوال کرے گا، عجیب عجیب نعمتیں ملیں گی جس کے بارے میں بندہ تصور تک نہیں کر سکتا۔ ہر ایک کی ساری ضروریات پوری کر دی جائیں گی۔ پھر کہا جائے گا اور چاہو، بندہ اور چاہے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ 'اگر بندہ کھیتی کرنا چاہتا ہے تو اسے کھیتی دیدی جائے گی۔' غرض جس کی جو چاہت ہوگی پوری کر دی جائے گی۔ (مشکوۃ شریف)

ایک مولانا نے یہی باتیں ایک بار کہیں کہ 'جنت میں سب کچھ ملے گا۔' تو کسی دیہاتی نے کہا کہ 'وہاں حقہ بھی ملے گا؟' کہنے لگے کہ 'ملے گا تو، مگر اسے جلانے کے لیے جہنم میں جانا پڑے گا۔' خیر، بندہ کی ساری ضروریات وخواہشات پوری کر دی جائیں گی، کسی کی کوئی خواہش باقی نہیں رہے گی تو حکم ہوگا کہ "وَلَدَیْنَا مَزِیْدٌ" (سورة ق آية ۳۵) ابھی ہمارے پاس اور بھی بہت کچھ ہے۔ اس کے بعد اللہ کا دیدار ہوگا۔ یہ اتنی بڑی نعمت ہوگی کہ لوگ اس میں ایسے محو ہو جائیں گے کہ ساری چیزیں فراموش ہو جائیں گی۔

اللہ کے یہاں کمی نہیں ہے۔ وہاں صاحب قرآن کی قدر کی جائے گی۔ وہ مستقل پڑھتا ہوا چڑھتا رہے گا۔ اسی لیے اس عظیم نعمت کی قدر دنیا میں بھی کرنی چاہیے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے اس دل کو ویران گھر سے تعبیر کیا ہے جس میں قرآن کا کوئی حصہ موجود نہ ہو: ”اِنَّ الَّـذِیْ لَیْـسَ فِـیْ جَـوْفِـه شِـئیٌ مِنَ الْقُرْآنِ كَالْبَیْتِ الْخَرِبِ“ (ترمذی) وہ شخص جس کے دل میں قرآن کا کچھ حصہ نہ ہو، وہ ویران گھر کی طرح ہے۔

قرآن کو سہل اور عام کر دیا گیا ہے:

اسی لیے اللہ نے ایسا انتظام کیا ہے کہ کوئی بھی اس نعمت سے محروم نہ رہے۔ جو نعمت جتنی بڑی ہوتی ہے اسے اتنا ہی عام کر دیا جاتا ہے۔ قرآن کی دولت بہت بڑی ہے، اس لیے اسے بہت زیادہ عام کر دیا گیا۔ اگر آپ کو یاد ہے تو پڑھیے، نہیں تو جماعت کی نماز میں امام سے قرآن کی تلاوت سنیے۔ امام قرآن پڑھے گا ہی، جو جہری نماز میں ہیں وہ تو ہیں ہی، جو سری نماز میں ہیں اس میں بھی امام کا پڑھنا مقتدی کے کھاتے میں جاتا ہے۔ کوئی مقتدی قرأت سے خالی نہیں ہے۔ ”مَنْ كَانَ لَهٗ اِمَامٌ فُقِرَاءَ ةُ الْاِمَامِ لَهٗ قِرَاءَ ةٌ“ (ابن ماجه) امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہوتی ہے۔ اب کوئی بھی مقتدی قرأت سے خالی نہیں رہتا۔ پڑھتا ہے صرف امام، مگر یہ مقتدیوں کے حساب میں بھی لکھا جاتا ہے۔

ایک محسوس مثال:

ایک مرتبہ کسی بادشاہ کے یہاں روم اور چین کے بڑے بڑے صنعت کاروں میں اختلاف ہو گیا۔ دونوں کا دعوی تھا کہ ہم بڑے صناع ہیں۔ بادشاہ نے کہا کہ صرف دعوی سے کام نہیں چلے گا، دونوں اپنی اپنی صنعت دکھلاؤ تب فیصلہ ہو سکے گا۔ ایک بڑا ہال دونوں کو دیدیا اور بیچ میں پردہ ڈال دیا، اور کہہ دیا کہ ایک طرف رومی اپنی صنعت کاری کا مظاہرہ کریں، اور دوسری طرف چینی۔ دونوں نے خوب محنت کی۔ آخر کار دونوں کی صنعت تیار ہو گئی۔ بادشاہ کو اطلاع کی گئی۔ جب بادشاہ نے بیچ کا پردہ ہٹایا تو عجیب و غریب منظر سامنے نظر آیا، جو بادشاہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ دونوں طرف ایک ہی طرح کا نقشہ تھا، کسی طرح کا کوئی فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ ایک فرق تھا کہ ایک میں چمک زیادہ تھی اور دوسرے میں چمک نہیں تھی۔ بادشاہ حیران ہوا تو چینیوں نے کہا کہ

‘بادشاہ سلامت حیران نہ ہوں، وہ لوگ تو نقش ونگار کرتے رہے۔ ہم نے دیوار کو صیقل کرنا شروع کیا اور اسے آئینہ کی طرح بنا دیا۔ اس طرح اس دیواری آئینہ میں اُدھر کا سارا منظر اِدھر آ گیا۔

یہی حال مقتدیوں کا نماز میں ہوتا ہے۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ اپنے قلب کو خاموشی سے صاف کرتا رہے، امام کی ساری قرأت اس پر نقش ہو جائے گی۔

جیسا امام ہوگا ویسی نماز ہوگی:

غرض یہ اتنی بڑی دولت ہے کہ اللہ نے کسی کو اس سے محروم نہیں کیا، ایک انتظام پنج وقتہ نمازوں میں کر دیا گیا، دوسرا انتظام تراویح میں کیا گیا۔ اللہ نے اپنی مہربانی سے اس دولت میں کوئی بخل نہیں کیا، سب کو دیا۔ پڑھے گا امام، اور یہ نقش ہوگا مقتدیوں کے قلب پر۔ اسی لیے امام جتنا زبردست ہوگا مقتدیوں کی قرأت بھی ویسی ہی ہوگی۔ امام کو اسی لیے سب سے بہتر ہونا چاہیے۔ صحابہ کرام اس کا اہتمام کرتے تھے کہ حضور ﷺ کے پیچھے ہی نماز پڑھا کریں، آپ کے رہتے ہوئے کوئی دوسرا نماز نہیں پڑھا سکتا تھا۔ ایک بار حضرت عبدالرحمان بن عوف ؓ نے نماز پڑھائی۔ جب آپ تشریف لائے تو یہ پیچھے ہٹنے لگے، مگر آپ ﷺ نے منع فرما دیا۔ اسی طرح آخری وقت میں صدیق اکبر ؓ نے امامت کی۔ یہ دو تین واقعات ہیں جب دوسروں نے امامت کی ہے۔ باقی ہمیشہ حضور ﷺ نے نماز پڑھائی ہے، اور صحابہ کرام کو آپ کے پیچھے نماز پڑھنے کا خاص اہتمام تھا۔ اس لیے کہ امام جتنا زبردست ہوتا ہے مقتدیوں کی نماز بھی ویسی ہی ہوتی ہے۔

ہمارے علاقے میں ایک بزرگ تھے، مولانا..... نصیر آبادی۔ لوگوں نے مشاہدہ کیا ہے کہ ان کے پیچھے نماز پڑھنے والے دور سے پہچانے جاتے تھے۔ دیکھ کر یہ احساس ہو جاتا تھا کہ ’یہ صاحب مولانا کے پیچھے نماز پڑھ کر آئے ہیں‘۔

امامت کا منصب بہت بڑا ہے، اول رحمتِ خداوندی اسی پر اترتی ہے، پھر دوسروں کی طرف منتقل ہوتی ہے۔

قرآن سے کسی کو محروم نہیں کیا گیا ہے:

قرأت قرآن بہت بڑی دولت تھی، لوگ ہر طرح کے ہوں گے۔ اللہ نے نہیں چاہا کہ کوئی اس سے محروم رہے۔ اس لیے ایسا انتظام کر دیا۔ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اسے اتنا زیادہ عام کر دیا ہے کہ زبان سے بے اختیار نکلتا ہے کہ ’خدایا! تیری رحمت کتنی وسیع ہے، جو کسی کو بھی محروم دیکھنا پسند نہیں کرتی‘ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں ایک بار لوگ قرآن پڑھ رہے تھے۔ ہر ایک کے حروف کی ادائیگی میں فرق ہو رہا تھا۔ کوئی ’ح‘ کو ’ع‘ کی طرح ادا کر رہا تھا تو کوئی کسی حرف کو دوسرے حرف کی طرح پڑھ رہا تھا۔ کوئی کسی انداز سے تو کوئی کسی انداز میں۔ حضور ﷺ دیکھ کر مسکرانے لگے، اور فرمایا کہ ’پڑھتے رہو‘ پھر اللہ سے دعا کہ ’اے اللہ! ہماری امت میں ہر طرح کے لوگ ہیں، انھیں تو قبول فرما‘ دعا قبول ہوئی اور سات حرفوں میں قرأت کی اجازت ہوگئی۔ اتنا عام کیا گیا ہے اس قرآن کو۔ اس کا پڑھنا ثواب، اس کا دیکھنا ثواب، سننا ثواب، اس سے عقیدت رکھنا ثواب۔ کسی بھی چیز کا کسی بھی عنوان سے قرآن سے تعلق ہو تو وہ سب باعثِ ثواب، اس کے ساتھ اللہ کا معاملہ ہی کچھ ایسا ہے، جو دوسری عبادتوں کے ساتھ نہیں ہے۔

قرآن ایک زندہ معجزہ:

ایک صاحب نے قرآن لکھا اور جتنے لوگ قرآن کے جاننے والے ملتے گئے سب سے اس کی تصحیح کرائی کہ کہیں کسی طرح کی کوئی غلطی تو نہیں رہ گئی ہے۔ سب نے ان کی تصدیق کر دی۔ پھر سوچا کہ آخری بار کسی جید حافظ کو دکھا لینا چاہیے۔ لوگوں نے بتلایا کہ پانی پت میں ایک حافظ محمد قاسم صاحب ہیں، وہ جید حافظ ہیں، ان کے پاس جاؤ۔ وہاں گئے تو عجیب وغریب معاملہ دیکھا۔ یہ صاحب نابینا تھے، قرآن کی تصحیح کیسے کرتے؟ مگر خیر جب یہ آ گئے تھے تو ان سے کہا کہ ’میں نے نو سال میں قرآن کی کتابت کی ہے۔ کئی لوگوں کو دکھایا ہے، چاہتا ہوں کہ آپ بھی دیکھ لیں، تا کہ کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ لوگوں نے آپ کے پاس بھیجا ہے، مگر آپ تو نابینا ہیں، قرآن دیکھیں گے کیسے؟

ایسا ہے کہ میں آپ کو قرآن پڑھ کر سناتا ہوں، آپ سن لیں۔ انھوں نے فرمایا کہ ’نہیں، تم حافظ ہو، پڑھو گے تو صحیح پڑھو گے، اور لکھا ہوگا غلط، اس طرح غلطی رہ جائے گی۔ غلطی تو زیادہ سے زیادہ زیر زبر کی ہوگی۔ اس لیے ایسا کرتے ہیں کہ میں ترتیب سے صرف زیر زبر پیش بولتا رہوں گا، حروف کہیں نہیں پڑھوں گا۔ تم یہ دیکھو کہ جو میں بول رہا ہوں، اس کے اعتبار سے صحیح ہے کہ نہیں؟‘ اور اس طرح اس اللہ کے بندے نے پورے قرآن کے صرف حرکات ترتیب سے سنا دیے۔ یہ کہتے ہیں کہ میں حیرت زدہ رہ گیا کہ ایسے لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں، جنھیں صرف قرآن کے حروف ہی نہیں حرکات وسکنات بھی ازبر ہیں، اور پورے قرآن کے حرکات وسکنات کو اس طرح سنا دیں گے جیسے آدمی قرآن سناتا ہے۔ یہ ہے وہ قرآن جسے اللہ نے اتنا آسان کر کے اتارا ہے۔

بہار میں ’سمرا‘ میں ایک مدرسہ چلتا ہے، اس کے بانی حافظ بادشاہ تھے۔ نابینا تھے، زبردست حافظ تھے۔ ایک بار انھوں نے اپنے ابا سے پوچھا کہ ’آپ کو قرآن کیسا یاد ہے؟‘ انھوں نے کہا کہ ’جس طرح لوگوں کو سورہ فاتحہ یاد ہوتی ہے، ویسا ہی مجھے قرآن یاد ہے۔‘ پھر انھوں نے بیٹے سے پوچھا کہ ’تمھیں کیسا یاد ہے؟‘ تو یہ کہتے ہیں کہ ’بسم اللہ کی طرح۔‘ جس طرح آدمی بسم اللہ میں کسی طرح کی غلطی نہیں کر سکتا، چاہے سو کر پڑھے یا جاگ کر پڑھے، خیال سے پڑھے یا بے خیالی میں پڑھے، ایسا ہی انھیں قرآن یاد تھا۔

قرآن کے نزول کے وقت اس کی حفاظت:

یہ عجیب وغریب دولت ہے۔ اسی لیے سب سے اہم عبادت نماز میں اسے لازم کر دیا گیا تاکہ کوئی ایمان والا اس سے محروم نہ رہے۔ اگر کوئی نماز ہی نہ پڑھے تو یہ اس کی بدنصیبی ہے۔ یہ اللہ کا سب محبوب کلام ہے۔ اس اہتمام سے اسے اتارا گیا کہ شیطانی آمیزش اس میں نہ ہو سکے۔ مکمل ۲۳/ سال میں یہ قرآن نازل ہوا ہے۔ اس لمبی مدت میں اتنا زبردست پہرا لگا رہا کہ جنات کہنے لگے۔ ”وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنَاهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَشُهُبًا“ (سورة الجن آية ۸) اور ہم نے آسمان کو ٹٹول کر دیکھا تو

اسے سخت چوکیداروں اور سخت شعلوں پر پایا۔

تنہا جبریل علیہ السلام اس کی حفاظت کے لیے کافی تھے مگران کے ساتھ حفاظت کے لیے فرشتوں کا ایک جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ سورہ اَنعام یک بارگی نازل ہوئی تو ستر ہزار فرشتے تسبیح کرتے ہوئے اس کی حفاظت کرتے آئے تھے۔

جس کی اتنی حفاظت کی جائے، سینہ نبوی ﷺ میں محفوظ کرنے کے لیے اتنا اہتمام کیا جائے کہ جب نازل ہوتا تو حضور ﷺ جلدی جلدی یاد کرنے لگتے کہ کہیں کچھ رہ نہ جائے۔ تو آیت نازل ہوئی ” لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِه “(سورة القيامة آية ۱۶) (اے نبی!) آپ قرآن کو جلدی (یاد کرنے) کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔

جس قرآن کی حفاظت کا اتنا اہتمام کیا جائے، وہ کیسے نہیں محفوظ رہے گا! یہی وجہ ہے کہ قرآن آج بھی ویسا ہی محفوظ ہے، اس کا لب ولہجہ، اس کی قرأت، رسم الخط، اس کی ایک ایک چیز محفوظ کر دی گئی۔ حضرت عثمان ؓ نے جیسا جمع کر دیا بالکل ویسا ہی باقی رہے گا۔ جہاں ’الف‘ ہے تو ہے۔ الف لکھا جائے گا، پڑھا نہیں جائے گا، تو ویسا ہی محفوظ ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز جتنی قیمتی ہوگی اس کی حفاظت اتنی ہی زبردست ہوگی۔

قاریانِ خوش الحان:

تم سب کچھ جانتے ہو مگر قرآن نہیں جانتے تو سب بے کار ہے، اور اگر کچھ نہیں جانتے، صرف قرآن جانتے ہو تو سب کچھ جان گئے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ’جس نے قرآن پڑھا اور اس سے بہتر کوئی چیز تلاش کی تو اس نے قرآن کی ناقدری کی۔‘ حضور ﷺ کا معمول فجر کے بعد ٹہلنے کا تھا۔ ایک بار مولا سالم کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا تو فرمایا کہ ’اللہ کا شکر ہے کہ جس نے میری امت میں ایسے لوگوں کو پیدا فرمایا جو اتنا اچھا قرآن پڑھتے ہیں۔‘ حضرت ابوموسی اشعری ؓ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ ’تم کو تو آل داؤد کی راگ عطا کی گئی ہے۔ جب وہ زبور پڑھتے تھے تو سارا عالم محو ہو جاتا تھا۔‘

اللہ جانے صحیح ہے یا غلط! ہم نے اپنے بچپن میں سنا تھا کہ ایک حافظ صاحب بڑا

اچھا قرآن پڑھتے تھے مگر حماقت یہ کرتے تھے کہ جب گاؤں میں گانا گانے والے آتے تو وہ بھی سننے چلے جاتے۔ ایک بار کوئی گانے والی آئی، یہ بھی پہنچے۔ گانا شروع ہوا، اور گانے والی بار بار گاتے گاتے ان کی طرف اشارہ کرتی۔ انھیں بڑی غیرت آئی۔ خود بھی وضو کیا اور دوسروں کو بھی وضو کرایا، اور بیٹھ گئے قرآن پڑھنے۔ ایسا زبردست پڑھا کہ بادل آگئے، گھنگھور گھٹا چھا گئی۔ سب کی حالت غیر ہوگئی مگر کسی کو اٹھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ بالآخر ہر ایک نے گانے بجانے سے توبہ کی۔

ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ ایک قاری لالہ صاحب تھے۔ لعل محمد نام تھا، قاری لالہ کے نام سے مشہور تھے۔ ایک بار وہ پانی پت گئے۔ ایک حافظ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اِن سے درخواست کی کہ ’آپ قرآن سنا سکتے ہیں؟‘ اِنھوں نے کہا ’ہاں‘ اور سنانا شروع کر دیا۔ جب سنا چکے تو اُنھوں نے کہا کہ ’آپ قاری لالہ صاحب معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ اتنا عمدہ قرآن پڑھنے والا اس وقت صرف وہی ہیں۔‘ بڑا عمدہ قرآن پڑھتے تھے۔ پھر قاری لالہ صاحب نے کہا کہ ’آپ بھی کچھ سنائیں۔‘ انھوں نے سنانا شروع کیا تو قاری لالہ صاحب بھی مات کھا گئے۔ اتنا عمدہ قرآن پڑھا کہ بس پوچھیے مت! سامنے ایک گھڑا رکھا ہوا تھا، اس پر کچھ سامان تھا۔ دھیرے دھیرے ایک ایک سامان اوپر کو جانے لگا، پھر گھڑا بھی اوپر اٹھنے لگا، پھر اسی طرح باری باری سب نیچے آئے۔ یہ اثر تھا قرآن کریم کی تلاوت کا۔ پاکستان والوں نے ڈائجسٹ کا قرآن نمبر نکالا ہے بارہ تیرہ جلدوں میں۔ ایک جلد میں اسی طرح کے قرآن سے متعلق واقعات موجود ہیں۔

قرآن ایک بیش بہا دولت:

الغرض، یہ بہت بڑی دولت ہے، اللہ تعالی اس کے ذریعے بہت نوازتے ہیں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ حضرت ابوسعید خذری ؓ سے مروی ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اِنَّ اللّٰہَ تَعَالیٰ یَقُوۡلُ: مَنۡ شَغَلَہٗ الۡقُرۡآنُ عَنۡ ذِکۡرِیۡ وَمَسۡئَلَتِیۡ أَعۡطَیۡتُہٗ اَفۡضَلُ مَا أَعۡطیٰ السَّائِلِیۡنَ“ (ترمذی) جس کو قرآن نے

میرے ذکر اور مجھ سے سوال کرنے سے مشغول رکھا، میں اسے مانگنے والوں سے افضل عطا کرتا ہوں۔ اور سنیے دنیا کی ہر چیز مخلوق ہے مگر یہ قرآن مخلوق نہیں ہے۔ یہ خاص اللہ کی صفت ہے، جو اللہ نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔ یہ اتنی بڑی دولت ہے۔ اگر ہم اس کی قدر نہ کریں تو اس کو ہماری بدنصیبی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک آدمی آیا اور کہنے لگا کہ ’مجھے کوئی ایسا کام دیجیے جو ذریعۂ معاش ہو سکے۔‘ آپ نے پوچھا کہ ’قرآن پڑھنا جانتے ہو؟‘ اس نے کہا ’نہیں‘۔ آپ نے فرمایا کہ ’تب نہیں دیں گے۔ پہلے قرآن پڑھنا سیکھو، اس کے بعد میرے پاس آنا۔‘ وہ چلا گیا پھر واپس نہیں آیا۔ ایک عرصے کے بعد اس سے ملاقات ہوئی، خیریت دریافت کی اور اس سے پوچھا کہ ’تم کیوں نہیں آئے؟‘ تو وہ کہنے لگا کہ ’میں نے قرآن پڑھا تو اس میں مجھے کام مل گیا۔ ایک آیت پڑھی ”مَن یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجعَل لَّہٗ مَخُرَجاً“ (سورۃ الطلاق آیۃ ۲) جو شخص اللہ کا تقوی اختیار کرتا ہے اللہ اس کے لیے راستے کھول دیتا ہے۔ تو میں نے تقوی اختیار کرلیا، اب مجھے روزی مل رہی ہے۔

تعلیمِ قرآن کی برکت:

ماضی قریب میں ایک بزرگ گزرے ہیں، مولانا نعیم صاحب فرنگی محلی۔ جب نئے نئے پڑھ کر آئے تھے تو ایک انگریز سے کہا کہ ’ہمیں کوئی کام دیجیے، ہم ملازمت کریں گے۔‘ انگریز کہنے لگا ’لیکن مولانا آپ عالمِ دین ہیں، آپ کے لیے زیبا نہیں دیتا کہ آپ ہماری ملازمت اختیار کریں۔ آپ تو کہیں مسجد میں بیٹھیں، بچوں کو دینی تعلیم دیں۔ آپ کو اللہ بہت دیں گے۔‘ مولانا نے کہا ’ہاں واقعی صحیح بات ہے، میں ایسا ہی کروں گا۔ اب کسی سے ملازمت نہیں مانگوں گا۔‘ جب مولانا جانے لگے تو انگریز نے کہا کہ ’تھوڑی دیر رکیے۔‘ پھر اندر گیا اور ایک طشت میں روپیہ بھر کر لایا، اور مولانا کی خدمت میں پیش کیا۔ مولانا نے لینے سے انکار کردیا اور للہ فی اللہ قرآن پڑھانا شروع کردیا۔ پھر تو اللہ نے انہیں بہت نوازا۔ حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ ’انھوں نے عزیمت پر عمل کیا، ہم رہتے تو لے

لیتے اور سمجھتے کہ یہ پہلی برکت شروع ہوگئی۔

ضرورت عمل کی ہے:

صاحبو! اللہ تعالی صاحبِ قرآن کو ضایع نہیں فرماتے۔ آپ نے قرآن کی عظمت سن لی، اب روزانہ ایک ہی صفحہ سہی، قرآن کی تلاوت کا اہتمام کریں۔ اگر خود نہیں پڑھ سکتے تو اپنے بچوں سے پڑھوا کر سنیں۔ بچپن میں والد صاحب نے بخاری شریف کا ترجمہ منگوایا۔ مجھے پڑھنے کا جنون تھا۔ دادا نے حکم دیا کہ 'اسے پڑھ کر مجھے سنایا کرو' روزانہ خود بھی وضو کرتے اور مجھے بھی وضو کراتے، اور اہتمام سے پورے ادب کے ساتھ بیٹھ کر سنتے۔ اس طرح پوری بخاری شریف کا ترجمہ بچپن میں میں نے انہیں پڑھ کر سنایا۔ جب میں نے خود بخاری شریف پڑھی تو سمجھ میں آیا کہ انھیں کی دعاؤں کا صدقہ ہے۔ تو جو لوگ نہیں پڑھ سکتے وہ اپنے بچوں سے سن لیا کریں، اس کی بہت برکت ہوتی ہے۔ جتنا اللہ قرآن سے خوش ہوتے ہیں، اتنا کسی اور چیز سے نہیں خوش ہوتے۔

اللہ تعالی ہم سب کو اس کی توفیق بخشے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین

* * *

ملت کے نوجوانوں سے خطاب

مسلمان نوجوانو! ایک شخص جو نوجوانی اور جوانی کے مرحلوں کو گزار کر بڑھاپے کی حد میں داخل ہو چکا، کاغذ کے ان صفحات پر تم سے کچھ خطاب کرنا چاہتا ہے۔ اس کا بوڑھا دل بے قرار ہے، کمزور ہڈیاں درد سے بے تاب ہیں۔ وقت کی گردش نے تجربات کی بھٹی میں خوب پکایا ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ تم سے کچھ باتیں جن کا تعلق اس کے نفع نقصان سے نہیں، خود تمھارے نفع اور نقصان سے ہے۔ اور وہ بات اس کی نہ ہوگی، اس کی کیا حیثیت کہ وہ ملت کے قیمتی سرمایہ میں تصرف کرے، وہ باتیں تمھارے اور ساری کائنات کے خالق و مالک کی ہوں گی، جوان کے برگزیدہ پیغمبر جو ہمارے، تمھارے سب سے بڑے مرکز اطاعت ومحبت ہیں بلکہ مرکز ایمان ہیں، اور جن کے تعلق سے بڑھ کر ہمارے پاس کوئی سرمایہ نہیں۔ ان کے لیے ہر سرمایہ، ہر عزت ومرتبہ، ہر دولت وحکومت قربان! خاندان بھی، خویش واقارب بھی، بلکہ دل وجان بھی! سب ان کی بارگاہ میں نذر! جن کی صداقت وحقانیت میں نہ کسی دوست نے شبہ کیا اور نہ کسی دشمن نے! دنیا ادھر سے ادھر ہو سکتی ہے مگر ان کے قول وعمل کی سچائی پر آنچ نہیں آسکتی۔ ہر زمانے میں ملت اسلامیہ کو جو سر بلندی حاصل ہوئی ہے، انھیں کی نسبت کی برکت سے ہوئی ہے، اور جو انحطاط وزوال آیا، اسی تعلق ونسبت کے ضعف واضمحلال سے آیا ہے۔ یہ بات بالکل حق ہے، اسی طرح حق ہے جیسے تمھارا نوجوان ہونا حق ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر!

حق کی باتیں، دنیا بھر کے انھیں سب سے سچے بزرگ نے دنیا کو سنائی۔ تم اللہ کو بھی مانتے ہو، ان کے سچے رسول کو بھی مانتے ہو۔ دونوں پر پختہ ایمان رکھتے ہو، تو کیا ایسا

نہ ہوگا کہ ان کی باتیں تمھارے قلب کی گہرائیوں میں اتر کر تمھارے دماغ، تمھارے کردار واعمال کو مسخر کرلیں! بے شک ایسا ہی ہوگا۔

پھر تم سے کہتا ہوں کہ ایک لمحہ ٹھہر کر اپنے دل ودماغ، اپنے فکروخیال کا جائزہ لو، اپنے مقاصد، اپنی خواہشوں اور اپنے میلانات کو دیکھو، پھر اپنے سب سے بڑے مرکز محبت واطاعت کی باتیں سنو! اور دونوں کا موازنہ کرو کہ ان کے ارشاد اوران کے احکام سے کوئی مناسبت پاتے ہو؟ اگر پاتے ہوتو اس عظیم نعمت پر اللہ کا بہت شکر ادا کرو۔ اور اگر نہ پاؤ تو ذرا فکر کرو اور سنجیدگی سے غور کرو۔ بس اس ایک بات کو اپنے دل میں اچھی طرح جماؤ، اگر معتبر ہے تو انھیں کی بات، اگر قابلِ یقین ہے تو انھیں کا کلام، اگر مستحقِ اطاعت ہے تو انھیں کا فرمان۔ ان سے الگ نہ کسی کی بات معتبر، نہ کسی کا کلام لائقِ یقین اور نہ کس کا حکم قابلِ اطاعت!

اب سنو! انھیں سب سے سچے بزرگ، اللہ کے آخری نمائندے سیّدنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا ایک فرمان سناتا ہوں۔ اسے آپ ﷺ سے براہ راست سننے والے اور ہم سے بیان کرنے والے مشہور برگزیدہ صحابی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ امام بخاری علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب میں اسے کم ازکم چار جگہ درج کیا ہے۔ میں اس حدیث کو تمھیں سناتا ہوں:

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: سَبْعَةٌ یُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِی ظِلَّةِ یَوْمَ لَاظِلَّ اِلَّا ظِلَّه اَلْاِمَامُ الْعَادِلُ وَشَأبٌّ نَشَأَ فِی عِبَادَةِ رَبِّهٖ وَرَجُلٌ قَلْبُهٗ مُعَلّقٌ فِی الْمَسَاجِدِ وَرَجُلَانِ تَحَابَّافِی اللّٰهِ اِجْتَمَعَا عَلَیْهِ وَتَفَرَّقَا عَلَیْهِ وَرَجُلٌ طَلَبَتْهُ اُمْرَأَةٌ ذَاتُ مَنْصَبٍ وَجَمَالٍ فَقَالَ: اِنِّی اَخَافُ اللّٰهَ وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ أَخْفٰی حَتّٰی لَاتَعْلَمُ شِمَالُه مَاتُنْفِقُ یَمِیْنُه وَرَجُلٌ ذَکَرَ اللّٰهُ خَالِیاً فَفَاضَتْ عَیْنَاهُ۔ (حدیث: ۶۶۰، ۱۴۲۳، ۶۴۷۹، ۶۸۰۱)

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سات آدمیوں کو اللہ تعالیٰ اپنے خاص سائے میں پناہ دیں گے، اس روز جب کہ اللہ کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا۔ (۱)

انصاف ور حاکم (۲) وہ جوان جس کی نشو ونما اس کے رب کی عبادت میں ہوئی ہو (۳) وہ آدمی جس کا دل مسجدوں میں اٹکا ہوا ہو (۴) وہ دو آدمی جنھیں آپس میں محض اللہ کے لیے محبت ہو۔ اسی محبت کے ساتھ دونوں ملیں اور اسی پر دونوں الگ ہوں (۵) وہ آدمی جسے کوئی خوبصورت اور صاحبِ منصب عورت نے چاہا، مگر وہ یہ کہہ کر ہٹ جائے کہ مجھے اللہ کا خوف ہے (۶) وہ آدمی جس نے اس پوشیدہ طور پر صدقہ کیا کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہوسکی کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے (۷) وہ آدمی جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا، اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

ملت اسلامیہ کے نوجوانو! رسول اکرم ﷺ کے فدائیو! دین اسلام کے شیدائیو! ذرا اس فرمان کو غور سے پڑھو اور دیکھو کہ اس میں تمھارا کتنا حصہ ہے؟

عرشِ الٰہی کے سایہ میں جگہ پانے والوں میں ایک نام تو خاص اس گروہ کا ہے جس سے تمھارا تعلق ہے۔ یعنی شَابٌّ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ رَبِّهٖ وہ جوان جس کی نشو ونما ہی اس کے رب کی عبادت وبندگی کی مشغولیت میں ہوئی۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے، خواہشوں کا طوفان اس میں اٹھتا رہتا ہے، ہر لذت پر نوجوانی ٹوٹ کر گرتی ہے، پوری دنیا رنگین دکھائی دیتی ہے، رگوں میں گرم گرم خون دوڑتا ہے تو آدمی کو آوارگی کی راہیں ہر طرف کھلی دکھائی دیتی ہیں، اور کھیل کود کی طرف طبیعت لپکتی ہے۔ ہر بظاہر خوبصورت چیز پر دل مچلتا ہے، لہو ولعب میں رات آنکھوں میں کٹ جاتی ہے اور پتہ نہیں چلتا۔ نفس کی ہر لذت پر ایسی دیوانگی ہوتی ہے کہ ماضی ومستقبل سب سے آدمی کٹ کر رہ جاتا ہے۔ طاقت کا نشہ چھاتا ہے تو ظلم وستم کا ہر کام اپنی ضرورت بن جاتا ہے۔ دولت ہاتھ آتی ہے تو نہ جانے کتنے لوگوں کے حقوق پامال ہوجاتے ہیں۔ واقعی نظر بظاہر جوانی دیوانی ہوتی ہے۔

لیکن وہ جوان کتنا مبارک ہے، اللہ کی نگاہ میں کتنا پیارا ہے، رسول اللہ ﷺ کی آنکھوں کا کیسا تارا ہے، جس کی جوانی کی قوت کام آتی ہے تو اس کے پروردگار کی بندگی میں! وہ بھی لذت کا جویا ہے، مگر اپنے مالک کی رضا جوئی میں! اس کے سامنے بھی عمل کی

ہر راہ کھلی ہوتی ہے، مگر وہ اس راہ پر دوڑتا ہے جس کی لذتیں اور راحتیں ابدی اور لافانی ہیں۔ اس کی رگوں میں بھی گرم خون دوڑتا ہے، اور اس کی راتیں آنکھوں میں کٹ جاتی ہیں، مگر لہو ولعب میں نہیں، بلکہ عبادت و بندگی میں، تضرع وزاری میں، جذبۂ محبت و اطاعت میں! اسے جب دولت حاصل ہوتی ہے تو اس کی نظر غریبوں، کمزوروں اور پریشان حالوں پر پڑتی ہے۔ وہ روتے ہوؤں کے آنسو پونچھتا ہے، وہ غریبوں کے زخمی دلوں پر مرہم رکھتا ہے، وہ کمزوروں کی مدد کرتا ہے۔ تو وہ ذات جو تمام دولت وطاقت کا سرچشمہ ہے، اسے اپنی خاص مہربانی سے، ہر غم سے سبکدوش، ہر مصیبت سے آزاد اور اس کے ہر درد کا مداوا کرتی ہے۔ اور اس کا آخری نقطۂ عروج یہ ہوتا ہے کہ جس دن تمام کائنات اپنے اپنے نامۂ اعمال میں بدحال ہوگی اور ایسی دھوپ ہوگی جس میں کہیں سایہ نہ ہوگا، صرف ایک سایہ ہوگا ٹھنڈا اور راحت بخش، اور وہ عرش الٰہی کا سایہ ہوگا۔ اس میں جوانی کا یہ صاحبِ کردار اعزاز واکرام اور خوشی وآرام کی لذت میں ہر غم سے بے نیاز ہوگا۔

تم دیکھو اور بتاؤ کہ جوانی کو کس راہ پر ڈال رہے ہو؟ اور اس کی طاقت اور اس کے جوش کو کس کام میں لا رہے ہو؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمھاری یہ طاقت اور تمھارا یہ جوش، محض فضول اور جھوٹی لذتوں میں برباد ہو رہا ہے؟ تمھاری راتیں کہیں صرف لہو ولعب میں تاریک سے تاریک تر تو نہیں ہو رہی ہیں؟ تمھاری آنکھیں محض عارضی اور چند دنوں میں ختم ہو جانے والے یا پردوں پر تھرکتے ناچتے بے جان حسن وجمال کے نظارے میں تباہ تو نہیں ہو رہی ہیں؟ ذرا اپنے کانوں کا خیال کرو، ان میں کس طرح کی آوازیں گھس رہی ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ صرف گانے بجانے کی حرام اور نجس آوازیں کان کو گندہ کر رہی ہیں؟ اپنی زبان پر توجہ دو، اللہ کی عظیم نعمت، جس نے تمھیں جانوروں کی صف سے نکال کر انسانوں کے زمرے میں پہنچایا ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کا استعمال صرف شیطانی الفاظ وکلمات کے لیے ہو رہا ہے۔ گالیاں، فحش کلامیاں، جھوٹ اور دوسری آفات اور

بلاؤں میں تو مبتلا نہیں؟ جوانی یہ سب راستہ دکھاتی ہے۔ کہیں تمہاری جماعت اس پر تو نہیں دوڑ رہی ہے؟ یاد رکھو یہ راستہ جہنم کو جاتا ہے، اگر اس پر دوڑو گے تو یہ دوڑ تم کو وہاں پہنچا دے گی، جس سے تم کو بچانے کے لیے پیغمبر علیہ السلام نے اپنی ساری طاقت اور تمام تر صلاحیت صرف کی تھی۔ کیا ان کی محبت، ان کی دل سوزی، ان کی راتوں کی آہ وزاری کا تم یہی حق ادا کر رہے ہو۔

بچو! بچو! پلٹو! اور اس راہ پر دوڑو، جو اللہ کی رضا مندی، مغفرت اور جنت کی طرف جا رہی ہے۔

نوجوانانِ ملت! تم نے اپنے سب سے بڑے ہمدرد و مخلص اور انسانیت کے سچے بہی خواہ کی سچی بات، جو ہر شبہ سے بالاتر ہے، سنی۔ اور سب سے بڑھ کر بہی خواہی اور ہمدردی سے بھرا ہوا کلام پڑھا۔ کیا یہ کلام تمھارے دلوں پر دستک نہیں دے رہا ہے، انسانیت کے یہ نجات دہندہ بزرگ تمھیں کس مقام و مرتبہ پر دیکھنا چاہتے ہیں، اس پر اچھی طرح غور کرو۔ وہ تمھیں عرشِ الٰہی کی پناہ میں دیکھنا چاہتے ہیں، اس دن جب کہ ہر پناہ فنا ہو چکی ہوگی اور وہی ایک پناہ باقی ہوگی۔ اور جہاں وہ خود بھی تشریف فرما ہوں گے۔ وہ پناہ تمھیں کیوں کر حاصل ہوگی، اس کی تدبیریں بتا رہے ہیں۔ اور تم پڑھ چکے ہو کہ وہ سات تدبیریں ہیں۔ اب یہ تمھارے حوصلہ کی بات ہے کہ ان تدبیروں میں سے کوئی ایک تم اپنی حوصلہ مند طبیعت میں داخل کرو، یا یہ کوشش کرو کہ وہ ساری تدابیر تمھارے دائرۂ اعمال میں آجائیں تاکہ تمھیں عرش کے ہر چہار جانب سے صدا دی جائے کہ اے خوش نصیب! ادھر آؤ! تمھارا مقام یہ ہے۔ پس ضروری ہے کہ تمھاری جوانی شہواتِ فاسدہ سے پاک ہو، بدکرداری نے اسے گندہ نہ کیا ہو، تمہارا قلب و دماغ اطاعتِ الٰہی اور عبادتِ خداوندی کی فکر میں نکھر رہا ہو، تمھاری اٹھان محبت و عبادت الٰہی میں ہو رہی ہو۔

۱) **الامام العادل:** اگر تمھیں کسی قوم کی، کسی ملک کی، کسی خطۂ زمین کی

سربراہی مل گئی، تم صاحبِ اختیار ہو، صاحبِ اقتدار ہو، تو تمھارا دماغ اس کے نشہ میں سرمست وسرشار نہ ہو۔ ظلم وطغیان تمھارے دامنِ اقتدار کو آلودہ نہ کرے، بلکہ ہر ایک کے ساتھ انصاف تمھارا شعار ہو۔ اور انصاف کیا ہے؟ اپنے نفس اور خواہش کو دبا کر احکام خداوندی کی بغیر کسی جانبداری کے تعمیل! وہ اپنا ہو یا غیر، دولت مند ہو یا فقیر، جہاں جو حکم الٰہی ہو اس کا ٹھیک ٹھیک نفاذ! نہ کوئی جانبداری! نہ کسی اجنبیت کا کوئی تاثر!

۲) **شَأبٌّ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ رَبِّهٖ**: عبادتِ الٰہی میں نوجوانی کے حوصلوں کو صرف کرنا، اس کی قدرے تفصیل گزر چکی۔

۳) **رَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ بِالْمَسْجِدِ**: مسجد میں دل اٹکا رہے۔ اس کا مصداق اول نوجوان ہی ہے۔ معلوم ہے کہ نابالغ پر نماز فرض نہیں، اس دور میں وہ بچہ ہے۔ پھر جب بلوغ کی عمر کو پہنچا تو اب نوجوان ہے، اب اس پر نماز فرض ہے۔ نوجوانی کی امنگیں اسے اِدھر اُدھر آوارہ رکھنا چاہتی ہیں، کھیل کود کے میدانوں میں، فسق وفجور کی لذت گاہوں میں، معصیت کی خلوتوں میں، گناہ کی جلوتوں میں اسے کھینچتی اور بلاتی ہیں، مگر وہ مردِ باحوصلہ سب کو شکست دے کر اپنے قلب کو مسجد کے ساتھ باندھ کر رکھتا ہے۔

نوجوانو! کبھی تم نے غور کیا! آج دنیا نے گناہوں کے جال پھیلا رکھے ہیں جن میں پھنس کر آدمی اپنے دین وایمان اور اپنی صحت وعزت کو داؤ پر لگا دیتا ہے۔ کھیل کود نے نت نئی دلچسپیاں بڑھا دی ہیں، جن میں منہمک ہو کر آدمی نماز اور مسجد تو کیا اپنا وجود بھی فراموش کر دیتا ہے۔ بارہا دیکھنے میں آیا ہے کہ مسجد قریب ہے، لاؤڈ اسپیکر سے اذان کی آواز پھیل رہی ہے، مگر کھیل کود جاری ہے۔ کھیل کی کیفیات کو نشر کرنے والا حسبِ معمول اپنی ہانک پکار میں لگا ہوا ہے۔ کھیل دیکھنے والے آوازِ اذان سے غافل کھیل کے نظارے میں محو ہیں۔ پھر نماز بھی ہوتی ہے، نمازی اضطراب میں ہوتے ہیں اور کھیل کا میدان کھیل کی سرمستی میں سب کچھ بھولا رہتا ہے۔

یہ سنیما ہال ہے، ذرا دیکھو کہ اس کے آس پاس کون سی قوم منڈلا رہی ہے۔ یہ

نوجوان ہی ہیں۔ اور پھر غور سے دیکھو ان میں مسلمان کتنے ہیں؟ جس مسلمان کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہونا چاہیے، وہ غول در غول کہاں موجود ہے۔ وقت بھی برباد کرتا ہے اور پھر اپنے ماں باپ کی گاڑھی کمائی دے کر اپنا دین وایمان بھی ضائع کرتا ہے۔ اپنی صحت وقوت بھی تباہ کرتا ہے، اپنے اخلاق وآداب کو بھی بیچ دیتا ہے۔

کون سا گناہ ہے؟ اور کون سی لغویت ہے؟ جس میں مسلم نوجوانوں کی بڑی تعداد اپنے اخلاق واعمال کو برباد کرنے پر تلی ہوئی نہیں ہے؟ بدنامی کا کون سا سامان ہے جو مسلمان نوجوان نے اکٹھا نہیں کر رکھا ہے؟ جس مسلمان نوجوان کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہونا چاہیے تھا، آج وہ رسوا سر بازار ہو رہا ہے۔ اور ایسا نہیں ہے کہ وہ بے قصور ہو، اس نے مسجد سے منہ موڑا تو تباہی کے ہراڈے پر پہنچا۔ بے موقع جنگ وجدال، بے تحاشا گالی گلوج، اپنوں کے حق میں سخت گیر، غیروں کے سامنے بھیگی بلی! پولیس اسٹیشن ان کے جرائم سے آباد، کچہریاں ان کے فتنہ وفساد سے معمور، آپس میں سر پھٹول، ایک دوسرے کی ایذا رسانی! بس کیا کہا جائے! ایک مسجد سے منہ موڑا اور ایک اللہ سے رشتہ توڑا تو کہاں کہاں اس کو سر پھوڑنا پڑا؟ کہاں کہاں بھٹکنا پڑا؟

اے نوجوانو! مسجد کی عظمت پہچانو، اس کے آباد کرنے کی تدبیر کرو۔ مسجدیں تم سے خالی ہو رہی ہیں، اپنے وجود سے انھیں لبریز کرو۔ تمھارے دل میں مسجد کا خیال ہمہ وقت بسا ہوا ہو، تب اسے سلامتی حاصل ہوگی۔ اللہ کے حضور اگر کوئی چیز نافع ہے تو قلبِ سلیم ہے۔ تم نے غلط جگہیں آباد کیں، جو ویرانی کی مستحق تھیں۔ تم نے مسجد کو ویران کیا، پس تمھارا قلب بھی ویران ہو گیا جسے آباد ہونا تھا۔

اگر آج تمھارے قلب میں مسجد کا اہتمام بس گیا تو عرشِ الٰہی کے سایہ کی ٹھنڈی ہوائیں ابھی سے تم کو حاصل ہونے لگیں گی۔ پھر جو کوئی تمھارے آس پاس ہوگا وہ بھی راحت کی سانس لے گا، کاش تم اس بات کو سمجھتے۔

۴) **وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللهِ اِجْتَمَعَا عَلَيْهِ وَتَفَرَّقَا عَلَيْهِ**: عرشِ الٰہی کے

جاں آفریں سایہ میں جگہ پانے والوں میں وہ لوگ بھی ہیں جو محض اللہ کے لیے باہم محبت کرتے ہیں، اسی بنیاد پر ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور جب جدا ہوتے ہیں تو اسی للہ فی اللہ محبت سے معمور ہوتے ہیں۔

عزیزو! محبت تو ہر کوئی کرتا ہے۔ انسان کا دل بنا ہی ایسا ہے کہ وہ محبت سے خالی نہیں ہوسکتا۔ اسے بھوک پیاس سے پہلے محبت کا جوہر حاصل ہوتا ہے۔ بچہ ماں کے پیٹ سے جو پہلی چیز لے کر آتا ہے، وہ محبت ہے۔ اسے ماں سے محبت ہوتی ہے، باپ سے محبت ہوتی ہے، خود اپنی ذات سے محبت ہوتی ہے۔ پھر جوں جوں وقت گزرتا ہے، اس کا جسم نشو ونما پاتا ہے، اس کی محبت کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ لیکن اس کی محبت کا منشا خود اس کی ذات، اس کی اغراض، اس کے فوائد ومنافع ہوتے ہیں۔ وہ اپنے گرد وپیش میں بہت کچھ پاتا ہے، پھر جس میں اپنا نفع دیکھتا ہے، اس سے محبت کرتا ہے۔ کچھ اس کے جسم کے تقاضے ہوتے ہیں، کچھ اس کے قلب وروح کے تقاضے ہوتے ہیں، کچھ جسمانی و نفسانی لذات کے تقاضے ہوتے ہیں، جہاں جہاں سے ان تقاضوں کو پورا ہوتے دیکھتا ہے وہاں وہاں محبت ٹوٹی پڑتی ہے۔ لیکن ان سب تقاضوں سے بالاتر تقاضا اس کے خالق ومالک کی طرف سے ہوتا ہے، کیوں کہ اس کی تمام ضروریات بلکہ وجود اور وجود کے تمام لوازم کی بخشش اس ذات عالی کی جانب سے ہے۔ پس اسے اصلاً اسی کی محبت حاصل ہے پھر جہاں تک اس کا حکم پہنچتا ہے، محض اسی کے واسطے سے محبت کا سلسلہ بڑھتا جاتا ہے۔

دنیا کی ہر چیز فانی ہے، اس کے تقاضے بھی فانی ہیں۔ پس اس نسبت کی ہر محبت فنا وزوال کے داغ سے داغدار ہے۔ اللہ کی ذات باقی ہے، اس کی محبت، اور اس کی نسبت سے ہر محبت باقی رہنے والی ہے۔ فنا ہوجانے والی چیز سخت باعثِ تکلیف ہے۔ کیوں کہ محبت میں محبوب کا چھوٹ جانا سخت ناگوار ہوتا ہے۔ اور فانی کو آخر چھوٹنا ہے۔ پس اس کی ایذا رسانی یقینی ہے۔ اللہ باقی ہے، اس کی نسبت باقی ہے۔ پس یہ محبت دائمی اور ابدی ہے۔ اس کا لطف اور اس کی لذت بھی دائمی اور ابدی ہے۔ تو جو محبت اللہ کے

لیے کی گئی وہ انسان کو عرشِ الٰہی کے سایہ میں کھڑا کر دیتی ہے۔

پس تم اپنی محبت کا جائزہ لو کہ جس کسی سے محبت کرتے ہو اس کی بنیاد کیا ہے؟ اگر خداوند تعالیٰ کی محبت کے علاوہ اس کی کوئی اور بنیاد ہے تو اسے پہلی فرصت میں جلا دو، پھونک دو۔ دل میں صرف وہی محبت رہے جو محض اللہ کے لیے ہے۔ اس سے دل کو زندگی ملتی ہے، عزت ملتی ہے اور ہر وہ چیز ملتی ہے جسے تم چاہتے ہو، یا آئندہ چاہو گے۔

اگر تمھیں سمجھ میں نہ آئے کہ اللہ کے لیے محبت کا کیا مطلب ہے؟ تو ان لوگوں کو تلاش کرو، جو اللہ کے لیے محبت کرنا جانتے ہیں۔ تمھارے گرد و پیش میں ایسے لوگ مل جائیں گے، گو کہ کم ملیں گے۔ تلاش اور فکر پیدا کرو، پھر اگر ایسے لوگ دنیا کے کسی گوشے میں ہوں گے تو اللہ تعالیٰ یا تو تمھیں وہاں پہنچا دیں گے، یا انھیں تمھارے پاس بھیج دیں گے۔

لیکن ہاں خبردار! تم اس مستی اور حماقت کو محبت نہ سمجھ لینا، جو فلمی گانوں میں سنتے رہتے ہو، یا جسے فسق و فجور میں ڈوبے ہوئے شعرا گاتے پھرتے ہیں، وہ نفس کی شرارت ہے۔ بقول مولانا روم ''فسادِ گندم'' ہے۔ یعنی کھانے کی بے اعتدالی سے شہوت کی بے اعتدالی ہے۔ یہ جس کا نام محبت لیا جاتا ہے، محبت نہیں شیطان کا مکر اور نفس کی شرارت ہے اس سے بچتے رہنا۔ کتنوں کی جوانیاں اس بلا نے تباہ اور کتنوں کی زندگیاں اس معصیت نے برباد کی ہے۔

دل جو سارے بدن کا پاور ہاؤس ہے، یہ غلط محبت اس کا سب سے بڑا روگ ہے۔ دل کی شفا محبت الٰہی ہے اور وہ محبت جو اللہ کے لیے ہو، پھر انسان پر عرشِ الٰہی کے نیچے سے روح پرور ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔ کسی شخص کو اس سے بڑھ کر اور کیا دولت چاہیے کہ عرشِ اعظم سے اس کا تعلق براہ راست جڑ جائے۔

عزیز نوجوانو! یہ دل کا بڑا گھٹیا استعمال ہے کہ اس میں دنیا کی محبت ہو اور دنیا کے لیے محبت ہو۔ اس گھٹیا استعمال کو بند کرو اور اللہ والوں سے، اللہ کی محبت اور اللہ کے

لیے محبت کو سیکھو اور حاصل کرو۔

۵) **وَرَجُلٌ طَلَبَتْهُ أُمْرَأَةٌ ذَاتَ مَنْصَبٍ وَجَمَالٍ فَقَالَ: اِنِّی اَخَافُ اللّٰہَ:** یہ ایمان کا معراجِ کمال ہے۔ آدمی کے اندر ایک نہایت طاقتور جذبہ، شہوانی جذبہ ہے۔ یہ جذبہ دل میں محبت بلکہ عشق بن کر اترتا ہے اور مکمل اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے۔ پھر اس کی عقل ماری جاتی ہے، آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں، ہوش ٹھکانے نہیں رہتے، پھر آدمی ہرنا کردنی کر ڈالتا ہے۔ ایک جوان یا نوجوان آدمی ہے، طاقت اور صحت سے معمور، اسے ایک عورت، ایسی عورت جو جاہ و منصب کا دبدبہ بھی رکھتی ہے اور بہت حسین و پُرکشش بھی ہے، وہ اسے اپنے بدن کی جانب بلاتی ہے۔ بتاؤ کہ اس نوجوان کے بچ جانے کا کوئی امکان دکھائی دیتا ہے۔ وہ نہ بھی بلاتی تو خود اس نوجوان کا جذبہ اس کے پاس لے جاتا، مگر وہ یہ کہہ کر ہٹ جاتا ہے کہ ''میں اللہ سے ڈرتا ہوں'' اس کا یہ کہہ کر ہٹ جانا رب **العرش العظیم** کے نزدیک اتنا محبوب اور عظیم عمل ہے کہ یہ عمل اسے براہ راست اس عرش عظیم کے سائے میں پہنچا دیتا ہے، جس کے سائے سے بڑھ کر کوئی سایہ نہیں!

عزیزو! اس بات کو خوب یاد رکھو۔ ہر ایسے موقع اور جگہ سے بچو، جہاں اس قسم کی آزمائش ہو سکتی ہے۔ ہر امت کا ایک فتنہ ہوتا ہے، اس امت کا فتنہ عورت اور مال ہے۔ مال کا ذکر ابھی نمبر (٦) پر آئے گا، یہ عورت کے فتنہ کا ذکر ہے۔ عورتوں کو شیطان اپنے جال کے طور پر استعمال کرتا ہے، جس سے وہ نوجوانوں کو اور ان کے ایمان کو شکار کرتا ہے۔ معلوم ہے کہ مچھلی پر جال پھینکا جاتا ہے اور پرندوں کے لیے گھات لگایا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر مومن متقی نہ ہو، تو شیطان اسے نوجوان عورتوں کی راہ میں لگا دیتا ہے۔ وہ اپنے ناز و ادا سے انھیں شکار کرتی ہیں۔ اس وقت نوجوانوں کا ایمان وتقویٰ ڈھال بن جاتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی اس ترغیب صادق کے بعد کون ہے جو ایمان وتقویٰ کی پناہ

میں نہ آجائے۔ نوجوانوں میں جہاں یہ جذبہ شہوانی ہوتا ہے، وہیں ان کے حوصلے بھی بلند اورقوی ہوتے ہیں۔ اگراس کا عزم صادق ہوتو شیطان کی ہر چال ناکام اور بےکار ہوکر رہ جاتی ہے۔

نوجوانو! کیاتم اپنے اندر یہ حوصلۂ عظیم پاتے ہو؟

۶) **وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ اَخْفٰی حَتّٰی لَایَعْلَمُ شِمَالُهُ مَاتُنْفِقُ یَمِیْنُهُ** : آدمی کے دل کو یاتو عورت پکڑتی ہے، اس کا حال تم نے سن لیا، یا مال پکڑتا ہے۔ اور مال کی گرفت بھی کچھ کم نہیں ہوتی۔ مال ہی کی طرح شہرت ونیک نامی کی خواہش بھی دل پر پنجہ گاڑتی ہے۔ آدمی مال کی اور جاہ وشہرت کی خواہش میں کیا کیانہیں کرڈالتا، مگرعرش کے سائے میں وہ پہنچے گا جو مال کی محبت سے بےنیاز ہےاور شہرت کی خواہش سے بھی پاک ہے۔ وہ غریب اپنی کمائی کا مال دیتا ہےاوراس طرح دیتا ہے کہ اس کے سب سے قریبی فردکوبھی احساس نہیں ہوتا ہے کہ اس نے کسی کو کچھ دیا ہے۔ آخر بایاں ہاتھ داہنے ہاتھ کے کتنے قریب ہے مگراسے بھی پتہ نہیں ہوتا کہ داہنے ہاتھ نے کیاعمل کیا۔ مال کواپنے پاس سے ہٹانا یہ دلیل ہے کہ مال کی محبت نے اس کے دل کونہیں پکڑا ہے۔ اور اس خاموشی سے دیتا ہے کہ کسی کوخبر تک نہیں ہوتی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ شہرت ونیک نامی کی محبت سے بھی خالی ہے۔

اس کا یہ جذبہ اورعمل اتنا بڑا ہے کہ وہ سیدھا عرشِ الٰہی کے سایہ میں جا پہنچتا ہے اورخدا کا انتہائی قریبی ہوجاتا ہے۔ وَفِی ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ“ (سورۃ المطففین آیۃ ۲۶) مقابلے میں سبقت کرنے والے آئیں اوراس میں مسابقہ کریں۔

۷) **وَرَجُلٌ ذَکَرَ اللهَ خَالِیاً فَفَاضَتْ عَیْنَاهُ** : اوپر جو کچھ بیان کیا گیا، اس کی روح یہ ہے کہ ایک مردِ مومن کا دل اللہ کی محبت اور جذبۂ اطاعت سے معمور ہو۔ دنیا کے ہزار تقاضے ہوں، نفس چاہے جتنا زور لگارہا ہو، شیطان خواہ کتنی ہی سازشیں کررہا ہو، دنیاوالے چاہے جتنا دباؤ ڈال رہے ہوں، مگراللہ کے حضوراس کا جذبۂ

محبت وفرماں برداری سب کو شکست دے کر سرخ روئی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ وہ دنیا میں بھی سرخ رو ہوتا ہے اور آخرت میں بھی سب سے عزت اور راحت کے مقام تک پہنچتا ہے۔ دل کی یہ محبت اتنی طاقت ور ہے کہ اس کے سامنے تمام تقاضے ماند اور تمام محبتیں بجھ کر رہ گئیں۔ اب اس کے سامنے کوئی بھی اس کی نظر کو گرفتار کرنے والا نہیں رہا:

وہ آئے بزم میں اتنا تو فکر نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

اس جذبۂ محبت واطاعت کے آجانے کے بعد دل اس میں ڈوب گیا۔ اب وہ اکیلا بیٹھا ہے، ساری دنیا سے یکسو ہو گیا ہے، اس کے پاس کوئی نہیں، لیکن محبت الٰہی کی شورش اٹھتی ہے اور آنکھوں سے پانی بن کر بہنے لگتی ہے۔ وہ آنسو بڑا قیمتی ہے جسے محبت نے دل سے اچھالا اور آنکھ کی راہ سے بہہ پڑا۔ لیکن اسے بجز پروردگار کے کسی اور نے نہیں دیکھا۔ وہ یہ آنسو ہے جس سے جہنم کی آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ یہ گویا پچھلے تمام کی روح ہے۔

ملت کے نوجوانو! اللہ نے تمھیں طاقت دی ہے، حوصلہ دیا ہے۔ یہ عطیۂ خداوندی ہے۔ اسے تم کیوں سفلی کاموں اور گھٹیا چیزوں میں صرف کر رہے ہو؟ ہمت وحوصلہ کا تقاضا تو یہ ہے کہ تم بلندیوں پر پہنچنے کا عزم کرو۔ نیچے گرنا کیا مشکل ہے، اوپر چڑھنا کارِ بلند ہے۔

تم گھٹیا کاموں میں گھس کر اپنی جوانی کی توہین کیوں کرتے ہو؟ تمھارے عزم و حوصلہ کی تاب تو نفس وشیطان کا کوئی حملہ نہیں لاسکتا، اس کے سامنے تو ہر چٹان چور ہو جائے گی:

جوانو! یہ صدائیں آ رہی ہیں آبشاروں سے
چٹانیں چور ہو جائیں جو ہو عزمِ سفر پیدا

اللہ کا منادی پکار رہا ہے کہ دنیا کا ہر تقاضا موڑ دو، اور خالص اللہ کے ہو رہو۔

تمھارا کلام تو یہ ہونا چاہیے کہ: رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِياً يُّنَادِىْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ آمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّآتِنَاوَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۔(سورة آل عمران آیة ۱۹۳) اے ہمارے رب! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا، وہ ایمان کے لیے پکار رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ، تو ہم ایمان لائے۔ اے ہمارے پروردگار! آپ ہمارے گناہوں کی مغفرت فرما دیجیے اور ہماری برائیوں کو محو فرما دیجیے اور ہمیں نیکوں کے زمرے میں وفات دیجیے۔

ملتِ اسلامیہ کے نوجوانو! تم اپنی خواہشِ نفس کو پیشوا نہ بناؤ۔ اللہ کو، رسول کو، اللہ کے سچے بندوں کو، مخلص نائبین رسول کو اپنا رہبر بناؤ، خواہ تم عصری درس گاہوں اور کالجوں میں پڑھتے ہو، خواہ دینی مدرسوں میں زیرِ تعلیم ہو، یا اپنے کاروبار میں مشغول ہو۔ ہر نظریہ اور ہر خواہش باطل ہے، سوائے اس کے جس کو تائید کلام خدا یا کلام رسول سے حاصل ہو۔

اگر مالک ومولیٰ کی خوشنودی چاہیے، دنیا کی زندگی خوش گوار چاہیے، موت اور قبر کا معاملہ آسان چاہیے، حشر میں عرش الٰہی کا سایہ چاہیے، حساب اور میزان کا مرحلہ سہل چاہیے، رسول اکرم ﷺ کے دستِ مبارک سے جام کوثر چاہیے ، یہ سب عظیم نعمتیں چاہییں ، تو دنیا کی زندگی میں اپنی خواہشوں کی قربانی کر کے محبت الٰہی کو دل میں بسانا ہوگا۔ نوجوانوں کو دعوت عمل ہے: فَهَلْ مِنْ مُّسْتَمِعٍ ؟وَهَلْ مِنْ مُّجِيْبٍ؟ (کیا ہے کوئی گوشِ قبول سے سننے والا، اور کیا ہے کوئی اس پر لبیک کہنے والا؟)

❑❑❑

وعظ نرملی ضلع سپول بہار

۹؍شوال ۱۴۱۳ھ مطابق ۲؍اپریل ۱۹۹۳ء

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُه وَنَسْتَعِيْنُه وَنَسْتَغْفِرُه وَنُوْمِنُ بِه وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْه وَ نَعُوْذُ بِاللّٰه مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَه وَ مَن يُّضْلِلْه فَلَا هَادِىَ لَه۔ وَنَشْهَدُ اَن لَّااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَه لَا شَرِيْكَ لَه وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مَحَمّداً عَبْدُه وَرَسُوْلُه اَرْسَلَه بِالْحَقِّ بَشِيْراً وَنَذِيْراً۔ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْه وَعَلٰى آلِه وَاَصْحَابِه وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً۔ اَمَّابَعْدُ:

فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم۔ بسم الله الرحمان الرحيم

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا(۷۰) يُصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا(۷۱)[سورہ احزاب الجزء۲۲]

محترم بزرگو اور دوستو! اللہ تبارک وتعالی کا یہ خاص فضل وکرم ہے کہ اس نے ہم کو محض اپنی مہربانی سے مسلمان گھرانے میں پیدا کیا۔ کسی کافر گھرانے میں پیدا ہوتے تو کیا توقع تھی کہ ہم ہدایت پر ہوتے؟ یہ ہدایت جو اللہ کی طرف سے ہم کو مل گئی ہے یہ ہماری محنت ومشقت کے بغیر ہے۔ ان لوگوں سے اس کی قدر پوچھیے جنھوں نے اس کو محنت ومشقت سے حاصل کیا ہے۔ حضور ﷺ کے زمانہ میں جب کہ آپ ﷺ نے سخت کفر کی حالت میں دین کی تبلیغ شروع کی اور کچھ لوگوں نے آپ کی بات ماننی شروع کی تو جو مسلمان ہوتے، کیا کچھ ان پر گزرتی تھی اسے سب جانتے ہیں۔ بڑی دشواریاں، بڑی

دقتیں، بڑی پریشانیاں۔ مسلمان ہونا اس زمانہ میں ایسا تھا جیسے انگاروں پر لیٹنا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے ایک شاگرد اُن کے بڑھاپے میں ان سے کہہ رہے تھے کہ ’حضرت! آپ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی قدر نہیں کی۔ آپ لوگوں کے درمیان اللہ کا اتنا بڑا پیغمبر پیدا ہوا، اتنا محبوب اور اتنا مقرب بندہ پیدا ہوا لیکن آپ لوگوں کی موجودگی میں اور آپ لوگوں کے درمیان ہوتے ہوئے انھوں نے کتنی تکلیفیں اٹھائیں کتنے زخم سہے، کتنی دشواریاں برداشت کیں۔ اور آپ لوگ ان کے کام نہ آسکے۔ جیسی چاہیے تھی آپ حضرات ان کی مدد نہ کرسکے۔ ہم ہوتے تو آپ ﷺ سے کہہ دیتے کہ آپ آرام سے بیٹھیں، آپ کا ہر کام ہم کریں گے۔ جہاں آپ کا پسینہ بہتا، ہم اپنا خون بہاتے۔ آپ کو ہم اپنے کندھوں پر بیٹھاتے۔ غرض یہ کہ کوئی مشقت کوئی دشواری سہنے کی نوبت آپ کو نہیں آتی۔‘ یہ بات کون کہہ رہا ہے؟ ایک تابعی ایک جلیل القدر صحابی سے!

ان کا مطلب یہ تھا کہ حضرات صحابہ کرام حضور اکرم ﷺ کے ساتھ رہے تو حضور نے سارا کام صحابہ کے ساتھ مل کر کیا، یہاں تک کہ گارا مٹی کا کام کیا۔ مسجدِ نبوی بنی تو اس میں سب کے ساتھ آپ ﷺ بھی پتھر ڈھوتے رہے۔ خندق کھودنے کی باری آئی تو جیسے سب خندق کی کھدائی میں لگے تھے آپ ﷺ بھی کھود رہے تھے۔ غرض سب کام میں ان کو آپ لوگوں نے ساتھ رکھا۔ ہم ہوتے تو کسی بھی کام میں آپ کو لگنے نہ دیتے، سب کچھ ہمیں کرتے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ مسکرائے اور فرمایا کہ ’بیٹا! تم ٹھنڈے موسم میں پیدا ہوئے ہو، اس لیے تم کو بات سوجھتی ہے۔ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے ہو، اسلام مفت میں مل گیا ہے تو چاہے جتنی بات بنالو۔ پتہ نہیں حضور ﷺ کے زمانہ میں ہوتے تو کہاں ہوتے؟ آپ کی موافقت کرتے، آپ کی مدد کرتے یا آپ کی مخالفت میں تلوار لے کر کھڑے ہوجاتے؟ وہاں معاملہ کفر اور ایمان کا تھا۔ جو مانتے تھے ان کی گردن پر

تلوار چلتی تھی اور جو نہیں مانتے تھے وہ تلوار لے کر سامنے کھڑے ہو جاتے تھے۔ تم کو پتہ ہے کہ تم کس مجمع میں ہوتے؟ اگر ماننے والے میں ہوتے تو جان بچانی مشکل ہوتی اور نہ ماننے والوں میں ہوتے تو ہمیشہ کے لیے لعنت کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیتے۔ اب تو بحمد للہ بغیر کسی محنت کے مسلمان گھر میں پیدا ہو کر بچپن سے کلمہ ’لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـه‘ سن رہے ہو۔ بچپن سے رسول اللہ ﷺ کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہو اور ہم لوگوں سے کہہ رہے ہو کہ آپ لوگوں نے قدر نہیں کی۔‘

اسلام کی قدر دانی ضروری ہے:

حضرات! بلاشبہ یہ بات سچ ہے کہ اسلام ہم لوگوں کو مفت میں مل گیا ہے، تاہم یہ اللہ کا بہت بڑا کرم ہے۔ اگر ہم سے کہہ دیا جاتا کہ خود دین اسلام کو ڈھونڈو تو ہرگز ہم سے نہ ہوسکتا تھا۔ اپنی دوکان اور مکان پر ہی بیٹھے رہ جاتے۔ لیکن اللہ نے دوکان پر بیٹھے ابتدا ہی سے دین اسلام نصیب فرما دیا ہے۔ یہ کتنی بڑی مہربانی ہے۔ اس پر ہم لوگ خدا کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے۔ لیکن ہم لوگوں کو دنیاوی نعمتوں کا شکر کرنا تو سمجھ میں آتا ہے۔ کوئی ہمیں بہت ساری دولت دیدے تو ہم اس کے شکر گزار رہوں گے۔ ہاں اگر ہم اللہ سے دعا کریں کہ ’پروردگار! ہمیں دو لاکھ روپے عنایت فرما دیجیے‘ اور اس کے بعد واقعی بغیر مشقت کے دو لاکھ مل جائیں تو ہم اس پر اللہ کا بہت شکر ادا کریں گے۔ دنیوی احسانات پر ہم سے شکر ادا ہو جاتا ہے۔ کھانا کھائیں تو الحمدللہ ضرور کہیں گے۔ لیکن اسلام بھی ایک نعمت ہے، اس پر شکر ادا کرنا چاہیے، اس کا خیال ذرا کم آتا ہے۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حال:

حضرات صحابہ کرام کبھی کبھی صرف اس بات پر شکر ادا کرنے کے لیے بیٹھتے تھے کہ اللہ نے ہم کو نعمتِ اسلام سے نوازا ہے۔ ایک مرتبہ چند صحابہ کرام مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ حجرے سے باہر تشریف لائے تو آپ نے فرمایا کہ ’تم لوگ یہاں کیوں بیٹھے ہوئے ہو؟‘ کہنے لگے ’یا رسول اللہ! ہم لوگ اس لیے بیٹھے ہوئے ہیں کہ آپس

میں اس کا تذکرہ کریں کہ ہم لوگ کتنے گمراہ اور کتنے جاہل تھے۔ دین اور ہدایت سے کتنے دور تھے۔ آپ کے طفیل اللہ نے ہم لوگوں کو ہدایت بخشی۔ ہم اس پر اللہ کا شکر ادا کر رہے ہیں۔' حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ 'میں تم کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ تم صرف اسی مقصد کے لیے بیٹھے ہو یا اور بھی کوئی کام ہے؟' عرض کیا 'یا رسول اللہ! ہم صرف اسی غرض سے بیٹھے ہیں، کوئی دوسرا مقصد نہیں ہے۔' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ 'میں نے تم لوگوں کو اس لیے قسم نہیں دی کہ میں تم کو جھوٹا سمجھ رہا ہوں، میں سچا سمجھتا ہوں۔ لیکن ابھی میرے پاس جبرئیل امین آئے تھے کہ باہر کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالی ملائکہ پر ان کے واسطے سے فخر فرمارہے ہیں کہ 'دیکھو میرے بندے ایسے ایسے ہیں۔' یہ لوگ بیٹھے ہوئے تو تھے فرش زمین پر، لیکن اللہ تعالی ان کو پیش فرمارہے ہیں عرش بریں پر، اور فرشتوں کو دکھارہے تھے کہ 'دیکھو! میرے بندے میری نعمت کا شکر ادا کر رہے ہیں۔'

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ 'میں نے سوچا ایسے کون لوگ ہیں؟ ان کا کیا کام ہے؟ اسی لیے میں نے آکر پوچھا کہ یہی کام ہے یا اور کوئی کام ہے؟'

نعمت کی قدردانی اور ادائے شکر پر بشارت:

معلوم ہوا کہ نعمتِ اسلام پر اللہ کا شکر ادا کیا جائے تو اللہ تعالی کی بڑی رحمت متوجہ ہوتی ہے۔ اور یہ بات واقعی ہے۔ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا ہے کہ " وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکُمْ لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ " (سورۃ ابراھیم آیۃ ۷) تمھارے رب نے یہ اطلاع دی کہ تم شکر ادا کروگے، نعمت کی قدردانی کروگے تو ہم تم کو مزید عطا کریں گے۔ اور اگر ناشکری کروگے تو میرا عذاب سخت ہے۔

نعمتِ اسلام بھی بہت بڑی نعمت ہے۔ اگر ہم اس پر اللہ کا شکر ادا کریں اس کی قدر کریں اور دل سے اس بات پر خوشی محسوس کریں کہ اللہ نے ہم کو بہت بڑی دولت نصیب فرمائی ہے...... اور اس کی قدر کا طریقہ یہ ہے کہ اس نعمت کو یعنی اسلام کو ہم اپنے اوپر ہمیشہ ظاہر اور نمایاں رکھیں۔ اس کے احکام کی تعمیل کرتے رہیں..... تو اللہ تعالی اس

نعمت میں اضافہ فرماتے رہیں گے۔ یعنی ایمان میں، اعمال میں، دل میں پختگی عطا فرمائیں گے۔ اپنی نصرتِ خاص سے نوازیں گے۔ یہ شکر عمل سے بھی ادا کریں، دل سے بھی ادا کریں، قول سے بھی ادا کریں۔ عمل سے شکر یہ ہے کہ آدمی تمام احکامِ اسلام کی بجا آوری کرتا رہے۔ دل سے شکر یہ ہے کہ اپنے دل میں احکامِ اسلام کے سلسلے میں اِنشراح اور خوشی محسوس کرے۔ تنگی اور اِنقباض نہ محسوس کرے۔ اگر کہیں بظاہر دشواری نظر آئے تو خوشی خوشی اللہ کے نام پر جھیل جائے جیسا حضرات صحابہ کرام کا طریقہ تھا۔ ان پر کیا کیا دشواریاں نہیں آئیں مگر ان کو اللہ کے نام پر جھیل گئے۔

ہماری ایک بڑی کمزوری:

ہم لوگوں کے اندر بہت سی کمزوریاں ہیں، من جملہ ان کمزوریوں کے ایک بہت بڑی کمزوری یہ ہے کہ ہم اسلام کی اِس عظیم نعمت کو چھپاتے ہیں۔ کب چھپاتے ہیں؟ جب کوئی مصیبت آجاتی ہے۔ ہمارے اندر اب خصوصیت سے یہ بات پائی جانے لگی ہے کہ جب کوئی رائٹ ہوجاتا ہے، ہندو مسلم فساد ہوجاتا، جیسا کہ ابھی جلد ہی ملک میں ایک زبردست ہنگامہ ہوگیا تھا۔ تو کتنے لوگ آتے جاتے راستے میں اپنے مسلمان ہونے کو ظاہر نہیں کرتے تھے۔ اس ڈر سے کہ اگر ہم اپنے کو ظاہر کردیں گے تو فریق مخالف ہم پر حملہ کردے گا اور ہم کو مار ڈالے گا۔ ایک صاحب نے یہی بات مجھ سے کہی۔ میں نے کہا کہ 'اس سے بڑی کیا سعادت ہوگی کہ ہم اللہ کے نام پر مار دیے جائیں۔ شہادت تو ہماری آرزو ہے، شہادت ہماری تمنا ہے۔ اگر ہمیں شہادت نصیب ہوجائے تو اس سے بڑی کیا دولت ہوگی۔ اور اگر ہم نے اپنے اسلام کو چھپایا تو اس صورت میں بھی تو ہم بچ نہیں سکتے۔ اسی حالت میں اگر ہم مار دیے جائیں گے تو شہادت کا ثواب نہ ملے گا۔ اس لیے کہ ہم نے ناشکری کی۔ مسلمان کہیں موت کے خوف سے اپنے اسلام کو چھپاتا ہے!'

ابھی بمبئ کے فسادات کے بعد وہاں سے جو لوگ بھاگے ہیں تو کتنے لوگ ہاتھوں میں ہندوؤں کی طرح دھاگہ باندھ کر آئے، تاکہ ان کا مسلمان ہونا ظاہر نہ ہو۔

میں نے خود پٹنہ میں ایک نوجوان کو دیکھا کہ ہاتھ میں دھاگہ باندھے ہوئے ہے۔ میں نے سمجھا کہ وہ ہندو ہے مگر جب اس نے ’السلام علیکم‘ کہا تو پتہ چلا کہ مسلمان ہے۔ میں نے جواب دے کر پوچھا کہ ’یہ ہاتھ میں دھاگہ کیوں ہے؟‘ یہ کہہ کر میں اسے توڑ دیا کہ ’علی الاعلان مسلمان رہو۔ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرو اور سنو! شہادت ایسی سستی ہے کہ ہر ایک کو حاصل ہو جائے؟ یہ بڑے قسمت والوں کو ملتی ہے۔ ہماری ایسی قسمت کہاں کہ شہادت حاصل ہو۔‘

علامہ عزالدین عبدالسلام کا واقعہ:

دمشق میں علامہ عزالدین عبدالسلام بڑے عالم گزرے ہیں۔ ان کا ایسا مرتبہ و مقام تھا کہ پورا دمشق ان کے فتوی کے سامنے سر جھکاتا تھا۔ وہ فتوی دیتے تو دمشق کے سارے لوگ کھڑے ہو جاتے، وہ فتوی دیتے تو سارے لوگ بیٹھ جاتے۔ ایک مرتبہ انھوں نے کسی مسئلہ میں حکومتِ وقت کے خلاف فتوی دیا۔ حکومت نے انھیں دمشق سے نکل جانے کا حکم دیا۔ انھوں نے کہا مضائقہ نہیں۔ ’پائے مرا لنگ نیست جائے خدا تنگ نیست‘۔ وہ دمشق کے باہر نکل پڑے۔ ان کا نکلنا تھا کہ تمام لوگ گھروں سے باہر آ گئے، مکانات خالی ہو گئے۔ بادشاہِ وقت مجبور ہوا اور خوش آمد کر کے انھیں واپس لایا۔

ایک مرتبہ انھیں علامہ عزالدین ابن عبدالسلام نے دمشق کے حاکم کے متعلق فتوی دیا کہ ’یہ شرعاً غلام ہے اور غلام کی حکومت جائز نہیں۔ جب تک اسے آزاد نہ کیا جائے، اس کا تختِ حکومت پر بیٹھنا درست نہیں۔ اور چوں کہ یہ کسی خاص شخص کا غلام نہیں بلکہ حکومت کی ملکیت ہے، اس لیے اس کو حکومت کی طرف سے بیچنا ضروری ہے، پھر خریدنے والا اسے آزاد کرے تو اس کی حکومت صحیح ہوگی۔‘ غور کیجیے! کہ دمشق کے حاکم کے بارے میں فتوی ہے کہ اس کی حکومت صحیح نہیں ہے۔ اسے سرِ بازار نیلام کیا جائے، پھر آزاد کیا جائے تب اس کی حکومت صحیح ہوگی۔ یہ فتوی بہت سخت تھا لیکن چوں کہ اسلام کا حکم تھا اس لیے انھوں نے فتوی دیدیا۔ حاکمِ وقت کو یہ فتوی بہت ناگوار گزرا اور وہ اپنے

اعوان وانصار کو لے کر علامہ کے گھر پہنچ گیا۔ گھوڑے پر سوار ننگی تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ صاحبزادے باہر نکلے، انھوں نے بادشاہ کو اس ہیئت میں دیکھا تو کانپ گئے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ ’تمہارے ابا ہیں؟‘ کہا ’جی ہاں‘، کہا ’بلاؤ‘۔ صاحبزادے تھرتھراتے ہوئے اندر گئے اور کہا ’ابا! آج آپ کی خیر نہیں ہے۔ بادشاہ ننگی تلوار لیے دروازہ پر کھڑا ہے، جیسے ہی آپ باہر نکلیں گے آپ کی گردن مار دے گا‘۔ علامہ عزالدین بڑے دل کے مالک تھے۔ یہ بات سن کر ہنسنے لگے اور فرمایا ’بیٹے! تمھارے باپ کی ایسی قسمت کہاں کہ گھر بیٹھے شہادت نصیب ہو جائے‘۔ یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل آئے۔ انھیں دیکھتے ہی بادشاہ گھبرا کر گھوڑے سے اتر آیا۔ نہ جانے اس پر کیا اثر پڑا؟ علامہ نے پوچھا ’کیسے آئے؟‘ بادشاہ نے کہا کہ ’آپ جو حکم دیں وہ پورا کیا جائے گا‘۔

وہی بادشاہ جو غصہ کے عالم میں قتل کرنے کے ارادہ سے آیا تھا اب اس طرح گڑگڑا رہا ہے۔ علامہ نے کہا کہ ’حکم تو ظاہر ہے کہ تمھیں نیلام کیا جائے گا‘۔ بادشاہ نے کہا کہ ’دن تاریخ متعین کر دیجیے‘۔ فرمایا کہ ’جمعہ کا دن مناسب ہوگا۔ جمعہ کے بعد نیلامی ہوگی‘۔ چنانچہ اس کا اعلان بادشاہ نے خود کرایا۔ پھر جمعہ کے دن بعد نمازِ جمعہ دمشق کے تمام اُمرا اور رؤسا کے مجمع میں بادشاہ کی نیلامی ہوئی۔ غالبًا پندرہ لاکھ تک بولی چڑھی۔ پھر جس نے خریدا اُس نے آزاد کیا۔ علامہ عزالدین نے خود بادشاہ کو دوبارہ تخت سلطنت پر بیٹھایا۔

موت کی جگہ اور وقت متعین ہے، ڈرنے سے وہ نہیں ٹل سکتی:

صاحبو! شہادت کی یہ قدر و قیمت ہوتی ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ شہید ہونا آسان ہے۔ لوگ چھپاتے پھرتے ہیں اپنے آپ کو، چوری سے نکلتے ہیں، مسلمان ہونا ظاہر نہیں کرتے۔ ہم نے اسی ہنگامہ میں طول طویل سفر کر ڈالا، اِسی پگڑی اور داڑھی سمیت۔ میں تھا اور میرے دو ساتھی تھے۔ انھیں حالات میں دیوبند اور دلی گئے اور پھر لکھنو اجودھیا ہوتے ہوئے واپس آئے۔ ہمیں تو کہیں کوئی چھیڑنے والا نہیں ملا۔ پانچوں

وقت کی نمازیں پڑھتے رہے نہ کہیں خوف محسوس ہوا نہ کہیں وحشت محسوس ہوئی۔ سنا ہے کہ بمبئی سے آتے ہوئے کسی نے کسی کو سلام کیا۔ اس نے جواب دیا، بس اس نے چھرا گھونپ دیا۔ کیوں کہ سلام کا جواب دینے سے پتہ چل گیا کہ یہ مسلمان ہے۔ اسی پسِ منظر میں بنارس کے پلیٹ فارم پر ہم لوگ کھڑے تھے۔ ایک آدمی پیچھے سے آیا اور سلام کیا۔ میں نے بے ساختہ 'وعلیکم السلام' کہا، پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں چھرا نہ مار دے۔ پھر میں نے سوچا کہ ہم لوگوں کے پاس تو پہلے ہی مسلمان ہونے کا پورا پورا بورڈ موجود ہے، سلام کرنے سے کیا نیا انکشاف ہوگا؟ اس نے پانی دم کرنے کے لیے ایک گلاس بڑھایا کہ پیٹ میں بہت درد ہورہا ہے۔ اسٹیشنوں پر یہ خطرناک کام ہے کہ پانی پر دم کر کے دیا جائے لیکن میں نے اللہ کا نام لے کر دم کر کے دیدیا۔ لیکن دل میں قدرے خدشہ تھا۔ میں دیکھتا رہا کہ کیا کرتا ہے؟ کہیں پی کر لوٹنے تو نہیں لگتا ہے۔ لیکن واقعی وہ درد کا مارا تھا، واقعی پریشان تھا، پانی پی کر چلا گیا۔

غرض کس بات کا ڈر؟ کس بات کی دہشت؟ اللہ کے اوپر جس کو بھروسہ ہوگا خدا تعالی سے جس کا صحیح رابطہ ہوگا، اس کو ڈر، دہشت سے کیا مطلب؟ اگر اس کی موت مقدر ہوگی تو آ کر رہے گی اسے کوئی روک نہیں سکتا۔

''اَیۡنَمَا تَکُوۡنُوۡا یُدۡرِکۡکُّمُ الۡمَوۡتُ وَلَوۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ بُرُوۡجٍ مُّشَیَّدَةٍ ''(سورة النساء آیة ۷۸)تم جہاں کہیں بھی رہوگے موت تمھیں پکڑ لے گی اگر چہ تم مضبوط قلعے میں رہو۔ اگر آدمی میدانِ جنگ میں ہو لیکن اس کی موت لکھی نہیں ہے تو اسے کوئی نہیں مار سکتا۔

حضرت خالد ابن ولید رضی اللہ عنہ کی تمنائے شہادت:

حضرت خالد ابن ولید رضی اللہ عنہ نے کتنی جنگوں میں شرکت کی، کتنی لڑائیاں لڑیں، اکیلے ہزاروں میں گھس پڑے لیکن موت میدانِ جنگ میں نہیں آئی۔ جب ان کا انتقال ہونے لگا تو فرمایا 'میں پوری زندگی موت کو میدانِ جنگ میں تلاش کرتا رہا مگر نہیں ملی۔

اب میں بستر پر پڑا مر رہا ہوں۔ تمنا تھی شہادت کی، مگر مقدر نہ تھی۔‘ تو جس کی جہاں موت لکھی ہوگی وہیں ہوگی۔ نہ اسلام کو چھپانے سے کوئی بات بننے والی ہے اور نہ گھر میں بیٹھنے سے۔ منافق کہتے تھے کہ ”لَوْ کَانَ عِنْدَنَا مَامَاتُوْا وَمَاقُتِلُوْا“ (سورۃ آل عمران آیۃ ۱۵۶) اگر یہ لوگ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے نہ قتل کیے جاتے۔ اللہ تعالیٰ جواب دیتے ہیں ” قُلْ لَوْ کُنْتُمْ فِی بُیُوْتِکُمْ لَبَرَزَ الَّذِیْنَ کُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰی مَضَاجِعِهِمْ“ (سورۃ آل عمران آیۃ ۱۵۴) تم کہہ دو کہ اگر تم لوگ اپنے گھروں میں ہوتے اور تمھاری موت مقدر ہوتی میدانِ جنگ میں، تو تم لوگ گھروں سے نکل کر میدانِ جنگ میں پہنچ جاتے اور وہاں مرتے۔ جہاں جس کی موت ہوگی وہاں وہ پہنچے گا:

دو چیز آدمی را کشد زور زور
یکے آب و دانہ دگر خاکِ گور

دو چیزیں آدمی کو بڑی تیزی سے کھینچتی ہیں۔ ایک تو آب و دانہ۔ دیکھیے ہمارا آب و دانہ یہاں مقدر تھا تو کھنچے چلے آئے۔ پیدا ہوئے تو کون جانتا تھا کہ نرملی کا آب و دانہ ہمارے نصیب میں ہوگا؟ دوسری چیز خاکِ گور ہے یعنی قبر کی مٹی۔ وہ بھی انسان کو کھینچتی ہے۔ جہاں جس کی موت مقدر ہوگی پہنچ کر رہے گا۔

اسلام کو ہر جگہ نمایاں رکھنا چاہیے:

غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ نعمتِ اسلام کی من جملہ قدردانیوں کے ایک قدردانی یہ ہے کہ ہر جگہ اسے نمایاں کیا جائے اور ہرگز کسی اندیشہ کو دل میں نہ لایا جائے۔ پٹنہ میں مَیں ہاتھ کے دھاگے والے قصہ سے متاثر تھا۔ اس کے بعد چند انگریزی داں نوجوان میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے، بہت محبت والے۔ کہنے لگے کہ ’مولانا! ہمیں کچھ نصیحت کیجیے۔‘ میں نے کہا کہ ’نصیحت تم لوگوں کے لیے یہ ہے کہ جس طرح اندر سے مسلمان ہو اسی طرح باہر سے بھی مسلمان ہو جاؤ۔ ماشاء اللہ کوئی کافر نہیں ہے لیکن باہر سے اکثر کافر ہو۔ شکل وصورت ایسی بنا رکھی ہے کہ مسلمان معلوم ہی نہیں ہوتے۔‘ جس ٹرین پر ہم سفر

کررہے تھے اس میں ہم تین آدمی نمایاں مسلمان تھے۔ اس میں ہم نے عصر کی نماز پڑھی، مغرب کی نماز پڑھی، عشا کی پڑھی، فجر کی پڑھی۔ ایک صاحب ہمارے پاس بیٹھے لوگوں سے باتیں کررہے تھے، ہم آخر تک نہیں سمجھ سکے کہ یہ بھی مسلمان ہیں۔ جاڑے کا موسم تھا، فجر کے بعد ہم لوگ بیٹھے ناشتہ کررہے تھے، وہ صاحب ہمارے پاس سے گزرے تو آہستہ سے ہمارے کان میں 'السلام علیکم' کہا۔ ہم نے کہا 'واہ صاحب ہم تو تین ہی تھے، یہ چوتھے حضرت بھی نکل آئے۔' وہ گھبرا کر بھاگے شاید سوچا ہو کہ دوسروں پر نہ ظاہر ہوجائے کہ وہ بھی مسلمان ہیں۔ لیکن کب تک چھپاؤ گے بھائی! وہ آدمی نمازی تھا۔ جب اس نے سر پر سے اونی ٹوپ اتارا تو پیشانی پر سجدے کا نشان صاف تھا۔ ہم نے کہا نمازی بھی ہے لیکن اس کو چھپا رکھا ہے۔ اس سے کیا فایدہ؟ دینِ اسلام چھپانے کی چیز نہیں ہے، ظاہر کرنے کی چیز ہے۔ وہ غریب سمجھ رہا تھا کہ مار کھا جاؤں گا۔

سیدنا ابوذر غفاریؓ کا اعلانِ اسلام:

میں آپ کو بتاؤں۔ حضرت سیدنا ابوذر غفاری نے اسلام قبول کیا اور حضور ﷺ سے عرض کیا کہ 'یا رسول اللہ! میں جا کر اپنے اسلام کا اعلان کرتا ہوں۔' آپ ﷺ نے فرمایا 'ابھی مت اعلان کرو، ابھی بہت ظلم ہورہا ہے۔' تو انھوں نے عرض کیا کہ 'نہیں میں مسلمان ہوگیا ہوں تو مجھے اس کا اظہار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔' چنانچہ مسجدِ حرام میں پہنچ کر برملا اپنے اسلام کا اعلان کردیا۔ کفار ان پر پل پڑے، بہت مارا۔ دوسرے دن پھر اعلان کیا، تیسرے دن بھی اعلان کیا۔ کفار نے بہت مارا حضور اکرم ﷺ کے چچا حضرت عباس نے بیچ میں آکر چھڑایا۔ یہ لوگ کب تک مارتے، آخر چھوڑ دیا اور حضرت ابوذر غفاریؓ کا ایمان و اسلام علی الاعلان ظاہر ہوکر رہا۔ حضور اکرم ﷺ نے ان کے ایمان و اسلام کی بہت تعریف فرمائی۔

اسلامی وضع و ہیئت میں اللہ نے رُعب رکھا ہے:

بھلا ہم اسلام جیسی نعمت کو کب تک چھپائیں گے؟ یہ ایسی چیز ہے کہ اس کو ہم

ظاہر کریں اور لوگوں کے سامنے علی الاعلان کہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ اور میں سچ کہتا ہوں اور ان بچوں سے بھی میں کہا تھا کہ 'اگر تم لوگ ظاہر سے بھی مسلمان ہو جاؤ تو تم لوگوں کی اتنی بڑی تعداد نظر آئے گی کہ دوسرے لوگ تمھارے سامنے نظر ہی نہ آئیں گے۔' آدمی داڑھی سے دوگنا ہو جاتا ہے۔ ہمارا ایک تنہا ایک آدمی نہیں ہے۔ اسلامی وضع اور ہیئت میں اگر دو تین آدمی کہیں چل رہے ہوں تو بہت معلوم ہوں گے۔ اس ہیئت میں اللہ تعالی نے ایک خاص رعب رکھا ہے۔ آپ ہی کے صوبہ میں ایک جگہ دُمکا ہے، وہاں میں تھا اور میرے ساتھ دس بارہ آدمی اور تھے۔ وہ جگہ خالص غیر مسلموں کی تھی، کوئی مسلمان وہاں آباد نہیں ہے۔ وہاں ایک مندر ہے، ہمیں ظہر کی نماز پڑھنی تھی۔ کوئی مناسب جگہ نہیں تھی البتہ مندر کا صحن خوب کشادہ تھا۔ اسی صحن میں ہم نے ظہر کی نماز ادا کی۔ نماز پڑھ کر باہر نکلے تو وہاں کا ایک ہندو جو سخت متعصب تھا، کہنے لگا کہ 'یہاں مسلمانوں میں کچھ دم خم نہیں ہے۔ یہ جو باہر سے اتنی بڑی داڑھی والے آتے ہیں وہی یہاں کے لوگوں کو ہمت دلاتے ہیں اور یہی یہاں گائے کی قربانی کراتے ہیں۔ ورنہ یہاں کے لوگوں میں کون سا دم خم ہے۔' میں نے سنا تو کہا 'سبحان اللہ! ہم یوپی میں تو کچھ کر نہیں پاتے یہاں آکر ہم طاقت بخشتے ہیں۔' لیکن بات یہ ہے کہ اسلامی وضع قطع رعب پیدا کرتی ہے۔ اور میں سچ کہتا ہوں یہاں جتنے لوگ بیٹھے ہیں اگر سب کے چہرے پر داڑھی ہوتی تو مجمع اتنا ہی نہیں معلوم ہوتا بلکہ بڑا مجمع معلوم ہوتا۔ ہندستان میں مسلمان جتنی تعداد میں ہیں اگر وہ سب اپنے یونی فارم میں آجائیں اور اپنی اصلی ہیئت میں آجائیں، اُس ہیئت میں جو ہمیں جناب رسول اللہ ﷺ نے بخشی ہے اور اللہ تبارک وتعالی نے جسے پسند کیا ہے تو یقین جانیے کہ پورے ملک میں مسلمان ہی مسلمان نظر آئیں۔ لیکن حال یہ ہے کہ بسوں میں جائیے، ٹرینوں میں جائیے، معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کوئی مسلمان ہے۔ اگر دو چار داڑھی والے ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پوری بس بھری ہوئی ہے۔ اس وقت کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ کچھ بولے۔ مجھے تو بارہا تجربہ ہوا ہے۔ میں اکیلا کسی بس میں بیٹھ گیا ہوں تو کسی کی

ہمت نہیں ہوئی ہے کہ مسلمانوں کی خلاف کچھ بولے۔ اس لیے کہ سب ڈرتے ہیں کہ اگر کچھ بولے تو یہ آدمی خطرناک معلوم ہوتا ہے چھوڑے گا نہیں، کچھ نہ کچھ ضرور کہے گا۔ اِسی ۶ /دسمبر کے فوراً بعد یعنی دو تین دن ہی کے بعد میرا ایک ہلکا پھلکا سفر ہوا۔ مدرسہ سے میرا گھر قدرے فاصلہ پر ہے۔ میں گھر آیا اور ایک روز کے بعد مدرسہ واپس جا رہا تھا۔ اس وقت تقریباً ہر بڑے شہر میں کرفیو تھا۔ سفر بہت مخدوش ہو چکا تھا۔ عموماً آمد و رفت بند تھی۔ میں ایک جگہ رکشہ سے اترا ایک سرکاری بس وہاں آکر رکی، عموماً اس جگہ بسیں رکتی نہیں ہیں۔ چوں کہ بس بالکل خالی تھی، اس کے ڈرائیور نے مجھے رکشہ سے اترتے دیکھا تو از خود رک کر پوچھا کہ ’چلیں گے؟‘ میں نے کہا ’ہاں‘ یہ کہہ کر میں بس پر سوار ہو گیا۔ دیکھا تو کل آٹھ مسافر تھے اور وہ بھی سب سہمے ہوئے۔ میں نے ایک نگاہ ڈالی تو صرف ایک صاحب مختصر سی داڑھی سے مسلمان معلوم ہو رہے تھے۔ وہ اور زیادہ خایف تھے۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا کہ ’مولانا! آگے جگہ ہے بیٹھ جایئے۔‘ حالاں کہ ان کے پاس بھی جگہ تھی۔ خیر میں آگے بیٹھ کر ایک کتاب کے مطالعہ میں محو ہو گیا۔ میرا دھیان بھی کسی طرف نہیں گیا۔ جہاں اترنا تھا اتر گیا۔ اور ایک رکشہ پر بیٹھ کر آگے جانا چاہا تو وہ بھی ساتھ ہو گئے۔ وہ اس قدر خوف زدہ تھے کہ ہر آدمی کو شبہ کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ رکشہ والا ہندو تھا، اس لیے سائیں سائیں گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے بلند آواز سے کچھ کہنا چاہا تو گھبرا گئے، مگر میں ان کی پرواہ کیے بغیر کہنا شروع کیا کہ ’آپ ڈرتے کیوں ہیں؟ یہیں ہم کو رہنا ہے، یہیں ہم کو مرنا جینا ہے۔ اب تو کوئی حکومت ہم کو قبول نہیں کرے گی۔ آپ ہجرت کر کے پاکستان چلے جایئے، آپ عرب و عجم چلے جایئے، کوئی بھی قبول نہیں کرے گا۔ جب یہیں رہنا ہے تو ڈر دہشت بے جا ہے۔ البتہ فساد مت کیجیے، ہنگامہ مت کیجیے، کسی کو ناحق مت ماریئے، کسی کا مال نہ لوٹیے۔ لیکن بزدلی بھی مت دکھایئے۔ قوی دل رکھیے، مضبوط دل رکھیے تو ہاتھ پاؤں بھی مضبوط ہوں گے۔ اگر دل کمزور ہوگا تو ہاتھ پاؤں بھی کمزور ہوں گے۔ خدا پر بھروسہ رکھیے، اگر اللہ نہیں چاہیں گے تو کوئی نقصان نہیں

پہنچا سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ کسی کو نقصان پہنچانا ہی چاہیں تو کوئی بچا نہیں سکتا۔ وہ بیس آدمی کی حفاظت میں ہو تب بھی ہلاک ہو جائے گا۔ ابھی کتنے دن کی بات ہے کہ ہمارے ملک کی ایک وزیر اعظم کتنی حفاظت میں تھی، لیکن اس کے محافظوں نے ہی گولی ماردی۔ لہٰذا ہرگز ڈرنا نہیں چاہیے، اپنے اسلام کو اپنے اوپر نمایاں کر کے رہنا چاہیے۔ اگر کسی وقت کوئی آفت آئے گی اور مسلمان ہونے کی وجہ سے آئے گی اور ہم قتل کر دیئے جائیں گے تو یقین رکھیے کل میدانِ قیامت میں ہم ہوں گے اور اللہ کے نام پر کٹی ہوئی ہماری گردن ہوگی اور قاتل کا دامن ہوگا۔

شہید کا اجر:

حدیث میں ہے کہ جب گردن خدا کے نام پر کٹتی ہے تو مقتول قیامت کے دن اپنی گردن اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے آئے گا، خون کا فوارہ اچھل رہا ہوگا، اس سے مشک جیسی خوشبو آتی ہوگی، اسی حالت میں وہ دربارِ خداوندی میں پہنچے گا اور اس آدمی کو لے کر پہنچے گا جس نے اس کو قتل کیا ہوگا۔ دس بیس آدمی اس کے قتل میں شریک ہوں گے تو سب کا دامن گھسیٹتا ہوا پہنچے گا اور کہے گا کہ 'بار الٰہا! میں کس جرم میں قتل کیا گیا؟ ان سے پوچھیے کہ میں نے کون سا جرم کیا تھا؟' اور اللہ تعالیٰ کو اس پر پیار آجائے گا۔ اس کی گردن جوڑ کر جنت میں بھیج دیں گے اور قاتلوں کو جہنم میں پھینک دیں گے۔ اس سے بڑی کیا خوش نصیبی ہوگی کہ انسان خدا کی راہ میں اور خدا کے نام پر مارا جائے۔ شہادت سے بہتر کوئی موت نہیں۔'

جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''مَن مَّاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ نَفْسَه بِالْغَزْوِ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِنْ نِفَاقٍ'' (ابوداؤد عن ابی ہریرۃ ﷺ) جو شخص مرگیا اور اس نے نہ جہاد کیا اور نہ ہی کبھی اس کی تمنا کی تو وہ نفاق کی قسموں میں سے ایک قسم پر مرا۔

یعنی اس آدمی میں نفاق ہے جس آدمی کو اللہ کے راستے میں شہادت کی تمنا نہیں ہے اور وہ راہِ خدا میں شہید ہونا نہیں چاہتا۔ بھائیو! ہم لوگوں کو شہادت کے مواقع دستیاب

نہیں ہیں اگر اس کی کبھی مبارک گھڑی آجائے تو بہادری کے ساتھ اس عظیم دولت کا استقبال کرنا چاہیے۔ بس شرط یہ ہے کہ ہم خود فساد نہ کریں، ہماری طرف سے کوئی زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن اگر کوئی فسادی چڑھ آئے تو اس کو چھوڑنا بھی نہیں چاہیے۔

ایک عجیب دعا:

بہرحال یہ بات ضمناً نکل آئی جو پھیلتی چلی گئی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم لوگوں نعمتِ اسلام کی جو دولت بخشی ہے اس کی قدردانی یہ ہے کہ ہم اس کو اپنے عمل سے بھی ظاہر کریں، شکل وصورت سے بھی ظاہر کریں۔ لیکن ہم سے کچھ نہیں ہوتا۔ دوسری چیزوں پر شکریہ کی توفیق مل جاتی ہے لیکن اسلام کی صورت میں جو احسان ہم پر ہوا ہے اس پر شکریہ ادا نہیں ہو پاتا۔

اللہ کے رسول ﷺ نے ایک عجیب دعا امت کو تعلیم فرمائی ہے۔ اس دعا کی وجہ سے سچ پوچھیے تو کم از کم زبان سے نعمتِ اسلام کا بھی شکریہ ادا ہوجاتا ہے۔ وہ یہ کہ ہم کھانا کھاتے ہیں اور کھانے کا شکر ادا کرتے ہیں، اس لیے کہ کھانا من بھائی چیز ہے۔ اس پر تو شکر ادا کرنا ہی ہے۔ شکریہ کے لیے رسول اللہ ﷺ نے جو الفاظ تعلیم فرمائے ہیں وہ یہ ہیں:

”اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِّی اَطْعَمْنَا وَسَقَانَا وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ“ (ترمذی عن ابی سعید الخذری رضی اللہ عنہ) تمام تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہم کو کھلایا پلایا اور جس نے ہم کو مسلمان بنایا۔ کھانے کے ساتھ مسلمان ہونے پر بھی حضور ﷺ نے شکریہ ادا کیا۔ یہ اور بات ہے کہ ہم عربی نہ سمجھنے کی وجہ سے اسے نہ جان سکیں۔ اگر وہ اس طرح سے شکریہ کے الفاظ نہ تجویز کردیے ہوتے تو ہم شاید زبان سے بھی اس کا شکریہ نہ ادا کر سکتے۔ بلکہ اس کا خیال ہی نہ آتا کہ اسلام بھی کوئی نعمت ہے۔ غرض کھانے پینے کے ضمن میں ایک لفظ جوڑ دیا ” وَجَعَلْنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْن “ کہ ہم کو مسلمان بنایا۔ اگر استحضار کے ساتھ یہ دعا پڑھی جائے تو کھانے پر بھی شکر ادا ہو، پینے پر بھی ادا ہو اور مسلمان ہونے پر بھی ادا ہو۔ حضور ﷺ نے سب کا انتظام کردیا ہے، ہم لوگوں سے تو کچھ نہ ہوتا۔ واقعی نبی کی شفقت

ایسی ہی ہے کہ جو گوشہ ہماری نگاہ سے مخفی رہ سکتا تھا ایسی سب جگہ انگلی رکھ دی ہے۔ اس پر بھی ہم غافل رہ جائیں تو ہم سے بڑا ناشکرا کون ہوگا؟

خشیتِ خدا اور قلب وزبان کی اصلاح ضروری ہے:

بہر حال اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کی نعمت بخشی اور ہماری ہدایت کے لیے قرآن کریم نازل فرمایا اور قرآن کریم میں تمام احکام بیان فرمادیے۔ من جملہ ان کے ایک آیت وہ بھی ہے جو میں نے ابتدا میں پڑھی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ”یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰہَ “ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، دل میں خوف پیدا کرو۔ جب خدا کا خوف پیدا ہوگا تو دل بن جائے گا، جب دل بن جائے گا تو ہمارے سارے اعمال بن جائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”اَلَا اِنَّ فِی الْجَسَدِ لَمُضْغَةٌ۔ اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ۔ اَلا وَهِیَ الْقَلْبُ“ (اخرجه البخاری فی الصحیح) سن لو! انسان کے جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے۔ اگر وہ بن جائے تو سب بن جائے۔ اگر وہ بگڑ جائے تو سب بگر جائے۔ اور سن لو! کہ وہ دل ہے۔ دل کا بناؤ کس سے ہے؟ دل کا بناؤ اللہ کے خوف سے ہے۔ خدا کا خوف پیدا کرو، تاکہ تمھارا دل بنے۔ ”وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا“ اور زبان کو صحیح استعمال کرو۔ اس سے کوئی غلط بات نہ بولو، کسی کو ایذا مت پہنچاؤ، جھوٹ نہ بولو، غیبت نہ کرو، اپنی زبان کو سنبھالو، دل کو سنبھالو۔ یہ دونوں چیزیں تم سنبھال لو، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ”یُصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ “ اللہ تمھارے کاموں کو درست کردیں گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمھیں اچھے اور کارآمد اعمال کی توفیق بخشیں گے اور تمھارے بگڑے کاموں کو بنادیں گے۔ ” وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ“ اور تمھارے گناہوں کو معاف کردیں گے۔

دو کام وہ ہم سے چاہتے ہیں۔ دو کام وہ خود کردیں گے۔ ہم سے چاہتے ہیں کہ ہم اپنے اہتمام سے دل کو ٹھیک کریں۔ وہ کیا کریں گے؟ ہمارے کاموں کو درست کردیں گے اور ہمارے گناہوں کی مغفرت فرمادیں گے۔ بگڑے ہوئے کام بنیں تو دنیا کا نظام

ٹھیک ہوگا۔ اور مغفرت کا پروانہ حاصل ہو تو آخرت کا نظام درست ہو جائے گا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں" وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا" جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ کامیابی یہی ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کی جائے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔ آمین

❑❑❑

مشکلات کا حل: تقویٰ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہ وَنَسْتَعِیْنُہ وَنَسْتَغْفِرُہ وَنُؤمِنُ بِہ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہ وَ مَن یُّضْلِلْہ فَلَا ھَادِیَ لَہ۔ وَنَشْھَدُ اَن لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہ لَا شَرِیْکَ لَہ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہ وَرَسُوْلُہ اَرْسَلَہ بِالْحَقِّ بَشِیْراً وَّنَذِیْراً۔ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہ وَاَصْحَابِہ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً۔ اَمَّا بَعْدُ:

فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمان الرحیم

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰہَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوْا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۱۸) وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوْا اللّٰہَ فَاَنْسَاھُمْ اَنْفُسَھُمْ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ (۱۹) لَا یَسْتَوِیْ اَصْحَابُ النَّارِ وَاَصْحَابُ الْجَنَّۃِ اَصْحَابُ الْجَنَّۃِ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ (۲۰) [سورۃ الحشر]

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو۔ اور چاہیے کہ ہر شخص دیکھ لے جو کچھ اس نے کل کے لیے آگے بھیجا ہے۔ اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ باخبر ہے ان کاموں سے جو تم کر رہے ہو۔ اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہونا جو اللہ کو بھول گئے، تو اللہ نے ان کی جان بھلا دی۔ وہی لوگ فاسق ہیں۔ جنت والے اور جہنم والے برابر نہیں ہو سکتے۔ جنت والے ہی کامیاب ہیں۔

موضوعِ زندگی:

مومن کی زندگی کا موضوع اور اس کی ساری کوشش کا محور ہی اللہ کو راضی کرنا

ہے۔ اگر کل قیامت میں اللہ نے اپنی رضامندی کا اعلان کر دیا تو اس کی زندگی سُوارَت ہوگئی، اور اگر اللہ ناراض ہوگئے تو اس نے اپنی زندگی کھودی، چاہے وہ کتنی ہی لمبی عمر پائی ہو اور کتنا ہی کامیاب نظر آرہا ہو۔ اس موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے ہر ایک کو کوشش کرنی چاہیے۔ یہ دنیا دار العمل ہے، جس کا صلہ ہمیں دوسری دنیا میں کامل و مکمل مل کر رہے گا۔ اللہ نے اس موضوع کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور جن چیزوں سے اللہ کی رضامندی حاصل ہوتی ہے، اور جس سے اللہ ناراض ہوتے ہیں، سب کو کھول کھول کر بیان کر دیا ہے، تا کہ کوئی چیز ڈھکی چھپی نہ رہے۔

سب کو اللہ کے بتلائے ہوئے راستے پر چلنا ہے، مگر اس پر چلنے میں رکاوٹیں بہت ہیں۔ بے شمار رکاوٹیں ہیں جو آدمی کو اللہ کی رضامندی حاصل کرنے سے روکتی ہیں۔ ایک بڑی رکاوٹ تو آدمی کا خود اپنا نفس ہے، اور پھر شیطان ہر وقت اسی تاک میں لگا رہتا ہے کہ آدمی اللہ کی نافرمانی کرتا رہے۔ پھر ان دونوں کے اکٹھا ہونے کی وجہ سے کائنات کی بے شمار چیزیں رکاوٹ بنتی ہیں۔ اسی لیے مجاہدہ کرایا جاتا ہے، تا کہ آدمی کو ان ساری رکاوٹوں کے باوجود اللہ کی مرضیات پر چلنے اور اس کی رضامندی حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ اب جس نے ایسا کرلیا اس کے لیے خوشی ہی خوشی ہے، آرام ہی آرام ہے۔ اور جو ایسا نہیں کرسکا اس کے لیے شرمندگی اور پریشانی ہے۔

ہماری ذمہ داری اللہ کے احکام کو پورا کرنا ہے:

یہ ایمان والوں کا موضوع ہے، جسے بھول کر آدمی بھٹکتا رہتا ہے، اور دوسری ایسی چیزوں میں مشغول ہوجاتا ہے جن کی ذمہ داری اللہ نے لے رکھی ہے۔ سب سے اہم تو روزی روٹی کا مسئلہ ہے۔ اللہ فرماتے ہیں ”وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِى الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا“ (سورہ هود آية ٦) اور زمین پر چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ نے اپنے ذمے نہ رکھا ہو۔

اللہ نے رزق کی ذمہ داری لے رکھی ہے۔ پھر یہ بھی طے ہے کہ کسے کتنی روزی

ملنی ہے۔ مگر جس کی کفالت اللہ نے لے رکھی ہے، اس میں پڑ کر آدمی اللہ ہی کو بھول جاتا ہے۔ ہماری ذمہ داری تو اللہ کے احکام کو پورا کرنا ہے۔ نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا" وَأْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى" (سورة طه آیة ۱۳۲) اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو، اور خود بھی اس پر ثابت قدم رہو۔ ہم تم سے رزق نہیں چاہتے۔ رزق تو ہم تمھیں دیں گے۔ اور بہترین انجام تقوی ہی کا ہے۔

ہماری ذمہ داری ہے کہ احکام کو دل و جان سے پورا کریں۔ ہمارا کام اللہ تعالی بناتے رہیں گے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اپنا کام خود نہیں کریں گے تو بنے گا ہی نہیں، پھر اس میں مشغول ہو گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ ہم پریشان ہو گئے اور سب کچھ چھوٹ گیا۔

تین کام:

سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی نے مختصر لفظوں میں بڑے کام کی بات بیان فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں' ہر مومن کو ہر وقت اللہ کے احکام کے متعلق تین کام کرتے رہنا چاہیے۔

۱۔ ہر وقت اللہ کا کوئی نہ کوئی حکم پورا کرتا رہے یہ سمجھ کر کہ اللہ کا حکم ہے۔ نیت بالکل صاف رہے حتی کہ کوئی کام طبیعت کے تقاضے سے نہیں بلکہ اس لیے کرے کہ اللہ کا حکم ہے۔ خوش اخلاقی سے پیش آنا، گھر والوں سے مسکرا کر ملنا، اچھا سلوک کرنا، یہ سب اس لیے کرے کہ اللہ کا حکم ہے، اور نبی پاک ﷺ کا طریقہ ہے۔

۲۔ ہر وقت اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں سے باز آتا رہے۔ جھوٹ، غیبت، بدخواہی، چغل خوری، غرض ہر وقت کسی نہ کسی منہیات سے رکتا رہے کہ یہ اللہ کا حکم ہے، عزت و خاندان کا مسئلہ نہیں ہے، صرف اللہ کا حکم ہے۔ یہ ذہن میں آئے ہی نہیں کہ جھوٹ بولیں گے، غیبت کریں گے، اور لوگوں کو پتہ چل جائے گا تو ناک کٹ جائے گی، عزت خاک میں مل جائے گی، لوگ کیا کہیں گے۔ دنیا کیا کہتی ہے، کیا نہیں کہتی ہے اس سے کوئی سروکار نہیں، بس اللہ نے منع کیا اس لیے ہم نہیں کریں۔

۳۔ اللہ کے تمام فیصلوں پر دل و جان سے راضی رہے۔ ہر وقت اللہ کا کوئی نہ کوئی

فیصلہ آتا رہتا ہے، ہر فیصلہ پر دل و جان سے راضی رہے۔

امر دو طرح کے ہوتے ہیں:

یہ فیصلے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو احکام کا نزول۔ یعنی کسی کام کے کرنے کا حکم دیا، یا کسی کام کے نہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ احکامات تشریعی ہیں۔ نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، صدقہ دینا، دوسروں کے حقوق کو ادا کرنا، مَنہیات سے باز رہنا، یہ سب اللہ کے احکامات ہیں، جسے ذمہ داری کے ساتھ ادا کرنا ہے۔ کرنے والی چیزوں کو ذمہ داری کے ساتھ کرنا ہے، اور باز رہنے والی چیزوں سے باز رہنا ہے۔

احکام کو صرف ادا کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اس پر دل سے راضی بھی رہنا ہے۔ یہ نہیں کہ کرنے کو تو کرلیا مگر دل میں یہ خیال آرہا ہے کہ کیوں اللہ نے حکم دیدیا ہے؟ نہیں دیتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ ایسا نہیں بلکہ دل سے راضی رہنا ہے۔ دعاے ماثورہ ہے: ”رَضِیتُ بِاللّٰہِ رَبّاً وَبِالْاِسْلَامِ دِیْناً وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلاً“ (ابوداؤد) میں اللہ کے رب ہونے، اسلام کے دین ہونے اور محمد ﷺ کے رسول ہونے پر راضی ہوں۔

اور کچھ احکام تکوینی ہیں جو ہمارے قابو کے نہیں۔ دھوپ کی تیزی، ہوا کی ٹھنڈک، بارش، بیماری و آفات کی مشکلات اور حوادثات۔ یہ احوال بھی اللہ کی طرف سے ہیں، خود سے نہیں آتے۔ آدمی ان تمام چیزوں پر بھی دل سے راضی رہے، اور شکایتیں نہ کرنے لگے کہ یہ مصیبتیں ہم پر کیوں آتی ہیں؟ ہاں یہ مصیبت ہے، اس لیے اللہ سے دعا بھی کرتا رہے کہ 'یا اللہ! اس مصیبت کو ہٹا دیجیے'، مگر اس پر دل سے راضی رہے کہ یہ بھی اللہ کا بھیجا ہوا ہے۔ یہ بڑی اہم بات ہے کہ تکلیف دور ہونے کی دعا بھی کرے اور اس پر راضی بھی رہے۔ خلاصہ یہ کہ اللہ کا جو بھی فیصلہ ہو، تکوینی یا تشریعی اس پر دل سے راضی رہے۔

حکم کا پورا نہ کرنا حکم سے ناراضی کی دلیل ہے:

اکثر انسان اللہ سے بے انتہا ناراض ہیں۔ نماز کا حکم ہے، اس پر کتنے لوگ راضی ہیں؟ نماز نہ پڑھنا یہ اس حکم سے ناراضگی کی دلیل ہے۔ اگر اس سے راضی ہوتا تو

دل وجان سے اسے ادا کرتا۔ اللہ نے سود لینے سے منع کر دیا، اب سود خور اللہ کے حکم سے ناراض ہو گئے۔ آدمی احکامِ شرع میں بھی ناراض ہے، اور احکامِ تکوین میں بھی راضی نہیں۔ بکتا رہتا ہے کہ یہ کیا مصیبتیں اور پریشانیاں آگئیں؟ حضرت شیخ نے فرمایا کہ 'ہر حال میں اللہ سے راضی رہیں۔' اگر اللہ ناراض ہو جائے تو انھیں ناراض ہونے کا حق ہے، ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ہم اللہ سے ناراض ہوں۔

بندوں کا وظیفہ اطاعت اور راضی رہنا ہے:

ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ 'ہم کیسے جانیں گے کہ اللہ ہم سے راضی ہے؟' فرمایا کہ دیکھو 'تم اللہ سے راضی ہو کہ نہیں؟ اگر تم راضی ہو تو وہ بھی راضی ہے۔' شیخ عبدالقادر جیلانی فرماتے ہیں کہ 'تمھارے اوپر مصیبتیں اس لیے آتی ہیں کہ تم اللہ سے ناراض ہو، جس کی وجہ سے اللہ ناراض ہوتا ہے۔ اور اللہ کی ناراضگی کی وجہ سے مصیبتیں آتی ہیں۔ تم دل وجان سے اللہ سے راضی رہو، جیسے بھی حالات ہوں، اللہ سے راضی رہو۔ ہاں دعا کرو، دعاؤں کا راستہ نبی نے کھول رکھا ہے، لیکن ناراضگی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اسے ہی کہتے ہیں رضا بالقضا۔ اور یہ ہمارا وظیفہ ہے، اگر ہم کرتے ہیں تو اللہ کی طرف سے راحتیں آئیں گی۔

آج دنیا والے کتنے پریشان ہیں، جسے دیکھو اپنی پریشانی گنائے چلا جا رہا ہے، جہاں تہاں شکایتیں کرتا پھر رہا ہے۔ ان ساری شکایتوں کی تان اللہ کی طرف ٹوٹتی ہے۔ ارے بھائی! تم اللہ کا کام کرو، اللہ تمھارا کام کرے گا۔ ''مَنْ كَانَ لِلّٰهِ كَانَ اللّٰهُ لَهٗ'' جو اللہ کا ہو جاتا ہے، اللہ اس کے ہو جاتے ہیں۔

تو کام بانٹیے اور اللہ کا حکم پورا کیجیے۔ اللہ نے جن کاموں کو اپنے ذمہ لے رکھا ہے، اسے انھیں کے ذمہ رہنے دیجیے، اس کی فکر آپ نہ کیجیے۔ اللہ اسے اس طرح پورا کریں گے کہ آپ کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔

آیت میں یہی بات بیان کی گئی ہے کہ 'اے ایمان والو! جب تم اللہ کو مان چکے

ہوتو اب اللہ سے ڈرو، اوران کاموں سے بچتے رہو جس سے اللہ کی ناراضگی آتی ہے۔ اللہ تعالی تمھارا کام بناتے رہیں گے۔ "مَن يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَل لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْراً۔" (سورة الطلاق آية ٢) اور جو اللہ کا تقوی اختیار کرے گا اللہ اس کے لیے راستہ پیدا کردیں گے۔

بے سان وگمان رزق کا انتظام:

شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری ایک بار فجر کی نماز پڑھ کر تفریح کے لیے نکلے۔ اچانک ایک گاڑی آکر رکی، لوگ اترے اور سلام ومصافحہ کے بعد کہنے لگے کہ 'ہم لوگ دہرادون سے آرہے ہیں، راستہ میں ایک شیر نظر آیا۔ ہم ہاتھ بجانے لگے کہ وہ بھاگ جائے مگر وہ نہیں بھاگا۔ قریب گئے تو دیکھا کہ وہ نیل گائے ہے، پھر ہم نے بھگایا مگر وہ نہیں بھاگی۔ بالآخر ہم نے اسے پکڑ لیا۔ ایک ٹرک آرہا تھا، ہم نے ٹرک والے سے چھری لی اور ذبح کیا اور گوشت بنا کر آپ کی خدمت میں لے آئے ہیں۔' یہ سن کر حضرت فرماتے ہیں کہ 'میرے مالک کا کتنا بڑا احسان ہے کہ آج فلاں فلاں بزرگ میرے گھر تشریف لانے والے ہیں، اور گوشت کا انتظام نہیں تھا۔ میں نے دعا کی اور اللہ نے بھیج دیا۔' یہ وہ روزی ہے جس کا کوئی وہم وگمان بھی نہ تھا مگر اللہ نے تقوی کی بنیاد پر بھیج دیا۔

اللہ کو راضی کرنا سب سے ضروری ہے:

سیدنا عبداللہ بن مبارک نے 'کتاب الزہد' میں ایک روایت نقل کی ہے کہ جب کوئی نیک بندہ اللہ سے دعا کرتا ہے 'یا اللہ! فلاں کی مصیبت ٹل جائے۔' تو اللہ فرماتے ہیں کہ 'اپنے لیے دعا کرو تو قبول کروں گا، اس کے لیے مت کرو۔ اس نے مجھے ناراض کررکھا ہے۔' معلوم ہوا کہ اللہ کو راضی کرنا بہت ضروری ہے۔ اللہ فرماتے ہیں "اُدْعُوْنِىْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ" (سورة مومن آية ٦٠) مانگو، میں قبول کروں گا۔ "اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِىْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِىْ" (سورة البقرة آية ١٨٦) جب مجھے

کوئی پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں۔ لہٰذا وہ بھی میری بات دل سے قبول کریں اور مجھ ایمان لائیں۔

شیخ عبدالقادر نے فرمایا کہ 'جواب دینا دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ بندہ نے پکارا اور اللہ نے فرمایا کہ 'ہاں بندہ! میں نے سن لیا۔' اور ایک ہے قبول۔ بندہ نے جو کچھ مانگا، وہ مل گیا۔' اللہ فرماتے ہیں کہ میں جواب دیتا ہوں، لہٰذا مجھ پر یقین رکھو اور میری بات مانو۔ جب خدا راضی تو پھر مانگ کیا مانگتا ہے۔ "سَلُ تُعطَ" مانگو، ملے گا۔ لیکن ہم نے راضی ہی نہیں کیا تو ہمیں کیا ملے گا؟

تقوی پر خدا کے وعدے:

سب سے بڑی چیز ہے کہ آدمی تقوی اختیار کرے، اور ہر حال میں اللہ کو راضی رکھے۔ قرآن میں بے شمار جگہ موجود ہے "هُدًى لِلْمُتَّقِينَ" (سورۃ البقرۃ آیۃ ۲) ہدایت ہے متقیوں کے لیے۔ کہیں ہے "اُعِدَّتُ لِلْمُتَّقِينَ" (سورۃ آل عمران آیۃ ۱۳۳) جنت متقیوں کے لیے بنائی گئی ہے۔ تقوی پر اللہ کا وعدہ ہے، بلا وہم وگمان روزی دیتے ہیں "يَرُزُقُهُ مِنُ حَيُثُ لَا يَحُتَسِبُ" (سورۃ الطلاق آیۃ ۳) اور اسے (متقی کو) ایسی جگہ سے رزق عطا کرے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوگا۔ کاموں کو آسان کر دیتے ہیں۔ "وَمَن يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجُعَل لَّهٗ مِنُ اَمُرِه يُسُراً" (سورۃ الطلاق آیۃ ۴) اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کے کام میں آسانی پیدا کر دے گا۔ مشکلات کو دور کرتے ہیں "وَمَن يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجُعَل لَّهٗ مَخُرَجاً" (سورۃ الطلاق آیۃ ۲) اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کے لیے مشکل سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا۔

تقوی پر یہ اللہ کے وعدے ہیں۔ اسی طرح اللہ کا وعدہ ہے "وَمَن يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرُ عَنُهُ سَيِّاٰتِه وَيُعُظِمُ لَه اَجُرًا" (سورۃ الطلاق آیۃ ۵) اللہ تعالی غلطیاں معاف کر دیتے ہیں اور اجر عظیم عطا فرماتے ہیں۔ کتنے وعدے اللہ کے تقوی پر ہیں مگر ہمیں بھاری پڑتا ہے، حالانکہ اس کی جزا کے مقابلے میں یہ بہت آسان ہے، جب انعام اور

بدلہ بڑا ہوتا ہے تو بڑے سے بڑا کام بھی آسان ہو جاتا ہے۔

جزا اچھی ہو تو مشکل آسان ہو جاتی ہے:

ہم الٰہ آباد میں تھے، ایک بار مدرسہ کے مطبخ میں شوربہ بہت تلخ بنا۔ میں اس زمانے میں تلخ کا عادی تھا، مگر اس شوربہ کی تلخی اتنی زیادہ تھی کہ باوجود عادی ہونے کے ایک لقمہ میں مجھے پسینہ آ گیا۔ میں نے دوبارہ اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ دوسرے سالن سے کھانا کھایا۔ ایک طالب علم کمرے میں آیا، اس سے پوچھا کہ 'کھانا کھائے۔' اس نے کہا 'ہاں' ہمارے دوست وہیں بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے اس سے کہا کہ 'یہ شوربہ پی جاؤ تو ہم ایک شاہی ٹکڑا انعام دیں گے۔' مگر وہ شوربہ کی تلخی کی وجہ سے جھجھکا، ایک صاحب نے کہا کہ 'شوربہ کی تلخی کیا دیکھتا ہے؟ ادھر کی مٹھاس بھی تو دیکھ!' بس صاحب! وہ پیالہ اٹھایا اور غٹاغٹ پی گیا۔ جزا اچھی تھی اس لیے یہ تلخ کام کر گیا۔ اسی طرح جب تقوی کی جزا ایسی زبردست ہو کہ اس کے عوض ہر مشکل کام کو آسان کر دیا جائے، برائیاں درگزر کر دی جائیں، بلا وہم وگمان روزی ملے، اجرِ عظیم عطا ہو، اتنے جزا کے مقابلے میں یہ کون سا مشکل کام ہے۔ اسے کرنے میں تو سراسر فایدہ ہے۔ دین کا تو ہے ہی، دنیا کا بھی فایدہ ہے، جس کے لیے ہمارا مرنا جینا ہو رہا ہے، مگر آدمی نے اسے مشکل بنا دیا ہے۔ کیوں کہ ہمارے دل میں اس کی اہمیت نہیں ہے۔

الغرض تقوی بہت اہم چیز ہے۔ تقوی ان تمام چیزوں سے بچنے کا نام ہے جس سے اللہ ناراض ہوتے ہیں۔ نماز چھوڑنا، جھوٹ بولنا، بداخلاقی، چوری، بدکاری ان تمام سے بچنے کی فکر کر لے تو بچنا کچھ مشکل نہیں ہے۔

حکومت اور تقوی:

ہم نے بچپن میں پڑھا تھا کہ ایک بادشاہ متقی تھا۔ کسی اللہ والے کو بڑا تعجب ہوا کہ بادشاہ اور متقی؟ آخر بادشاہت کے ساتھ تقوی جمع کیسے ہے؟ انھوں نے بادشاہ سے پوچھا تو بادشاہ نے کہا کہ 'چھوڑیے ان چیزوں کو، یہ بتلایئے کہ آپ نے ہماری بادشاہت

دیکھی ہے؟‘ انھوں نے کہا ’نہیں۔‘ بادشاہ نے کہا کہ ’ہم آپ کو اپنی بادشاہت کی سیر کراتے ہیں۔‘ ان کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ایک پیالہ دیدیا، ساتھ میں ایک جلاد کو مسلط کردیا کہ ’ایک قطرہ بھی اگر نیچے گرے تو گردن اڑا دینا۔‘ اب یہ صاحب بادشاہت کی سیر کو نکلے، بازاروں کی چہل پہل اور رونق کو کیا دیکھتے؟ ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہا کہ کہیں پانی نہ چھلک جائے؟ جب سیر سے واپس آئے تو بادشاہ نے پوچھا کہ ’کہیے! آپ نے سیر کرلی؟ سب کچھ دیکھ لیا؟‘ کہنے لگے کہ ’کیا دیکھتے، ہر وقت نظر اس پیالے پر رہی، کسی طرف نگاہ اٹھانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔‘ تب بادشاہ نے کہا کہ ’ہمارا بھی یہی حال ہے، ہم بھی اپنے دل میں ایمان سے بھرا ہوا ایک پیالہ رکھتے ہیں، اور ہر وقت اسی کی طرف ہمارا دھیان لگا رہتا ہے۔ دنیا کی ساری چیزیں برتتے ہیں مگر یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ ایمان کا یہ پیالہ کہیں ہل نہ جائے۔‘ اسی لیے کہا گیا ہے ”اَلَا اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةٌ۔ اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ۔ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ“ (اخرجه البخاری فی الصحیح) سن لو! انسان کے جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے۔ اگر وہ بن جائے تو سب بن جائے۔ اگر وہ بگڑ جائے تو سب بگڑ جائے۔ اور سن لو! کہ وہ دل ہے۔ جب دل ٹھیک ٹھاک رہتا ہے تو سب کچھ ٹھیک رہتا ہے۔ تو میرے بھائیو! دل کو سنوارو اور اس کی جو صفات ہونی چاہیے اسے پیدا کرو۔

کل کے لیے تیار رہنا چاہیے:

اللہ نے فرمایا کہ ’اے ایمان والو! تقوی اختیار کرو۔‘ مگر یہ ایک عام بات ہے، اور جب بات عام ہوتی ہے تو بسا اوقات عمل میں پریشانی ہوتی ہے۔ کسی سے آپ نے کہا کہ ’کوئی اچھی سی مٹھائی لاؤ‘، تو لانے والا پریشان ہوجائے گا کہ پتہ نہیں کون سی مٹھائی اچھی ہے جو آپ کی نظر میں بھی اچھی ہو؟ لیکن جب کہے کہ ’فلاں مٹھائی لاؤ‘ تو اب لانے والے کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اسی طرح جب بات عام ہوتی ہے تو اللہ تعالی کوئی خاص بات فرمادیتے ہیں تاکہ عمل میں پریشانی نہ ہو۔ اسی لیے فرمایا ”وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ

لِغَدٍ ‘‘، بس اسی خیال میں لگے رہو کہ کل کے لیے تم نے کیا بھیجا ہے؟ کل سے مراد دنیا کا کل نہیں، دنیا والوں کا کل تو آج ہی ہے، کل کیا کھائیں گے؟ کل کیا پہنیں گے؟ ہم سب کل کی فکر کرتے ہیں مگر آج والا کل ہوتا ہے، کل والا کل نہیں ہوتا، وہ سب دنیا کا کل ہے۔

خدا کا حکم سب پر مقدم:

اب یہ بڑا ٹیڑھا مسئلہ ہوگیا ہے کہ چار بیٹی ہوگئیں تو اب پریشان ہیں کہ شادی کیسے ہوگی؟ یہ اس لیے کہ آدمی اپنے ذمہ کام لے لیتا ہے۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ ’میں ریٹائرڈ ہوگیا ہوں، جس کی وجہ سے کچھ روپے ملے ہیں۔ میرا ارادہ حج کرنے کا ہے، اور میری دو بیٹیاں ہیں جن کی شادی کرنی ہے۔ ایک صاحب سے مسئلہ پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ شادی کرنا ضروری ہے، حج کرنا ضروری نہیں۔ پہلے بچیوں کی شادی کیجیے پھر دیکھا جائے گا۔‘ میں نے کہا ’بالکل غلط مسئلہ بتایا، حج پر قدرت ہونے کے بعد حج کرنا فرض ہوجاتا ہے۔ رہا شادی کا مسئلہ تو آج کل جس طرح اس میں فضول خرچیاں ہوتی ہیں وہ ضروری ہی کیا ہیں؟ جو حج کے لیے رکاوٹ بنیں۔‘ وہ صاحب تھوڑا پس و پیش کرنے لگے مگر میں نے انہیں سمجھایا کہ ’اللہ تعالی شادی کا انتظام فرمادیں گے، پہلے آپ اللہ کا حکم پورا کیجیے۔‘ خیر کسی طرح بات مان گئے، اور حج کرنے چلے گئے۔ پھر ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کہ ’کیسا رہا؟‘ کہنے لگے ’الحمدللہ حج بھی کرلیا اور دونوں بچیوں کی شادی بھی ہوگئی، اور کسی طرح کا کوئی قرض بھی نہیں لینا پڑا۔‘

میرے دوستو! اللہ کو راضی کرنے کے لیے جو کرنا ہو، اسے کرڈالو۔ اپنے کام کی فکر مت کرو کہ ہمارا مسئلہ کیسے حل ہوگا؟ بس اللہ پر ایمان اور یقین رکھو، اللہ اسے پورا کریں گے۔ ہاں اس کے لیے اللہ سے دعا کرنی ہے، پہلے گناہوں سے سچی توبہ کریں پھر اللہ سے مانگیں، پھر دیکھیے اللہ کس طرح عطا فرماتے ہیں۔

خدا کو راضی کرلیں تو ہر مشکل آسان ہے:

خواجہ فریدالدین عطار نے لکھا ہے کہ ایک چور نے چوری سے مکمل توبہ کرلی، اور

چوری کے تمام سامانوں کو اس کے مالک کو لوٹا تا رہا۔ جس کا مال ختم کر چکا تھا اور دینے کی استطاعت نہیں تھی، اس سے معافی طلب کرتا رہا۔ ایک یہودی کے پاس گیا کہ ’صاحب! میں نے آپ کا مال چُرایا تھا اور جن لوگوں کا مال میں نے چُرایا تھا سب کو واپس کر دیا ہوں، مگر آپ کے مال کو واپس کرنے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے۔ اس لیے مجھے معاف کر دیجیے۔‘ یہودی کہنے لگا کہ ’میں تو معاف نہیں کرتا، تمھیں میرا مال ابھی واپس کرنا ہوگا، اور میں تمھیں مہلت بھی نہیں دوں گا۔‘ اس نے قسم بھی کھالی۔ اب تو بڑی پریشانی ہوئی، نہ معاف کرسکتا ہے، نہ مہلت مل سکتی ہے، قسم کو پورا کرنا ہے۔ پھر یہودی نے کہا کہ ’اچھا ایک صورت ہے کہ قرض بھی ادا ہوجائے اور قسم بھی پوری ہوجائے۔ میں تمھیں قرض دیتا ہوں۔ اس کے ذریعے تم مجھ کو پچھلا قرض ادا کردو، اس سے قسم پوری ہوجائے گی اور یہ قرض بعد میں دیتے رہنا۔‘ چنانچہ یہودی نے ایک تھیلی دی جس سے ان صاحب نے قرض کی ادائیگی کردی۔ یہوی نے پورے روپے گن لیے، قرض ادا ہو چکا تو یہودی نے کہا کہ ’میں تمھارا یہ قرض معاف کرتا ہوں اور مسلمان ہوتا ہوں۔‘ اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا۔ یہ صاحب پریشان ہوئے کہ یہ کیا بات ہوئی؟ قرض کی معافی اور مسلمان ہونے کا کیا سبب پیش آ گیا؟ تو اس نے بتایا کہ میں نے اپنی مذہبی کتابوں میں یہ پڑھ رکھا تھا کہ امتِ محمدیہ ﷺ کا کوئی شخص سچی پکی توبہ کرتا ہے تو اس کے ہاتھ میں مٹی سونا ہوجاتی ہے۔ جب تم نے اپنی توبہ کا میرے سامنے تذکرہ کیا تو میں نے سوچا کہ اس کی آزمائش آج کر ہی لوں۔ دو کام ایک ساتھ ہوجائے گا، اس قول کی تصدیق بھی ہوجائے گی اور یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ واقعی تم نے سچی توبہ کی ہے۔ تو میں نے تمھیں مٹی دی تھی، جو تمھارے ہاتھوں میں سونا بن گئی۔ اس طرح تمھارے اوپر میرا کوئی قرض نہیں رہا۔

اس شخص نے سچی توبہ کی تو اللہ تعالی ایسی مدد فرمائی کہ قرض بھی ادا ہوگیا اور ایک شخص جہنم میں جانے سے بچ گیا۔ جب ہم اللہ کو راضی کریں گے تو اللہ تعالی ہمارا کام بنائیں گے۔ ہم پر حالات جو آتے ہیں یہ سب اس لیے ہیں ہم نے اللہ کو ناراض کر رکھا

ہے۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے ”لَا تَسُبُّوا الدَّھرَ فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الدَّھرُ“ (صحیح مسلم ومسند ابو یعلیٰ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ) زمانے کو برا بھلا مت کہو، کیوں اللہ ہی (صاحبِ) زمانہ ہے۔ سخت ٹھنڈ پڑ رہی ہے، تیز گرمی ہے۔ اب آدمی کہنے لگتا ہے سڑی ہوئی گرمی ہے۔ دہلی میں ایک سیدھے سادے بزرگ تھے، شاہ غلام علی صاحب، کسی کو بھی برا بھلا نہیں کہتے تھے۔ ان کی مجلس میں ایک صاحب نے کہہ دیا کہ ’سڑی ہوئی گرمی ہے۔‘ جلال آ گیا، فرمانے لگے کہ ’اس بے ادب کو یہاں سے نکالو، موسم اللہ کی طرف سے ہے اور یہ اعتراض کر رہا ہے۔‘

اصل مرکزِ نظر اللہ کی رضا:

اللہ نے فرمایا کہ ’ہر ایک کو یہ دیکھنا چاہیے کہ کل کے لیے اس نے کیا بھیجا۔‘ ہر دم ہمیں یہ دیکھ بھال کرنا ہے کہ جب ہم اللہ کے حضور جائیں گے تو کون سی چیز ایسی ہے جسے اللہ کے حضور پیش کریں گے؟ اگر آدمی دیکھتا رہا تو اس کا کام بن گیا۔ زمین نہیں لے جائیں گے، مال و دولت نہیں لے جائیں گے، ہاں اس میں اگر ہم نے اللہ کے احکام کو پورا کیا تو وہی لے جائیں گے۔

حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے بادل سے آواز سنی کہ ’اے بادل! فلاں کے کھیت میں بارش برسا۔‘ حکم ہوا، بادل چل پڑا۔ اس شخص کو بڑی حیرت ہوئی کہ آخر وہ کون شخص ہے کہ اس کے کھیت میں بارش برسانے کا حکم بادل کو مل رہا ہے۔ یہ بھی بادل کے پیچھے چل پڑا۔ دیکھتا ہے کہ ایک شخص اپنے کھیت میں پانی چلا رہا ہے، اسی کے کھیت میں تیز بارش ہوئی۔ اس نے نام پوچھا تو وہی نام تھا جو بادل سے سن رکھا تھا۔ اس نے پوچھا کہ ’آپ کیا کرتے ہیں؟‘ کھیت والے نے کہا کہ ’آخر آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟‘ اس نے بتایا کہ ’ہم نے آپ کا نام اس بادل میں سنا کہ آواز آئی کہ فلاں کی کھیتی میں پانی برساؤ۔‘ آخر اس خصوصیت کی وجہ کیا ہے؟‘ اس نے بتایا کہ ’میں اپنی پیداوار کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ ایک حصہ اپنے پاس رکھتا ہوں، ایک حصہ فقیروں میں خرچ

کرتا ہوں اور ایک حصہ اسی کھیتی میں لگا دیتا ہوں۔‘ تو اس نے کہا کہ ’بس یہی بات جس کی وجہ سے اللہ تعالی برکت دیتے ہیں۔‘

ہمارے یہاں دو صاحب نے گیہوں بویا۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ ہماری کھیتی بڑی اچھی ہے تو کسی نے کہا کہ دوسرے صاحب کی آپ سے زیادہ اچھی ہے، اور واقعی ایسا ہی تھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ ’آخر اس فرق کی وجہ کیا ہے؟‘ تو اس نے بتایا کہ ’آپ تو صرف فرض کی ادائیگی کرتے ہیں، عشر وغیرہ نکال دیتے ہیں۔ میرے یہاں اس کے علاوہ ایک اور مصرف ہے، یعنی میری پیداوار میں مہمانوں کا بھی حصہ ہوتا ہے۔‘

میرے دوستو! اللہ کی بات مانیے اور تقوی اختیار کیجیے، اس میں برکت ہوتی ہے۔ ہم اللہ کے احکام کو پورا کریں گے تو اللہ ہمارا کام بنائیں گے۔ اسی لیے ہمیں دیکھتے رہنا چاہیے کہ ہم نے کل کے لیے کیا بھیجا ہے، جو بھیج دیا وہ کام آئے گا۔

اول وآخر تقوی:

آگے فرماتے ہیں ”وَاتَّقُوْاللّٰہَ“ اور اللہ سے ڈرو۔ پہلے بھی کہا اللہ سے ڈرو، اور بعد میں بھی کہا اللہ سے ڈرو۔ اللہ کے کلام میں کیا کیا حکمتیں پوشیدہ ہیں، یہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔ اول وآخر تقوی کا حکم دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ابتدا وانتہا دونوں میں، یعنی کام شروع کرنے سے پہلے بھی اور ختم کرنے کے بعد بھی اللہ سے ڈرتے رہنا چاہیے کہ معلوم نہیں قبول ہوگا بھی یا نہیں؟ ”وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْاوَّقُلُوْبُھُمْ وَجِلَةٌ اَنَّھُمْ اِلٰی رَبِّھِمْ رٰجِعُوْنَ“ (سورة المومنون آیة ٦٠) اور وہ جو بھی عمل کرتے ہیں اسے کرتے وقت ان کے دل اس بات سے سہمے ہوتے ہیں کہ انھیں اپنے پروردگار کے پاس واپس جانا ہے۔ ان دونوں خوفوں کے درمیان جو کام ہوگا وہ ایک دم پکا ہوگا۔ ”وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّھِمْ سُجَّداً وَّقِیَاماً“ (سورة الفرقان آیة ٦٤) رات سجدے میں اور قیام میں گزار دیتے ہیں، اور جب صبح ہوتی ہے تو کہتے ہیں ”رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَھَنَّمَ“ (سورة الفرقان آیة ٦٥) ہمارے پروردگار! ہم سے جہنم کا عذاب دور فرما دے۔

"وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ" (سورة الذاريات آية ۱۸) یہ لوگ صبح کو استغفار کرتے ہیں حالاں کہ "كَانُوْا قَلِيْلًا مِنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ" (سورة الذاريات آية ۱۷) رات کو تھوڑا سوتے ہیں۔ یہ اپنی عبادت پر اتراتے نہیں ہیں بلکہ استغفار کرتے ہیں۔

اللہ کے لیے نماز:

سید احمد شہید کے متوسلین میں سید اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحی صاحب بڑے ہیں۔ ایک بار مولانا عبدالحی صاحب نے سید صاحب سے کہا کہ 'مجھے بھی نماز سکھا دیجیے، جیسی صحابہ کرام پڑھتے تھے۔' سید صاحب خاموش ہوگئے۔ جب شام ہوئی تو بلایا اور فرمایا کہ 'جائیے! اللہ کے لیے وضو کیجیے۔' اس طور سے فرمایا کہ ان کا پورا بدن تھرا گیا، جانے لگے تو پھر فرمایا کہ 'میں کہتا ہوں، جائیے! اللہ کے لیے وضو کیجیے۔' اس طرح تین مرتبہ بلایا اور اسی طرح فرمایا۔ جب وضو بنا کر آئے تو پھر تین بار فرمایا کہ 'جائیے! اللہ کے لیے دو رکعت نماز پڑھیے۔' ان کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ اس کے بعد جو نماز پڑھی تو لگا کہ عرشِ الٰہی ان کے سامنے ہے۔ نماز سے فارغ ہو کر احساس ہوا کہ شاید سورہ فاتحہ چھوٹ گئی ہے، پھر اسی طرح دو رکعت پڑھی، پھر نماز کے بعد احساس ہوا کہ کچھ چھوٹ گیا ہے، پھر دو رکعت کی نیت باندھ لی۔ اِس طرح سو رکعت پڑھ ڈالی، اور ہر بار یہی احساس ہوتا رہا کہ نماز صحیح نہیں ہو سکی۔ رات پوری گزر گئی تو سویرے استغفار کیا اپنی اِس کوتاہی پر کہ دو رکعت نماز صحیح سے ادا نہ ہو سکی۔ صحابہ کرام کی نماز ایسی ہی ہوتی تھی۔ پوری رات اللہ کی عبادت میں لگے رہتے تھے، اور جب صبح ہوتی تو اپنی کوتاہی کا احساس ہوتا کہ جو حق تھا وہ ادا نہ ہو سکا۔ "وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ" (سورة الذاريات آية ۱۸) اور وہ لوگ صبح کو استغفار کرتے ہیں۔

ہمارا کام تعمیلِ حکم ہے:

ایک بزرگ عبادت کر رہے تھے، ایک آواز آئی جسے ایک مرید نے سن لیا، آواز یہ تھی کہ 'چاہے جتنی عبادت کر لو قبول نہیں ہوگی۔' مرید نے پوچھ لیا کہ 'حضرت! جب قبول

ہی نہیں تو آخر اتنی محنت کی کیا ضرورت ہے؟‘ تو انھوں نے فرمایا کہ ’تم ہی بتاؤ، اس دَر کے علاوہ اور کہاں جائیں؟ ہمارا کام کرنا ہے، ہم کر رہے ہیں، قبول کرنا ان کا کام ہے۔ تم تین دن یہ آواز سنے اور اکتا گئے۔ میں تیس سال سے سن رہا ہوں، مگر گھبرایا نہیں۔‘ پھر آواز آئی:

قبول ست گرچہ ہنر نیست
جز ما پناہے دگر نیست

منٹوں میں تیس سال کی عبادت قبول ہوگئی۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ کی بات مانتے ہیں پھر ہم پر یہ مصیبتیں کیوں آتی ہیں؟ یہ کہہ کر گویا وہ اللہ پر احسان جتلا رہے ہیں۔

بہر حال ابتدا اور انتہا دونوں ہی میں اللہ سے ڈریں، اور اللہ نے فرمایا کہ ’’وہ تمھارے کاموں سے باخبر ہے۔‘‘ یہ ڈرنے کی چیز ہے، ہاں مگر امید بھی رکھنی چاہیے۔ اللہ نے بندوں کو بشارت دی ہے کہ ’’نَبِّئُنِیُ عِبَادِیُ عَنِّیُ اَنَا الُغَفُوُرُ الرَّحِیُمُ‘‘ (سورۃ الحجر آیۃ ۴۹) کہ میرے بندوں کو بتادو کہ میں بہت معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ’’وَاَنَّ عَذَابِیُ هُوَ الُعَذَابُ الُاَلِیُمُ‘‘ (سورۃ الحجر آیۃ ۵۰) اور یہ بھی بتادو کہ میرا عذاب سخت ہے۔

خلاصہ یہ کہ تقوی، پھر کاموں کی نگرانی، پھر اللہ سے ڈرتے رہنا کہ وہ ہمارے کاموں سے باخبر ہے۔ یہ استحضار انسان کو متقی بنادیتا ہے۔

اللہ ہمیں توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین

❑❑❑

۲۲ رشوال ۱۴۲۷ھ مطابق ۱۵ نومبر ۲۰۰۶ء بروز بدھ بعد نماز مغرب
بمسجد مدرسہ فلاح المسلمین گواپوکھر مدھوبنی بہار

خدا ورسول کی اطاعت

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُه وَنَسْتَعِيْنُه وَنَسْتَغْفِرُه وَنُوْمِنُ بِه وَنَتَوَكّلُ عَلَيْه وَ نَعُوْذُ بِاللّٰه مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلّ لَه وَ مَن يُّضْلِلْه فَلَا هَادِىَ لَه۔ وَنَشْهَدُ اَن لَّااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَه لَا شَرِيْكَ لَه وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مَحَمّداً عَبْدُه وَرَسُوْلُه اَرْسَلَه بِالْحَقِّ بَشِيْراً وَنَذِيْراً ۔ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْه وَعَلٰى آلِه وَاَصْحَابِه وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً۔ اَمَّابَعْدُ:

فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم۔ بسم الله الرحمان الرحيم

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَحِيْمٌ(۳۱)[سوره آل عمران]

اللہ کا ایک عظیم احسان:

اللہ تبارک وتعالیٰ کے بندوں پر احسانات تو بہت ہیں، انسان کا پورا وجود، اس کی ضروریات کی تکمیل، اس کی صحت اور زندگی بلکہ اس کی موت بھی اللہ کے احسانات میں سے ہے۔ اللہ نے زندگی پیدا کی اور ساتھ ہی موت بھی پیدا کی۔ یہ دونوں انسان کے لیے کارآمد ہیں۔ موت نہ ہوتی تو انسان کی سرکشی کا نہ جانے کیا انداز ہوتا؟ اور زندگی نہ ہوتی تو کوئی خیر کیسے حاصل کرتا؟ تو اللہ کے احسانات بہت ہیں۔ ان میں جو عظیم تر احسان ہے وہ یہ ہے کہ بندوں کو اللہ نے سیدھی راہ دکھلائی۔ وہ راستہ دکھلایا جس پر چل کر زندگی کے ہر مرحلے میں وہ کامیاب رہے گا، دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی

میں بھی۔ اور اس صراطِ مستقیم کو دکھلانے کے لیے انبیا کا سلسلہ جاری فرمایا۔ اور سب سے آخر میں جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو بھیج کر اس کی تکمیل فرمائی۔ آپ ﷺ کے واسطے سے ہدایت کی راہ ملی۔ اب اگر انسان آپ کے طریقہ پر مرتے دم تک قایم رہا تو زندگی کی تمام دشواریاں چھوڑ کر اللہ کے دربار میں اس طرح حاضر ہوگا کہ کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔

تکلیف صرف دنیا تک ہے:

جب اللہ کے رسول ﷺ اس دنیا سے تشریف لے جارہے تھے تو سکرات کی تکلیف بہت زیادہ تھی۔ بار بار پانی میں ہاتھ ڈالتے، اور کبھی پیشانی پر اور کبھی سینے پر لگاتے۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ’ہم نے آپ ﷺ کے سکرات کی جو تکلیف دیکھی ہے اس کے بعد کسی کی سکرات کی تکلیف پر بدگمانی کا احساس ختم ہوگیا‘ اب یہ بدگمانی نہیں ہوتی کہ یہ شاید دنیا سے اچھی حالت میں نہیں جارہا ہے۔ اس وقت آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا خدمت میں آئیں، اور اپنے باپ کی اس تکلیف کو دیکھ کر اپنے اوپر قابو نہیں رکھ پائیں اور رونے لگیں۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ آپ باپ بھی تھے، اور اللہ کے رسول بھی تھے۔ تمام صحابہ کرام کو جو محبت آپ ﷺ کے ساتھ تھی وہ تو تھی ہی، باپ ہونے کے ناطے مزید محبت تھی۔ دل دکھ گیا، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ’بیٹی! مت رو، آج کے بعد تمھارے باپ پر کوئی تکلیف نہیں ہے۔‘

زندگی میں انسان تکلیفیں جھیلتا ہی ہے۔ خود نبی کو نبوت ملنے کے بعد کوئی رات ایسی نہیں گزری جس میں آپ چین سے سوئے ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تھا ”اُذِّيتُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ مَا اُوذِيَ قَطُّ“ اللہ کے راستے میں جتنی تکلیف مجھے دی گئی ہے، کسی کو اتنی تکلیف نہیں دی گئی۔ لیکن یہ ساری تکلیفیں جھیل گئے، اطمینان تھا کہ یہ سب دنیا ہی میں ہے، مرنے کے بعد کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوگی۔ بیٹی سے فرمایا کہ ’اب سے تمھارے باپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی‘۔ ”اَلَّذِىْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِه لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ“ (سورة فاطر آية ۳۵) (تمام تعریف اس ذات کی)

جس نے اپنے فضل سے ہم کو ابدی ٹھکانے کے گھر میں لا اتارا ہے جس میں نہ ہمیں کبھی کوئی کلفت چھو کر گزرے گی اور نہ کبھی کوئی تھکن پیش آئے گی۔ اہلِ جنت جب جنت میں پہنچیں گے تو کہیں گے ”قَالُوْا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنَّا الْحَزَنَ“ (سورۃ فاطر آیۃ ۳۴) اور وہ لوگ (اہل جنت) کہیں گے کہ تمام تر تعریف اللہ کی ہے جس نے ہم سے ہر غم دور کر دیا۔ دنیا میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کوئی تکلیف نہیں ہے۔ یہ دنیا دار المحن ہے، یہاں تو تکلیف ہونا ہی ہونا ہے، لیکن جو طریقہِ نبی پر زندگی گزار کر دنیا سے رخصت ہوگا، آنکھ بند ہوتے ہی راحت وآرام کا سلسلہ جاری ہو جائے گا۔

ہر کام اللہ کے لیے ہو تو بات بن جائے:

اللہ فرماتے ہیں ”اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ“ جن لوگوں نے اللہ کو رب مان لیا ”ثُمَّ اسْتَقَامُوْا“ (سورۃ حم سجدہ آیۃ ۳۰) پھر اسی پر جمے رہے۔ ہر وقت اللہ کو راضی کرنے کی فکر رہی، اس کا اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا، سونا، جاگنا سب اللہ ہی کے لیے ہوا۔ ارشاد فرمایا ”قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ“ (سورۃ الانعام آیۃ ۱۶۲) تم کہہ دو میری نماز، میری قربانی، میری زندگی، میری موت سب اللہ کے لیے ہے۔ جب آدمی اس طرح زندگی گزارتا ہے کہ سب کچھ اللہ کے لیے ہو، زندگی اور موت بھی اللہ کے لیے ہو۔ جان کا مطالبہ ہو، آسانی سے دیدیں گے۔ اللہ کے لیے جینا نہ ہو تو ایک دن بھی جینا حرام ہے۔ تو ایسے لوگوں کی جیسے ہی آنکھ بند ہوتی ہے اور اس تھوڑی سی محنت کے بدلے وہاں کے انعامات اور راحت وسکون کا مشاہدہ کرتے ہیں تو بے اختیار کہتے ہیں ”اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَکُوْرٌ“ (سورۃ فاطر آیۃ ۳۴) تمام تر تعریف اللہ کی ہے جس نے ہم سے ہر غم دور کر دیا۔ بلا شبہ ہمارا رب بہت مغفرت کرنے والا قدر دان ہے۔ یعنی تھوڑی سی محنت کی اور قدر دانی اتنی ہوئی۔

یہ بہت بڑی بات ہے کہ آدمی کا ہر کام اللہ کے لیے ہو۔ ہمارے اکابرین میں

حضرت سید احمد شہید اس پر بیعت لیا کرتے تھے کہ ہر کام اللہ کے لیے ہو۔ خواجہ فرید الدین عطار بار بار فرماتے ہے:

خواہم از برائے تو زیم واز برائے تو مرم

میں چاہتا ہوں کہ آپ کی محبت میں جیوں۔ ان لوگوں نے ایسا کر کے دکھلا دیا، اور اللہ نے انہیں توفیق بھی دی کہ ان کا ہر کام اللہ کے لیے ہو۔ جب آدمی ایسا بن جاتا ہے تو دنیا کی تمام تکالیف اس کے لیے بے معنی ہو جاتی ہیں۔

دنیا مقصد نہیں ہے:

آدمی طریقۂ نبوی کو اپنائے، دنیا کی زندگی چاہے جیسی کٹے مگر جیسے ہی آنکھ بند ہوگی، ہمیشہ کے لیے راحت ہی راحت ہے۔ ہم نے اس چھوٹی سی دنیا کو بڑی دولت سمجھ لیا ہے، اور ہماری مشغولیت کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم اسی کے لیے جیتے مرتے ہیں۔ دنیا برتنے کی چیز ہے۔ کوئی نہیں کہتا کہ اسے چھوڑ دیجیے، مگر یہ یاد رکھیے کہ یہ برتنے کی چیز ہے مقصد بنانے کی نہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”مَا لِیَ وَلِلدُّنیَا وَمَا اَنَا وَالدُّنیَا اِلَّا کَرَاکِبٍ اِستَظَلَّ تَحتَ شَجَرَۃٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَکَھَا“ (ترمذی) مجھے دنیا سے کیا تعلق! میرا حال تو یہ ہے کہ ایک سوار چلا جا رہا تھا، تھوڑی دیر کسی درخت کے سائے میں آرام کیا اور پھر چل پڑا۔

سیدنا نوح علیہ السلام نو سو پچاس سال اس دنیا میں زندہ رہے۔ جب انتقال ہوا تو حضرت جبرئیل نے پوچھا کہ ’دنیا کو کیسا پایا؟‘ فرمایا کہ ’کچھ نہیں بس ایک بڑا سا گھر ہے۔‘ آدمی ٹرین کا سفر کرتا ہے مگر اسے مقصود نہیں بناتا۔ ہم نے دنیا کو بہت زیادہ اہمیت دیدی ہے، اس لیے ہم نبی ﷺ کے طریقہ سے ہٹتے چلے گئے، ورنہ جن کی زندگی نبی ﷺ کے طریقہ پر گذرتی ہے، کوئی اُن سے اِس دنیا کا حال پوچھے۔ امام ذہبی بڑے مؤرخ ہیں، ان کی کتاب ہے ”تاریخ الاسلام“۔ حضور ﷺ کے زمانے سے اپنے زمانے تک کی پوری تاریخ لکھی ہے۔ ہم نے تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ اس کی پوری جلدیں ملنے لگی

ہیں، مکمل ۵۱ جلدیں ہیں۔ اس کی تلخیص ہے ’’سیر اعلام النبلاء‘‘۔ اس میں مَیں نے دیکھا کہ خلیفہ بنو امیہ عبدالملک بڑے جاہ وجلال کا بادشاہ تھا۔ ایک بار خانہ کعبہ کے طواف کے بعد ایک بزرگ کو طواف کرتے ہوئے دیکھا۔ صحت بڑی اچھی، قد اونچا، خوب تنومند چہرہ بشاش۔ یہ بزرگ حضرت سالم تھے، حضرت عبداللہ بن عمر کے صاحبزادے۔ دادا بھی بدن کے زوردار تھے، والد بھی ایسے ہی تھے اور خود بھی خوب ہٹے کٹے تھے۔ مدینہ کے فقہاے سبعہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ سارا مدینہ کیا معنی؟ سارا عالم ان پر فدا تھا۔ بہت بڑے عالم تھے۔ یہ طواف کر رہے تھے، چہرہ سے نورانیت چھلک رہی تھی، بادشاہ کو بہت اچھا لگا کہ ان کی صحت کتنی اچھی ہے۔ بادشاہوں کو اور کیا چاہیے؟ یہی سب چیزیں ان کو پیاری ہوتی ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ بہت بڑے عالم ہیں، بادشاہ ٹھہر گیا۔ جب آپ طواف سے فارغ ہوئے تو سلام ومصافحہ کیا اور پوچھا کہ ’آپ کی صحت بہت اچھی ہے، آپ کھاتے کیا ہیں؟‘ آج کل صحت ہی سب سے بڑا مسئلہ ہے، جسے دیکھو وہی بیمار نظر آتا ہے۔ اسی لیے اتنے ڈاکٹر بھی ہوگئے ہیں کہ کوئی حد نہیں۔ حضرت سالم نے فرمایا کہ ’ہم تو روٹی پر روغنِ زیتون مَل لیتے ہیں، اور کھا لیتے ہیں۔‘ یہ ہم لوگوں کے بچپن کی تفریح تھی کہ روٹی پر سرسوں کا تیل مَل کر کھاتے تھے، اور ان کی غذا ہی ایسی تھی۔ یہ جواب سن کر عبدالملک کو بڑا جھٹکا لگا کہ ایسی غذا بتا رہے ہیں جو حلق سے نیچے نہیں اتر پائے گی۔ کہنے لگا کہ ’صاحب کیسے کھا لیتے ہیں؟‘ حضرت سالم مسکرانے لگے اور فرمایا کہ ’کبھی کبھی اٹکنے لگتی ہے تو چار دن نہیں کھاتا، جب خوب بھوک لگتی ہے تب کھاتا ہوں۔‘ کھانے کی اصل لذت تو بھوک ہی میں ہے۔ خیر عبدالملک اس کا کیا جواب دیتا؟ سوچا کہ عالم آدمی ہیں، پریشانیوں میں گھرے ہوں گے۔ کہا کہ ’کوئی ضرورت ہو تو ہمیں بتائیں۔‘ ہمارے زمانے میں کوئی معمولی حاکم بھی ہم سے پوچھ دے تو ہم ایک لمبی چوڑی فہرست بنا ڈالیں گے۔ وہاں بادشاہِ وقت پوچھ رہا تھا کہ ’کوئی ضرورت ہے؟‘ انھوں نے فرمایا کہ ’ضرورت دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو دین کی، اور اس کی مجھے آپ سے کوئی ضرورت نہیں ہے۔

یہ میرے گھر میں بہت ہے۔ دوسری ضرورت دنیا کی ہوسکتی ہے۔ اس کے بارے میں بڑی عجیب بات کہی۔ آج جو دنیا پر لوگوں کی فریفتگی کا عالم ہے اسے دیکھ کر تو یہ کہتے ڈر لگتا ہے۔ فرمایا کہ ’دنیا کی ضرورت جسے آپ پورا کر سکتے ہیں، اس دنیا کو تو میں دنیا پیدا کرنے والے ہی سے نہیں مانگتا، آپ سے کیا مانگوں گا۔‘ یعنی دنیا جو مقدر میں ہے وہ مل کر رہنا ہے۔ اسے اللہ سے مانگنے کی ضرورت کیا ہے۔ اللہ سے تو جنت، اللہ کی خوشنودی، رضا اور علم مانگتا ہوں۔ دنیا کو تو بے مانگے ملنی ہے، دنیا کو دنیا پیدا کرنے والے سے نہیں مانگتا ہوں۔

دنیا کی کوئی قیمت نہیں ہے:

جس دنیا کی ان حضرات کے یہاں یہ وقعت تھی، اسے ہم لوگوں نے ایسا اہم بنا دیا ہے کہ سوتے جاگتے اسی کی فکر، ہر وقت اسی کا خیال۔ کوئی کسی بزرگ کو پا جائے تو اس کے سامنے ڈھیر سارے دنیا کے مسائل لے آئے گا۔ یہ نہیں کہ دین کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرلیں۔ دعا کر دیجیے کہ نماز پر کاربند ہو جاؤں، نیک کام کی اللہ توفیق دیں۔ اِن چیزوں کو چھوڑ کر بس دعا کر دیجیے کہ فلاں مسئلہ حل ہو جائے، فلاں کام بن جائے۔ اس دنیا کی تو اللہ کے رسول ﷺ کے یہاں کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اللہ فرماتے ہیں ”وَمَاالْحَیوٰۃُ الدُّنْیَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ“ (سورہ آل عمران آیۃ ۱۸۵) دنیاوی زندگی تو دھوکہ کا سامان ہے، جو ابھی ہے تھوڑی دیر میں چل دے گی۔

مولانا زبیر احمد صاحب فیض آبادی بڑے اچھے مقرر تھے۔ فرماتے ہیں کہ ’جب برما میں انقلاب آیا تو ایک صاحب کے یہاں اَسّی ہزار کی رقم موجود تھی، مگر جب حکومت بدلی تو اب وہ صرف کاغذ رہ گئے۔ کیوں کہ موجودہ حکومت کی نگاہ میں اس کی حیثیت ختم ہو چکی تھی۔ جب ضرورت پڑی تو اس کاغذی نوٹ سے تین پیالی چائے بنا کر اسے جلا دیا گیا۔ اس دنیا کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ آدمی کی ذمہ داری ہے کہ اللہ کا حکم ہر حال میں پورا کرے، دنیا اس کے پاس خادم بن کر آئے گی۔

تین کام کا اہتمام:

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے ’فتوح الغیب‘ کے پہلے ہی مقالہ میں لکھا ہے کہ

ہر مومن تین کاموں کا ہر دم اہتمام کرے۔ پہلا ہر وقت اللہ کا کوئی نہ کوئی حکم پورا کرتا رہے۔' جب آدمی اللہ ہی کے لیے ہے تو ہر وقت کوئی نہ کوئی حکم پورا کرتا رہے۔ زندگی کے ہر لمحہ میں کوئی نہ کوئی حکم موجود ہے، صرف نماز ہی حکم نہیں ہے، جو حقوق ہم سے متعلق ہیں، بڑے چھوٹے کے ساتھ کیسا برتاؤ کریں، آپسی لین دین کس طرح کریں، کپڑا کیسے پہنیں، مشکل میں کیا کریں، یہ سب احکام ہیں، اور انھیں پورا کرنا ضروری ہے۔

مجھے یاد آرہا ہے کہ حضور ﷺ نے جب شاہ ایران کے پاس دعوتی خط بھیجا تھا تو بادشاہ نے کہا کہ 'آدمی بھیج کر تحقیق کی جائے کہ یہ نبی کیسے ہیں؟ ان کا پیغام کیا ہے؟' چنانچہ دو آدمی آئے، اس ہیئت میں کہ مونچھیں بڑی بڑی اور داڑھی ندارد۔ آپ کو ناگوار گزرا، آپ نے چہرہ پھیر لیا، اور فرمایا کہ 'یہ کیا شکل بنا رکھی ہے؟' حالانکہ وہ مسلمان نہیں تھے۔ انھوں نے کہا کہ 'ہمارے آقا نے یہی حکم دیا ہے کہ مونچھیں بڑھائی جائے اور داڑھی مونڈی جائے۔' حضور ﷺ نے فرمایا کہ 'لیکن میرے مولی نے مجھے حکم دیا ہے کہ داڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں کٹاؤ۔' یہ اللہ کا حکم ہے۔

ایفاے عہد کی اہمیت:

ہر وقت اللہ کا کوئی نہ کوئی حکم آرہا ہے۔ مومن کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ ہر وقت کوئی نہ کوئی حکم پورا کرتا رہے۔ بات کرتا ہے تو سچ بولنا اللہ کا حکم ہے، کسی سے وعدہ کرتا ہے تو اللہ کا حکم ہے کہ وعدہ پورا کرے۔ وعدہ پورا کرنا اللہ کو بہت پسند ہے۔ قرآن میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا تذکرہ ہے "اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ" (سورة مریم آیة ۵۴) وہ وعدہ کے سچے تھے۔ وعدہ کا سچا ہونا بڑی قیمتی چیز ہے۔ اب ہم وعدہ کرنے کے بعد اسے پورا کر رہے ہیں یہ سمجھ کر کہ یہ اللہ کا حکم ہے تو بہت بڑا ثواب ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ایک شخص نے وعدہ لیا کہ 'یہیں رہیے، ابھی آتا ہوں۔' اور تین سال تک نہیں آیا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام وعدہ پورا کرنے کے لیے تین سال تک وہیں رہے۔ اللہ نے اس کی تعریف فرمائی۔

کاندھلہ میں ایک بزرگ گزرے ہیں، جنھوں نے ڈاکوؤں سے کیے ہوئے وعدہ کو اس شان سے پورا کیا کہ اگر میں سناؤں تو آج کے لوگ اسے بے وقوفی کہیں گے۔ خود حضور ﷺ کے بارے میں آتا ہے کہ 'ایک شخص نے کہا کہ ابھی آتا ہوں، یہیں رہیے۔' اور تین دن کے بعد آیا تو آپ ﷺ وہیں بیٹھے نظر آئے۔ یہ ہے وعدہ پورا کرنے کی شان، جسے ہم کچھ نہیں سمجھتے۔ خصوصاً قرض کا وعدہ تو جان بوجھ کر بھولتے ہیں۔ ایک صاحب کی فون سے بات ہو رہی تھی، اور یہ 'کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا کہہ رہے ہیں؟ آواز نہیں آرہی ہے۔' چلاتے رہے، حالانکہ باہر بھی آواز سنائی دے رہی تھی کہ بات کرنے والا قرض کی واپسی کا مطالبہ کر رہا تھا۔ ایک شخص نے کہا کہ 'وہ اپنا قرض مانگ رہا ہے۔' تو یہ صاحب کہتے ہیں کہ 'آپ سن رہے ہیں تو آپ ہی دیدیجیے۔' تو قرض کے معاملہ میں ہمارا رویہ یہ ہوتا ہے۔ حالانکہ قرض ہے بڑی سخت چیز، قرض معاف نہیں ہوتا اس میں آدمی گروی ہو جائے گا۔

مقروض کی دعوت قبول نہیں کرنی چاہیے:

یہی بزرگ جن کا میں قصہ سنانے جارہا تھا، یعنی حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی۔ کاندھلہ علما و مشائخ کا مرکز رہا ہے۔ حضرت شیخ الحدیث، حضرت مولانا الیاس صاحب وغیرہم وہیں سے تعلق رکھتے ہیں۔ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب دہلی میں پڑھتے تھے، شروع ہی سے بڑے متقی تھے۔ اسی لیے کوئی مشتبہ لقمہ ان کے حلق میں نہیں جاتا تھا۔ دہلی میں شاہ اسحاق صاحب کے یہاں پڑھتے تھے۔ ان کے ساتھیوں میں ایک نواب قطب الدین خان صاحب تھے۔ ایک بار نواب صاحب اپنے استاذ شاہ اسحاق صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی شاہ یعقوب صاحب کی دعوت کی، اور بھی لوگ دعوت میں شریک تھے۔ مولانا مظفر حسین صاحب کو بھی مدعو کیا، مگر انھوں نے دعوت قبول نہیں کی۔ مولانا مظفر حسین صاحب کسی کی دعوت قبول نہیں کرتے تو اس کا مطلب ہوتا کہ دعوت دینے والے کا مال صحیح نہیں ہے، مشتبہ ہے۔ جب نواب صاحب کی

دعوت قبول نہیں ہوئی تو انھوں نے استاذ سے شکایت کی کہ 'کیا میرا مال حرام ہے؟ جو مظفر حسین دعوت قبول نہیں کر رہے ہیں۔ سب نے قبول کر لیا، آپ نے بھی قبول کر لیا، سب سے زیادہ متقی یہی ہیں؟' شاہ صاحب نے انھیں بلایا اور کہا کہ 'کیا جی! تمھیں تقوی کی بدہضمی ہوگئی ہے کیا؟ کیا ان کا مال حرام ہے جو تم ان کی دعوت قبول نہیں کرتے؟' انھوں نے عرض کیا کہ 'حضرت! ایسی بات نہیں ہے، بلکہ بات یہ ہے کہ آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ یہ ہیں نواب، ان کے قبضے میں جو بھی مال ہے وہ ان کا نہیں ہے، وہ سب رعایا کا ہے جو ان کے ذمہ قرض ہے۔ جو شخص قرض میں ڈوبا ہوا ہو، وہ قرض کی ادائیگی چھوڑ کر دعوتیں کرتا پھرے تو کہاں سے جائز ہوگا؟ اسی لیے میں ان کی دعوت قبول نہیں کر رہا ہوں۔' اب شاہ صاحب نے فرمایا کہ 'ہاں جی! اس کی طرف تو ہمارا ذہن ہی نہیں گیا تھا۔'

آج تو یہ حال ہے کہ کوئی کتنوں ہی قرض میں ڈوب جائے، چاہے کل دعوت قرض لے کر ہی کرے، دعوت کھانے والے کو اس سے کوئی بحث نہیں کہ کیسا مال ہے؟ بے چارہ غریب کہاں سے لایا ہے؟ اسے تو بس کھانے کی فکر ہے۔

ایفاے عہد کی ایک مثال:

میں بتا رہا تھا کہ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب گھر کی عورتوں کو بہیلی میں لے کر سفر میں نکلے۔ راستہ میں ڈاکوؤں سے ملاقات ہوگئی۔ یہ لوگ تو کسی کو دیکھتے نہیں، خدشہ تھا کہ حملہ کر دیں گے تو مال تو جائے گا ہی، جان بھی جائے گی، اور ساتھ میں عورتیں بھی ہیں، ان کی عزت کا بھی سوال ہے۔ عورتوں سے صورتِ حال بتائی اور فرمایا کہ 'میں ڈاکوؤں سے بات کرتا ہوں۔' ڈاکوؤں کے پاس گئے اور کہا کہ 'تمھیں صرف مال چاہیے نا؟ میں اگر آسانی سے سارا مال جمع کر کے تمھارے حوالے کر دوں تو کیا تم لوگ ہمیں جانے دو گے؟' ڈاکوؤں نے سوچا کہ بغیر خون خرابہ کے مال مل جا رہا ہے تو اس سے بہتر کیا ہو سکتا۔ انھوں نے ہامی بھر لی۔ حضرت نے کہا کہ 'دیکھو یہ ہمارے گھر کی عورتیں ہیں انھیں مت چھیڑنا، میں سارا مال اکٹھا کر کے ابھی لاتا ہوں۔' ڈاکو ایک طرف بیٹھ

گئے۔ یہ عورتوں کے پاس آئے اور فرمایا کہ ’جس کے پاس جو زیور ہے نکال کر سب مجھے دیدیں، میں نے اس طرح کا معاہدہ کرلیا۔‘ سب عورتیں زیورات نکال کر دینے لگیں، سب مال ایک جگہ جمع کیا اور اسے گٹھری بنا کر ڈاکوؤں کے حوالے کردیا۔ جب قافلہ آگے بڑھا تو عورتوں نے آپس میں تذکرہ شروع کیا کہ ہم نے فلاں فلاں زیور چھپا لیا ہے۔ مولانا نے یہ باتیں سنی تو سواری وہیں روک لی، اور فرمایا کہ ’تم چالاک بنتی ہو؟ ہم نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ سارا مال اُن کے حوالے کردیں گے۔ یہ وعدہ خلافی ہے جو کہ گناہ ہے۔ ہم جب تک ان زیورات کو ڈاکوؤں کے حوالے نہیں کریں گے، آگے نہیں بڑھیں گے۔‘ پھر ان زیورات کو وصول کیا اور ڈاکوؤں کے پاس پہنچے۔ ڈاکوؤں نے جب دوبارہ آتے دیکھا تو سمجھے کہ کوئی مدد مل گئی ہے، اس لیے حملہ کے لیے آرہے ہیں۔ سب مقابلہ کے لیے تیار ہوگئے۔ مولانا نے آواز دی کہ ’تم نے غلط سمجھا، حملہ کا کوئی ارادہ نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ ہم نے تم سے جو وعدہ کیا تھا، اس کے خلاف ہوگیا ہے۔ ہماری عورتوں نے زیورات چھپا لیے تھے، اس لیے ہم دوبارہ دینے آئے ہیں اور آپ سے معافی کے خواستگار ہیں۔‘ جب ڈاکوؤں نے دیکھا کہ یہ صورتِ حال ہے تو ان پر بڑا اثر پڑا، سب نے معافی مانگی کہ ہم سے غلطی ہوگئی، ہمیں معاف کردیجیے، سارا مال واپس کردیا اور توبہ کی کہ آئندہ ہم لوگ کبھی ڈکیتی نہیں کریں گے۔

مولانا اللہ کا حکم پورا کررہے تھے۔ اللہ نے وعدہ پورا کرنے کا حکم دیا ہے، نتیجہ فوراً ظاہر ہوا۔ نہ صرف مال مل گیا بلکہ یہ لوگ تائب بھی ہوگئے اور دیگر مسافر اُن سے مامون بھی ہوگئے۔

شاہ یعقوب صاحب کا واقعہ:

یہی شاہ اسحاق صاحب اور شاہ یعقوب صاحب جن کا ذکر ہوا ہے، یہ دونوں بزرگ ہندوستان سے ہجرت کرکے چلے گئے۔ یہ دونوں بزرگ سلسلہِ احادیث میں آتے ہیں۔ شاہ یعقوب صاحب بازار سامان خریدنے جاتے تو ہاتھ میں تھیلی ہوتی، جو

سامان لینا ہوتا لیتے۔ دوکاندار کے سامنے تھیلی پلٹ دیتے، دوکاندار کو جتنا لینا ہوتا لیتا، بقیہ پیسہ تھیلی میں رکھ کر واپس کر دیتا۔ ایک بار تھیلی ہاتھ میں لٹکا کر چلے جا رہے تھے۔ ایک اُچکے نے پیچھے سے ہاتھ سے تھیلی چھین لی۔ عجیب اللہ والے لوگ تھے، مڑ کر دیکھا تک نہیں کہ کون لے گیا؟ اپنے حال میں مست چلے جا رہے ہیں۔ خیر گھر تشریف لائے، تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ دیکھا کہ ایک صاحب وہی تھیلی بڑھا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ 'یہ تھیلی آپ کی ہے، آپ اسے لے لیں۔' حضرت نے فرمایا کہ 'نہیں میری نہیں ہے، تم لے جاؤ۔' مگر وہ بار بار اصرار کر رہا ہے، یہ بار بار انکار کر رہے ہیں کہ میری نہیں ہے۔ بار بار انکار کرنے پر وہ شخص چلانے لگا کہ 'لوگو! دوڑو، مجھے بچاؤ۔' لوگ آئے، صورتِ حال دریافت کی تو حضرت نے فرمایا کہ 'یہ شخص میرے ہاتھ سے تھیلی چھین لیا تھا، میں نے اسی وقت ہدیہ کی نیت کر لی تھی، قبضہ تو پہلے ہی سے تھا، لہٰذا یہ اس کی ملکیت ہوگئی۔ اب میں اسے کیسے واپس لوں۔' تب وہ کہنے لگا کہ 'تھیلی نہ لیں مگر میری آنکھ تو واپس کر دیں۔ جب میں اُدھر جاتا ہوں تو اندھا ہو جاتا ہوں اور جب میں آپ کی طرف آتا ہوں تو میری آنکھ ٹھیک ہو جاتی ہے۔' حضرت نے دعا کی اور وہ ٹھیک ہو گیا۔

ان حضرات کے نزدیک دنیا کی وقعت ہی ایسی تھی۔ یہ تو ہم لوگوں نے اس کی اہمیت بڑھا دی ہے۔

آمدم برسر مطلب:

میں کہہ رہا تھا کہ شیخ عبدالقادر جیلانی نے فرمایا کہ 'مومن کو ہر وقت تین کاموں کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ایک تو یہ کہ اسے ہر وقت اللہ کا کوئی حکم پورا کرتے رہنا چاہیے۔ دوسرا اہتمام یہ کہ ہر وقت اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں سے باز آتا رہے۔' جھوٹ بولنا حرام ہے تو فکر کرے کہ کوئی جھوٹی بات زبان سے نہ نکلے۔ اب تو اسی کا اہتمام ہوتا ہے کہ جھوٹ بولا جائے۔ کہتے ہیں کہ اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ جھوٹ بولنا حرام ہے، اور اسی کے بغیر کام چلے گا۔ اس جھوٹ سے بچنے کے نتیجے میں اللہ تعالی ایسا اعتماد اور ایسی قبولیت

عطا فرمائیں گے کہ دنیا دیکھے گی۔ آدمی حرام کو نہیں دیکھتا، بس مال آنا چاہیے، حالاں کہ اللہ نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے، اسے آدمی چھوڑ دے۔ حرام کی کیا بات؟ مشتبہ چیزوں کو بھی چھوڑنے کا حکم ہے۔ ”دَعْ مَا يَرِيْبُكَ اِلیٰ مَالَا يَرِيْبُك“ (اخرجه الترمذی عن الحسن بن علی رضی الله عنهما) **مشکوک و مشتبہ چیزوں کو چھوڑ کر غیر مشکوک چیزیں اختیار کرنی چاہیے۔**

اور تیسرا اہتمام یہ کرے کہ ’اللہ نے جو فیصلہ کر دیا ہے اس پر دل و جان سے راضی رہے۔‘ آج ہم قدم قدم پر اللہ سے ناراض ہیں۔ نماز فرض ہے مگر ہم نہیں پڑھتے، جو نہیں پڑھتا اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ اللہ کے حکم سے راضی نہیں ہے۔ اگر راضی ہوتا تو اہتمام سے پڑھتا۔ جھوٹ بولنا حرام کر دیا تو ہم ناراض ہو گئے کہ کیوں حرام کر دیا؟

ایک مولوی صاحب کسی دیہات میں گئے اور لوگوں سے کہا کہ ’روزہ رکھو۔‘ سب نے روزہ رکھ لیا۔ کھیتی کا زمانہ تھا، بارش ہو گئی، سارا کھیت برباد ہو گیا۔ اب لوگ پانی پی کر لاٹھی لے کر گھروں سے نکل آئے کہ ’روزہ رکھا تو بارش بھیج کر کھیتی برباد کر دی۔‘

آج بعض لوگ اِسی ذہنیت کے ہیں کہ کہتے ہیں کہ ’ہماری بربادی کا سبب یہی ہے کہ ہم شریعت کے احکام پر عمل کرتے ہیں۔‘ بعض لوگ ایسے ہیں کہ جب مصیبت آتی ہے تو ہر جگہ اللہ کی شکایت کرنے لگتے ہیں، اور طرح طرح کے الفاظ حتی کہ کفریہ کلمات تک بک جاتے ہیں۔ ”فَيَقُوْلُ رَبِّیْ اَهَانَنِ“ (سورة الفجر آية ١٦) میرے رب نے میری توہین کی ہے۔ آج کا انسان اللہ سے بہت ہی زیادہ ناراض ہے۔ روزی روٹی کا مسئلہ ہو یا دنیا کے دیگر مسائل ہوں، جسے دیکھو وہ شکایت کرتا نظر آتا ہے، اور جہاں سے یہ چیزیں دور ہو سکتی ہیں اسے چھوڑ کر پتہ نہیں کون کون سے کفر و شرک کے مقامات پر جا کر اپنے ایمان کو برباد کرتا ہے۔

رضامندی اور شکر گزاری بہت بڑی چیز ہے کہ آدمی اللہ کے ہر فیصلہ پر دل و جان سے راضی ہو۔ خوشی آئے تو بھی راضی رہے، اور پریشانی آئے تو بھی راضی رہے۔

ہاں اس پریشانی کے دور کرنے کی جو تدبیر اللہ اور رسول نے بتائی ہے اسے اختیار کرے۔ کیا معلوم اس پریشانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہمیں نوازنا چاہتا ہو۔

رضا بالقضا:

شیخ نے تین باتوں کے اہتمام کا حکم فرمایا ہے۔ ایک ہر وقت اللہ کا کوئی نہ کوئی حکم پورا کرتا رہے۔ دوسرے ہر وقت اللہ کی منع کی ہوئی باتوں سے بچتا رہے اور تیسرے یہ کہ اللہ کے ہر حکم پر دل و جان سے راضی رہے۔ یہ درحقیقت تعلیم ہے اللہ کے رسول ﷺ کی، رضا بالقضا، تقدیر پر راضی رہنا۔ اور جب آدمی یہ کرلے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے محبت فرمائیں گے اور جب خدا تعالیٰ محبت کرنے لگے تو اب ضرورت کس بات کی رہ گئی؟

اس لیے میرے دوستو! سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرلے، وہ کامیاب ہے۔ ”وَمن يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزاً عَظِيُماً“ یہ دنیا برتنے کی چیز ہے، اسے شوق سے برتیں، مگر ہر حال میں اللہ سے راضی رہیں۔ ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ ’ہم یہ کیسے سمجھیں کہ اللہ ہم سے راضی ہے؟‘ فرمایا کہ ’تم یہ دیکھو کہ تم اللہ سے راضی ہو یا نہیں؟‘

سب سے بڑی چیز قلب کا سکون اور اطمینان ہے۔ اگر یہ نہیں تو دنیا کے سارے اسبابِ راحت بیکار ہیں۔ سب کچھ مہیا ہے پھر بھی آدمی ٹینشن میں رہتا ہے۔ یہ آج کے دور کی خاص علامت ہے۔ جسے دیکھو وہی ٹینشن میں زندگی گزار رہا ہے۔ اگر اللہ کی ذات پر اعتماد ہو، اور اس کے احکامات پر پورے کرتے رہیں تو کہیں کوئی ٹینشن نہیں رہے گا۔ کوئی پریشانی بظاہر آئے گی بھی تو آدمی سمجھے گا کہ یہ اللہ کی طرف سے اور اس پر راضی رہے گا۔

آدمی اگر اللہ کی کامل اطاعت کرتا ہے تو یہ کامیاب زندگی کی علامت ہے ”فَقَدْ فَازَ فَوْزاً عَظِيُماً“۔ اللہ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین

❑❑❑

بیان بمقام مسجد دلدار نگر در بھنگہ
بعد نماز مغرب، بروز منگل ۲۸ رشوال ۱۴۲۷ھ

زندگی اور موت انسان کے امتحان کے لیے ہیں

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہ وَنَسْتَعِیْنُہ وَنَسْتَغْفِرُہ وَنُؤمِنُ بِہ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہ وَ مَن یُّضْلِلْہ فَلَا ھَادِیَ لَہ۔ وَنَشْھَدُ اَن لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہ لَا شَرِیْکَ لَہ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہ وَرَسُوْلُہ اَرْسَلَہ بِالْحَقِّ بَشِیْراً وَنَذِیْراً۔ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہ وَاَصْحَابِہ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً۔ اَمَّابَعْدُ:

فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمان الرحیم

تَبَارَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۱) الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیَاۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ (۲) [سورہ ملک)

ترجمہ: وہ ذات بہت عظیم الشان اور برکت والی ہے جس کے قبضہ اور ہاتھ میں حکومت ہے۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے جس نے موت کو پیدا کیا اور زندگی کو، تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل کے اعتبار سے بہتر ہے، اور وہ غلبہ والا اور مغفرت کرنے والا ہے۔

قادرِ مطلق صرف ذاتِ واحد ہے:

یہ قرآن پاک کی سورہ ملک کی پہلی دو آیتیں ہیں۔ اس میں اللہ تعالی نے اپنی عظمت و بڑائی بیان فرمائی ہے، اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ ساری حکومت اسی کے قبضہ میں ہے۔ کسی کے قبضہ میں کچھ نہیں ہے، جو ہے اللہ کے قبضہ میں ہے۔ زمین و آسمان اور اس

کے درمیان کی مخلوقات کے بارے میں فیصلہ کرنا، ان سے کام لینا، ان کو کام پر لگانا، ان کے احوال دیکھتے رہنا، سب کچھ اللہ کے قبضہ میں ہے، دنیا میں بھی اور اس کے بعد بھی۔ فرماتے ہیں ’’وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر‘‘ کوئی کسی چیز پر قادر نہیں ہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

انسان کی طاقت قدرتِ الٰہی کے تابع ہے:

انسان کو تھوڑی بہت طاقت ملی ہے مگر یہ طاقت قدرتِ الٰہی کے تابع ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات قادرِ مطلق ہے، اور بندوں کی تھوڑی بہت قدرت عارضی ہے۔ بندہ تو کمزورِ محض ہے، اس کے پاس طاقت کہاں سے آتی؟ جو تھوڑی بہت طاقت ہوتی ہے وہ اللہ کی عطا کردہ ہوتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں ’’اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَشَیْبَةً‘‘ (سورة الروم آیة ۵۴) اللہ وہ ہے جس نے تمھاری تخلیق کی ابتدا کمزوری سے کی، پھر کمزوری کے بعد طاقت عطا فرمائی، پھر طاقت کے بعد (دوبارہ) کمزوری اور بڑھاپا طاری کر دیا۔ کوئی ہزار جتن کرے بالآخر اسے کمزور اور بوڑھا ہونا ہونا ہی ہے، پھر ہوتے ہوتے وہ ختم ہو جائے گا، کسی کو اس سے مفر نہیں ہے۔ یہ قانون صرف انسانوں پر نہیں ہر چیز پر جاری ہے۔ اور آخری کمزوری یہ ہے کہ انسان اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔

زندگی وموت انسان کے امتحان کے لیے ہیں:

فرماتے ہیں ’’اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیَاةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً‘‘ موت اور زندگی کا قانون بنایا، تاکہ تمھارا امتحان لے۔ اگر صرف زندگی ہی زندگی رہتی تو انسان سے بڑا باغی اور سرکش کوئی نہیں ہوتا، اور اگر موت ہی موت رہتی تو اس کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ فرماتے ہیں ’’وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ وَلٰكِن یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَاءُ‘‘ (سورة الشوری آیة ۲۷) اور اگر اللہ اپنے تمام بندوں کے لیے رزق کو کھلے طور پر پھیلا دیتا تو وہ زمین میں سرکشی کرنے لگتے، مگر وہ

ایک خاص اندازے سے جتنا چاہتا ہے (رزق) اتارتا ہے۔ یہی حکمت کا تقاضا ہے۔ اگر روزی بڑھا دی جائے تو دماغ آسمان کی سیر کرنے لگتا ہے، اگر زندگی بڑھا دی جاتی اور موت کا قانون نہ رہتا تو کیا حال ہوتا؟ اسی لیے موت کا قانون بنایا۔ اب انسان اللہ کے سامنے حضوری کے خوف سے کام کرتا ہے اور اپنے اعمال کو درست کرتا ہے۔ اگر موت نہ ہوتی تو کوئی اچھا کام نہیں کرتا۔

موت کے ساتھ دو جگہ بنائی، ایک جنت اور ایک جہنم۔ جو سرکشی کرتا ہے اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ یہ جب ہوتا ہے جب کوئی طاقت، جسم کی یا مال کی یا کسی اور چیز کی انعاماتِ خداوندی کی شکل میں اسے مل جاتی ہے۔ اللہ نے بار بار دہرایا ہے کہ جب انسان بے نیازی دیکھتا ہے تو بگڑتا ہے، وہ سرکشی اختیار کرکے دنیاوی زندگی کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کو سمجھ لینا چاہیے کہ مرے گا ضرور، اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا "فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَأْوٰی" (سورة النازعات آیة ۳۹) پھر فرماتے ہیں " وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی " (سورة النازعات آیة ۴۰) اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے ڈرا، اسے جواب دہی کا احساس ہے، وہ اپنی خواہشات پر نہیں چلتا، بلکہ اللہ کی ہدایت پر چلتا ہے۔ " فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَأْوٰی" (سورة النازعات آیة ۴۱) تو جنت اس کا ٹھکانہ ہے۔

موت ایک لگام ہے:

موت وحیات دونوں کام کر رہے ہیں۔ زندگی اس لیے ملی کہ اچھا کام کریں، اور موت اس لیے ملی تا کہ لگام لگا رہے۔ اب ہر وقت خوف طاری ہے کہ کب مر جائیں، اسی لیے ہر وقت اس کی تیاری کی فکر رہتی ہے۔ اللہ نے موت کا وقت تو بتایا نہیں کہ اطمینان سے بیٹھ جائیں، جب مرنے میں دو تین سال رہ جائیں تو تیاری شروع کر دیں۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ موت کا وقت بتایا نہیں گیا، ورنہ بتا دیا جاتا تو بڑی مشکل ہو جاتی۔ اس کا وقت آنے سے پہلے نہ جانے کتنے لوگ کتنی مرتبہ اس کے ڈر سے مرنے لگتے، اور جوں جوں موت کا وقت قریب آتا، اس کا خوف انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔

موت کا خوف:

ایک بادشاہ بہت زیادہ موٹا ہوگیا۔ بہت علاج کرایا کہ کسی طرح موٹاپا کم ہو، دبلا ہوجائے مگر کوئی علاج فایدہ مند نہیں ہوا۔ تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ موٹاپے کی وجہ سے اُسے مستقل پریشانی لاحق تھی، کوئی کام خود سے نہیں کرسکتا، ہر وقت دوسروں کا محتاج بنا رہتا۔ ایک بار ایک طبیب آیا، اس نے کہا 'جہاں پناہ! میں طبیب بھی ہوں اور نجومی بھی ہوں۔ میں آپ کا علاج شروع کرنے سے پہلے دیکھ لیتا ہوں کہ آپ کا مستقبل کیا ہے؟' پھر اس نے علمِ نجوم کا کچھ حساب وغیرہ لگا کر بتایا کہ 'میرا علمِ نجوم کہتا ہے کہ اب آپ صرف چالیس دن تک زندہ رہیں گے۔' موت کا تذکرہ اور وہ بادشاہ کے سامنے! عام آدمی بھی اس پر چراغ پا ہوجاتا ہے، وہ تو خیر بادشاہ تھا، اس کو تو چراغ پا ہونا ہی تھا۔ بادشاہ کو بڑا غصہ آیا کہ یہ ہمیں مارنا چاہتا ہے۔ اسے جیل میں ڈال دیا۔ مگر بادشاہ کے دل میں یہ بات گھس گئی تھی کہ یہ نجومی بھی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا علمِ نجوم صحیح پتہ دے رہا ہو۔ اب وہ ہر وقت اسی فکر میں رہنے لگا۔ ساری سلطنت دوسروں کے حوالہ کی اور خود اللہ اللہ کرنے لگا۔ کھانے پینے میں اور دنیا کے دیگر اُمور میں جی نہیں لگتا۔ گنتے گنتے چالیس دن گزر گئے، اتنے دن میں یہ سوکھ کر کانٹا ہوگیا، مگر مرا نہیں۔ نجومی پر بڑا غصہ آیا کہ اس نے مجھے پریشان کردیا۔ جیل سے اسے بلایا، بہت ڈانٹا کہ 'کہاں موت آئی؟' نجومی نے کہا کہ 'حضور! مگر آپ ہلکے تو ہوگئے۔ ہم آپ کو مارنا تھوڑا ہی چاہ رہے تھے، ہم تو آپ کا علاج کررہے تھے۔'

موت کے وقت کا نہ جاننا بھی اللہ کا بڑا فضل ہے:

جو لا علاج ہو چکا تھا اس کا علاج ہوگیا۔ اس لیے اگر ہمیں پیدائش کے وقت ہی موت کا علم ہوتا تو کیا ہوتا؟ ساری زندگی پریشانی میں گزرتی۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے موت کا وقت ہم سے چھپا دیا، ورنہ ہم موت سے پہلے ہی مرجاتے۔ اور اسی طرح مُغیبات کی بھی خبر نہیں دی۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ 'جو کچھ میں جانتا

ہوں اگر تم لوگ جان جاؤ تو بستروں کو چھوڑ کر جنگل میں نکل جاؤ۔' ہمارے سامنے وہ حالات اور منظر نہیں ہیں، اس لیے ہم جو چاہتے ہیں سارے کام کرتے ہیں۔ جب معرفت آتی ہے تو دل کا رنگ بدل جاتا ہے۔ آج ہماری بے فکری کا یہ عالم ہے کہ جوانی جو اصل کام کرنے کا وقت ہے، اسے یونہی بے کار گزار دیتے ہیں۔ جوانی میں کسی طرح کی عبادت نہیں کرتے، بڑھاپا آیا تو کسی لایق نہیں رہے، مگر حال یہ ہے کہ اب بھی زندگی کی حسرت ہو رہی ہے۔

ہمارے شیخ کے پاس ایک صاحب اپنا پوتا لے کر آئے، اور کہا کہ حضرت اسے دم کر دیجیے۔ بچہ اپنی زبان میں کچھ بول رہا تھا۔ شیخ نے فرمایا کہ 'آپ کو معلوم ہے کہ بچہ کیا بول رہا ہے؟' بچہ کہہ رہا ہے کہ 'دادا جان! سیٹ خالی کیجیے، اب ہم آ چکے ہیں۔' میرے پاس ایک صاحب اپنا بچہ لے کر آئے کہ 'بڑا ضدی ہے کوئی تعویذ دے دیجیے۔' میں نے کہا 'تعویذ کی ضرورت بچے کو نہیں آپ کو ہے۔ اس سے زیادہ ضدی آپ ہیں، ساری زندگی ختم ہو گئی، جوانی ختم ہو گئی، بڑھاپا آ گیا، اب آگے موت کے علاوہ کوئی منزل نہیں ہے، مگر ضد کا یہ عالم ہے کہ چہرہ داڑھی سے خالی نظر آ رہا ہے۔' اللہ کے رسول ﷺ کو ایسا چہرہ ناپسند ہے مگر ہم مسلمان ہونے کے باوجود اپنی اسی ضد پر قائم ہیں۔

ایران سے دو آدمی حضور ﷺ کے پاس آئے۔ داڑھی نہیں تھی، بڑی بڑی مونچھیں تھی۔ آپ نے چہرہ پھیر لیا اور فرمایا کہ 'کیا شکل بگاڑ رکھی ہے!' ان دونوں نے کہا کہ 'ہمارے آقا کا یہی حکم ہے۔' آپ ﷺ نے فرمایا کہ 'میرے مولی کا حکم یہ ہے کہ داڑھی بڑھاؤ اور مونچھ کترواؤ۔'

دنیا سرائے فانی ہے:

ہم یہاں آ کر بے فکر ہو جاتے ہیں، ہمیں اس کی فکر نہیں ہوتی کہ آخر کار ہمیں مرنا بھی ہے۔ ہم یہاں ہمیشہ رہنے کے لیے نہیں آئے ہیں:

دنیا عجب سرائے فانی دیکھی
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی

یہاں کی ساری چیز جانے والی ہے اور چلی جاتی ہے۔ اور ایک چیز تو ایسی ہے کہ جاتی ہے تو آتی نہیں اور آتی ہے تو جاتی نہیں:

جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

ہر چیز آنی جانی ہے۔ یہ تو اللہ نے نظام بنا رکھا ہے، آدمی کو سوچ لینا چاہیے کہ اسے اللہ کے دربار میں حاضر ہونا ہے، اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ مگر ہماری بے فکری کا یہ عالم ہے کہ جس کی سب سے زیادہ فکر کرنی چاہیے، اس کی فکر ہی نہیں۔

اطاعت کا سب سے اچھا زمانہ جوانی ہے:

کام کرنے کا جو بہترین زمانہ ملا، جوانی کا زمانہ، اسے یونہی گزار دیتے ہیں۔ سب سے زیادہ بے فکری کا زمانہ یہی جوانی کا ہوتا ہے۔ حالاں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ عرش کے سائے میں قیامت کے دن سات طرح کے لوگ ہوں گے۔ اس دن عرش کے سایہ کے علاوہ کوئی اور سایہ نہیں ہوگا، یہ سایہ اتنا بڑا ہوگا کہ پوری دنیا سما جائے، مگر اس میں مخصوص لوگ ہوں گے۔ اُن مخصوص لوگوں میں ایک وہ جوان بھی ہوگا جس نے اپنی جوانی اللہ کی اطاعت و عبادت میں گزاری ہو' شَأبٌّ نَشَأَ فِی عِبَادَةِ رَبِّهِ (بخاری

اللہ اور اللہ کے رسول نے سب کچھ بتا دیا، قرآن و حدیث میں ساری چیزیں موجود ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ سب کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے، اور ایک جگہ جا کر حساب دینا ہے، مگر آدمی بھولا ہوا ہے۔ اسی لیے فرمایا "اَکْثِرُوْا ذِکْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ یعنی الموت" (اخرجه الترمذی عن ابی هریرة ؓ) موت کو کثرت سے یاد کرو۔ اِس سے اعمال کی اصلاح ہوتی رہے گی۔ ہمیں لوگ ایسی جگہ دفن کر دیں گے جہاں صرف ایمان و عمل ہی ساتھ ہوگا، اللہ کی محبت ہوگی اور کوئی چیز نہیں ہوگی۔ وہاں دنیا کی نسبت ستائے گی۔ خود دنیا میں اہل و عیال کو چھوڑ کر کہیں چلا جاتا ہے تو ان کی محبت ستاتی ہے، بسا اوقات آدمی ان کی محبت میں سفر سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ یہاں سے جانے کے بعد دنیا

کی محبت اسی طرح ستائے گی، اپنا مال، اپنی جائیداد اور گھر کے لوگ یاد آئیں گے، مگر آدمی تڑپ سکتا ہے، موقع نہیں ملے گا کہ وہ دوبارہ دنیا میں آکر انھیں دیکھ لے۔ موت اعمال سنوارنے کے لیے ہے۔ انسان مرنے سے پہلے اگر اعمال نہیں سنوارے گا تو مرنا تو ہے ہی، مرنے کے بعد اپنے برے اعمال کی سزا بھگتنی ہوگی۔

اللہ والوں کا حال:

حضرت یزید بن ہارون ایک محدث تھے۔ مرنے کے بعد کسی نے خواب میں پوچھا کہ 'کیا گذری؟' تو انھوں نے فرمایا کہ 'فرشتوں نے پوچھا کہ 'مَنْ رَبُّكَ؟' تمھارا رب کون ہے؟ میں نے کہا 'تم لوگ بھی عجیب آدمی ہو، پوری زندگی تو یہی سبق یاد کیا، زمین سے دو گز نیچے آنے کے بعد کیسے بھول جاؤں گا؟ تم لوگ یہاں کہاں آگئے؟ جسے یہ سبق یاد نہ ہو، اس کے پاس تمھیں جانا چاہیے۔'

امام ابوزرعہ رازی کا انتقال ہونے لگا تو وہاں موجود لوگوں نے 'لا الہ الا اللہ' کی تلقین شروع کردی۔ مسئلہ یہی ہے کہ مرنے والے کے پاس کلمہ طیبہ کی تلقین ہو۔ انھیں تلقین کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ وہاں موجود شاگردوں نے انھیں کے واسطے سے حدیث بیان کرنا شروع کی، اور سند کو حضور ﷺ تک پہنچانے کے بعد کہا "مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ" اتفاق کی بات ہے کہ اس کے آگے شاگرد بھول گیا۔ جید حافظ کے یہاں شاگرد کے بھولنے پر فوراً بلا تاخیر لقمہ ملتا ہے۔ ہمارے یہاں ایک استاذ نے نماز میں شاگرد کو لقمہ دیا، مگر لقمہ غلط تھا۔ شاگرد نے نہیں لیا، اور پڑھتا چلا گیا۔ اب استاذ سوچنے لگے کہ لقمہ کیوں نہیں لیا؟ بعد میں سمجھ میں آیا کہ لقمہ غلط دیدیا تھا، تو نماز ہی میں کہتے ہیں 'ہاں ٹھیک پڑھ رہے ہو۔' یہاں جیسے ہی شاگرد سے بھول ہوئی فوراً امام ابوزرعہ کی زبان سے نکلا "لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه دَخَلَ الْجَنَّةَ" اور روح پرواز کرگئی۔ زندگی بھر اسی کی تعلیم دی تھی، اسی لیے موت کے وقت بھی زبان سے وہی نکلا۔ اسی لیے اس کا ہمیشہ اہتمام کرنا چاہیے۔ جوانوں کو تو بہت ہی کرنا چاہیے مگر بوڑھے نہ کریں تو بڑی خرابی کی بات ہے۔ بڑھاپے میں کوئی

دعا نہیں ہے سوائے خاتمہ بالخیر کی دعا کے۔ صحت وغیرہ کی دعا سے کیا فائدہ کہ اب صحت کا وقت ہی نہیں رہا۔

ہمارے استاذ حضرت مولانا فخر الدین صاحب دیوبند میں بخاری شریف پڑھاتے تھے۔ طبیعت خراب ہوگئی۔ ہم لوگوں نے کہا کہ ’آپ خود اپنی صحت کے لیے دعا فرمائیں۔‘ تو خفا ہوگئے، اور فرمایا کہ ’دعا اپنے محل پر ہوتی ہے۔ اب تو میرے خاتمہ بالخیر کی دعا کرو۔‘ حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحب سے ایک بار انٹریو لیا گیا۔ آخر میں پوچھا گیا کہ ’سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟‘ تو فرمایا کہ ’ایمان پر خاتمہ۔‘

تو جب ہر وقت ایمان کی دھن لگی رہے گی تو موت بھی آسان ہوجائے گی۔

ایک صاحب حضرت خواجہ فریدالدین عطار کے یہاں گئے۔ اس وقت خواجہ صاحب دنیا دار تھے۔ دوا کی بڑی دوکان تھی۔ ان صاحب نے کچھ سوال کیا مگر مشغولیت کی وجہ سے خواجہ صاحب جواب نہ دے سکے۔ ان صاحب کو بڑا غصہ آیا اور کہنے لگے کہ ’صاحب! آپ کی موت بڑی تکلیف دہ ہوگی۔ روح اِن تمام دوا کے ڈبوں میں پھنسی ہوئی ہے، آخر کیسے موت آئے گی؟‘ خواجہ صاحب بھی کوئی کم جلالی نہیں تھے۔ فرمانے لگے کہ ’ہماری کیوں فکر کرتے ہو؟ تمھاری موت کیسے آئے گی؟‘ اس نے کہا ’ہماری موت ایسے آئے گی۔‘ تھیلا اتارا، زمین پر رکھا، لیٹ گئے اور موت آگئی۔

جب آدمی موت کو یاد کرتا ہے، اس کی تیاری کرتا ہے تو اس کے لیے مرنا آسان ہوجاتا ہے۔ فرشتے آئیں گے اس کی موت پر اور کہیں گے ”تَتَنَزَّلُ عَلَيۡهِمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّةِ الَّتِىۡ كُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ“ (سورة حم السجدة آية ۳۰) ان پر فرشتے (یہ کہتے ہوئے) اتریں گے کہ نہ کوئی خوف دل میں لاؤ نہ کسی کا بات کا غم کرو اور اس جنت سے خوش ہوجاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

زندگی کا حاصل خدا کی رضا ہے:

زندگی کا حاصل یہی ہے کہ مرتے مرتے اللہ کو راضی کرلے۔ اللہ فرماتے ہیں

”وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَکُمْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّۃَ فَقَدْ فَازَ“ (سورۃ آل عمران آیۃ ۱۸۵) قیامت کے دن تمھیں پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، پس جو جہنم سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا، وہ کامیاب ہے۔

میں عرض کر رہا تھا کہ سب کو فکر کرنی ہے، مگر جن کے بال سفید ہو گئے ان کو تو اور زیادہ فکر کرنی ہے کہ اب اس کے بعد دوسری منزل نہیں ہے سوائے موت کے۔ حضرت جبریل نے ملک الموت سے پوچھا کہ ’تم بھی عجیب ہو، اچانک آ جاتے ہو، آنے سے پہلے آنے کی اطلاع کر دیا کرو۔‘ ملک الموت نے جواب دیا ’میں اتنے پیغام بھیجتا ہوں کہ شاید کوئی آنے والا اتنا پیغام بھیجتا ہو۔ بچپن سے جوانی، پھر بڑھاپا، بالوں کا سفید ہونا، ہڈیوں کا کمزور ہونا، اعضا کا ڈِھیلا پڑ جانا، پھر زمانہ کے تغیرات۔ یہ سب میرے پیغامات ہیں کہ جس طرح یہ چیزیں ختم ہو رہی ہیں، تمھیں بھی ختم ہونا ہے۔‘ مگر انسان اتنا غافل ہے کہ ان پیغامات کو دیکھ کر بھی کنارہ کیسے رہتا ہے کہ ابھی عمر ہی کیا ہوئی ہے؟ حالانکہ بہت ہو چکی ہے، اب کس بات کا انتظار ہے؟ اس لیے اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔ اللہ نے موت وحیات کا قانون بنایا تاکہ انسان کی زندگی سنور جائے۔ اسی لیے انبیا آئے، احکامات بھیجے گئے کہ انسان اپنی زندگی کو سنوار لے اور کامیاب کر لے۔

اللہ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین

❑❑❑

۲۴؍شوال ۱۴۲۷ھ بوقت جمعہ
جامع مسجد گوا پوکھر بھوارہ مدھوبنی

عنداللہ وعندالناس محبوبیت کا نسخہ کیمیا

اَلْـحَـمْـدُلِـلّٰـهِ نَحْمَدُه وَنَسْتَعِيْنُه وَنَسْتَغْفِرُه وَنُوْمِنُ بِه وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْه وَ نَعُوْذُ بِاللّٰه مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن يَّهْدِه اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَه وَ مَـن يُّـضْلِلْه فَلَا هَادِىَ لَه۔ وَنَشْهَدُ اَن لَّااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَه لَا شَرِيْكَ لَه وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّـدَنَا وَمَوْلَانَا مَحَمّداً عَبْدُه وَرَسُوْلُه اَرْسَلَه بِالْحَقِّ بَشِيْراً وَنَذِيْراً۔ وَصَلَّى الـلّٰـهُ تَـعَـالٰـى عَـلَيْـه وَعَـلٰى آلِه وَاَصْحَابِه وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً۔ اَمَّابَعْدُ:

عَـنْ سَهْـلِ بْـنِ سَـعْـدٍ السَّاعِدِىِّ قَالَ: أَتٰى النَّبِىَّ ﷺ رَجُـلٌ فَـقَالَ: يَا رَسُوْلَ الـلّٰـهِ! دُلَّـنِىْ عَلٰى عَمَلٍ اِذَا انَا عَمِلْتُهٗ اَحَبَّنِىَ اللّٰهُ وَاَحَبَّنِىَ النَّاسُ۔ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِزْهَدْ فِى الدُّنْيَا يُحِبَّكَ اللّٰهُ وَازْهَدْ فِىْ مَا عِنْدَ النَّاسِ يُحِبُّوْكَ۔ (ابن ماجه ۴۱۰۲)

رسول اکرم ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے ایک کام کی بات پوچھی۔ وہ بات ایسی ہے کہ اس کی ضرورت جیسے ان کو تھی، ویسے ہی ہم کو بھی ہے، اور قیامت تک آنے والے انسانوں کو اس کی ضرورت ہے۔ یہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا بڑا احسان ہے کہ اللہ تعالی نے ان کے ذریعہ سے ایسی باتیں کہلوائی ہیں، ایسے سوالات انھوں نے کیے ہیں جو رہتی دنیا تک تمام انسانوں کے لیے روشنی اور ہدایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ اُن سوالات کے جو جواب دیے ہیں وہ بہت قیمتی ہیں۔ وہ صاحب آئے اور انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے ایک گُر کی بات پوچھی۔ اِس کو اچھی طرح سنیے اور دل میں اتاریے۔ بہت ضروری مسئلہ ہے۔ اللہ تعالی میرے دل میں اتار دے اور آپ لوگوں

کے دل میں اتار دے۔ ہمارے بچے بیٹھے سن رہے ہیں یہ بھی ابھی سے اس کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سوال کیا کہ 'اے اللہ کے رسول! کوئی ایسا عمل مجھے بتا دیجیے، کوئی ایسا کام مجھے بتا دیجیے کہ جب میں اس کام کو کرلوں، اسے بجالاؤں تو مجھ سے اللہ تعالیٰ محبت فرمائیں'۔ سوال بہت بڑا ہے۔ اللہ کی محبت اگر حاصل ہو جائے تو ساری دنیا قربان ہے۔ وہ محبت فرمائیں، وہ مان جائیں، وہ کہہ دیں کہ مجھ کو اِس بندے سے محبت ہے، بہت بڑی بات ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو ساری کائنات اُس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ 'اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجیے کہ میں اُس کو کروں تو اللہ تعالیٰ مجھ سے محبت فرمائیں'۔

مگر آدمی اس دنیا میں رہتا ہے تو اس کو اِس کی بھی ضرورت ہے کہ لوگوں کے درمیان بھی محبوب بن کر رہے، لوگ بھی اس سے محبت کریں۔ اگر کسی انسان سے لوگ نفرت کریں، اس سے دشمنی رکھیں تو یہ اس انسان کی بڑی بدقسمتی ہے۔ اور اگر اس سے محبت کرنے والے بہت ہیں تو یہ اس کی خوش نصیبی ہے۔ دیکھیے حدیث شریف میں ایک دعا آتی ہے، جب آدمی سفر کرتے ہوئے کسی بستی میں پہنچے تو حضور اکرم ﷺ نے ایک دعا تعلیم فرمائی ہے " اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيهَا" اے اللہ! اس آبادی میں، اس بستی میں میرے لیے برکت عطا فرمائیے۔ "اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا جَنَاهَا" یا اللہ! اس بستی کے جو تازہ پھل ہیں، یہاں کی جو نعمتیں ہیں، وہ مجھ کو عطا فرمائیے۔ "وَحَبِّبْنَا اِلىٰ اَهْلِهَا" اے اللہ! اس بستی والوں کے نزدیک مجھے محبوب کر دیجیے۔ یعنی اس بستی والے مجھے پسند کریں۔ "وَحَبِّبْ صَالِحِي اَهْلِهَا اِلَيْنَا" (اخرجه الطبرانی فی الاوسط عن ابن عمر رضی اللہ عنہ) جو لوگ یہاں نیک ہیں ان کی محبت میری دل میں پیدا فرما دیجیے۔ انسانوں کی محبت بھی بہت بڑی چیز ہے۔ دعا کی گئی ہے " اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ صَبُوْرًا اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ شَكُوْرًا اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَيْنِیْ صَغِيْرًا وَفِیْ اَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيْرًا" (رواه الديلمی فی مسند الفردوس)

یا اللہ! مجھے بہت زیادہ صبر کرنے والا اور بہت زیادہ شکر کرنے والا بنا دیجیے۔ اے اللہ! مجھے میری نگاہ میں ہلکا دکھایئے مگر لوگ مجھے بڑا سمجھیں۔ لوگوں کے دلوں میں میری محبت و عظمت ہو۔

عُرُوَةُ الْوُثْقیٰ (مضبوط کڑا) کیا ہے؟:

آدمی محبت کرے آدمی سے، یہ بھی بڑی بات ہے۔ اگر اللہ کے واسطے یہ محبت ہو جائے تب تو بہت بڑی بات ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ صحابہ کرام سے پوچھا کہ بتاؤ ”عُروَةُ الوُثقیٰ“ کیا ہے؟ ’مضبوط کڑا۔ یعنی ایسا کڑا کہ اگر پکڑ لیا جائے تو نہ ٹوٹے اور نہ چھوٹے۔ صحابہ کرام نے اپنی اپنی دانست کے اعتبار سے جواب دینے کی کوشش کی، کسی نے کہا کلمہ ’لا الہ الا اللہ‘ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ’ہاں ہے مگر میں وہ مراد نہیں لیتا۔‘ کسی نے کہا ’نماز ہے۔‘ آپ نے فرمایا ’ہاں ہے مگر میں وہ مراد نہیں لیتا۔‘ کسی نے کہا ’جہاد ہے۔‘ فرمایا ’ہاں ہے مگر میں وہ مراد نہیں لیتا۔‘ تب صحابہ کرام سمجھ گئے کہ کوئی علم آپ ﷺ دینا چاہتے ہیں، کوئی خاص بات بتانا چاہتے ہیں۔ تو لوگوں نے عرض کیا کہ ’اے اللہ کے رسول! آپ ہی بتا دیجیے کہ عُروَةُ الوُثقیٰ کیا ہے؟‘ مضبوط کڑا کیا ہے کہ جس کو ہم تھام لیں، جس کو ہم پکڑ لیں تو ہم نہ گریں، نہ ہمارے ہاتھ سے چھوٹے، نہ وہ ٹوٹے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ’عُروَةُ الوُثقیٰ‘ اللہ کے واسطے محبت رکھنا ہے۔ غرض کی محبت نہیں، یہ تو بڑی ناپائیدار محبت ہے۔ مجھے آپ سے غرض ہے تو میں آپ کے لیے ہر جتن کرتا ہوں بہت کوشش کرتا ہوں۔ لیکن جس دن آپ نے میری ضرورت پوری کر دی تو پھر آپ کہیں جایئے مجھ سے کوئی مطلب نہیں۔ یہ تماشا ہم لوگ روز دیکھتے ہیں۔ الیکشن آجاتا ہے تو نیتا جی کو ہماری ضرورت ہے، ہم سے ووٹ لینا ہے تو گھر گھر جاتے ہیں، ہاتھ پیر سب جوڑتے ہیں، پیسے بھی لا کر دیتے ہیں، رشوتیں بانٹتے ہیں۔ معمولی معمولی غریب گھرانوں میں جا کر پیسے دیتے ہیں، اس لیے کہ ان کو ووٹ چاہیے۔ اور جب آپ ووٹ دے کر فارغ ہو گئے تو اب آپ جایئے تو پہچاننے کو تیار نہیں کہ آپ کون ہیں؟ دنیاوی غرض کی

محبت کوئی چیز نہیں، نفسانی محبت یعنی اپنے جذبات کی محبت بھی کوئی چیز نہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ اللہ کا حکم ہے محبت کرنے کا تو ہم محبت کرتے ہیں، اللہ نے چاہا ہے کہ باپ سے محبت کرو تو کرتے ہیں۔ یہ محبت ٹوٹے گی نہیں۔ اللہ چاہتے ہیں کہ بیوی سے محبت کریں تو یہ محبت کبھی نہیں ٹوٹے گی۔ اگر صرف نفسانی محبت ہے، تعلق ہو گیا ہے، شادی ہو گئی ہے تو یہ کبھی بھی ختم ہو سکتی ہے۔ کوئی بات ہو گئی تو ساری محبت ختم ہو جاتی ہے۔

للہ فی اللہ محبت پائیدار ہوتی ہے:

حضرت مولانا تھانوی علیہ الرحمہ کے یہاں دو بیویاں تھیں۔ ان میں سے ایک خاتون حضرت مولانا سے کہتی ہیں کہ ’آپ کو ہم سے کوئی محبت نہیں ہے، کوئی تعلق ہم سے نہیں ہے۔‘ مولانا نے پوچھا ’کیوں؟‘ کہا ’آپ ہم لوگوں سے بولتے ہیں، ہمارے پاس آتے ہیں، ہمارے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں۔ یہ سب اس لیے کرتے ہیں کہ اللہ تعالی کا حکم ہے۔ خدا کا حکم پورا کرتے ہیں ورنہ ہم سے آپ کو کیا تعلق؟‘ اور یہ واقعہ ہے، ایسا ہوتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے بارے میں احادیث میں آتا ہے کہ ’گھر میں آپ اپنی ازواج مطہرات سے باتیں کرتے ہوتے کہ اچانک اذان کی آواز آتی ہے تو ایسے ہو جاتے جیسے کوئی جان پہچان ہے ہی نہیں۔ اس لیے کہ اب اللہ کے دربار میں حاضر ہونا ہے۔

ایک نفسانی محبت ہوتی ہے کہ بیوی جو کچھ کہہ دے وہ کرنا ہے۔ اس نے کہہ دیا ’بیٹھ جاؤ‘ تو بیٹھ گئے۔ کہا ’کھڑے ہو جاؤ‘ تو کھڑے ہو گئے۔ جو نفسانی محبت ہوتی ہے وہ کچھ دنوں تک چلتی ہے پھر ختم ہو جاتی ہے مگر جو محبت اللہ کی وجہ سے ہوتی ہے ہمیشہ باقی رہتی ہے۔

حضرت تھانوی کی بیوی نے کہا کہ ’ہم سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ یہ تو اللہ سے تعلق کی وجہ سے، اللہ سے محبت کی وجہ سے ہے۔ چوں کہ ان کا حکم ہے تو آپ ہمارا حق ادا کرتے ہیں ورنہ کون ہم کو پوچھے؟‘ حضرت نے فرمایا کہ ’اللہ کا شکر ادا کرو کہ اللہ کے لیے محبت ہے تو کبھی بھی میں تم سے بے وفائی نہیں کرسکتا، اس لیے کہ اللہ کا حکم ہمیشہ کے لیے

تمھارے ساتھ حسن سلوک کا ہے۔ کوئی وقت ایسا نہیں آئے گا کہ میں تم سے رخ موڑ لوں۔ اورنفسانی محبت ہوتی تو کسی وقت رخ مڑ جاتا۔ دنیاوی غرض کی محبت کا تو یہ حال ہے کہ کہتے ہیں کہ 'غرض پر تو گدھے کو بھی باپ کہا جاسکتا ہے۔' اور لوگ ایسا کرتے بھی ہیں اور جیسے ہی غرص پوری ہوتی ہے، لات مار کر چلے جاتے ہیں۔ اور جو محبت اللہ کے لیے ہوتی، اللہ کے حکم سے ہوتی ہے، وہ کبھی نہیں ٹوٹتی۔ ہاں اگر اللہ کا حکم بدل جائے تو صاف صاف بات یہ ہے کہ ہم کسی کے وفادار نہیں۔ اللہ کے وفادار ہیں رسول کے وفادار ہیں۔ وہ کہیں گے کہ اس سے محبت کرو تو ہم محبت کریں گے اور کہیں گے نہیں تو نہیں کریں گے۔

کام آنے والی محبت للہ فی اللہ ہے:

یہ اصل محبت ہے۔ قیامت کے دن کے بارے میں اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں
"اَلْاَخِلَّاءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ" (سورة الزخرف آية ٦٧)
جتنے دوست ہیں، چاہے کتنی ہی جگری دوستی ہوں، کتنی ہی محبت ہو، میدان قیامت میں سب ایک دوسرے کے دشمن ہوجائیں گے، سوائے تقوی والوں کے، یعنی اللہ والوں کے۔ اللہ والوں کو اللہ والوں سے یا اللہ کے بندوں سے جو محبت ہوتی ہے وہ اللہ کے واسطے ہوتی ہے۔ اور یہی محبت قایم رہے گی، باقی سب ختم ہوجائے گی، کوئی کسی کو چاہنے والا نہیں ہوگا۔ باپ بیٹے کو نہیں چاہے گا، بیٹا باپ کو نہیں چاہے گا، ماں اپنی اولاد کو نہیں چاہے گی، اولاد اپنی ماں کو نہیں چاہے گی، اگر اللہ کے لیے نہیں ہے۔ اور اگر اللہ کے لیے ہے تب وہی ماں، وہی باپ خوب ایک دوسرے سے تعلق رکھیں گے۔

"اَلْاَخِلَّاءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ"۔ 'اَخِلَّاء' خلیل کی جمع ہے۔ خلیل کہتے ہیں انتہائی گہرا قلبی دوست، دنیا میں جس کی دوستی ٹوٹنے کا سوال نہ پیدا ہوتا ہو۔ وہ سب قیامت کے دن ٹوٹ جائے گی، مگر صرف وہی دوستی جو تقوی کی وجہ سے، اللہ کی وجہ سے ہوگی، وہ نہیں ٹوٹے گی، وہ باقی رہے گی، وہ قیامت کے دن بھی قایم رہے گی۔ اس کا قیامت کے دن بہت نفع پہنچے گا۔ یہ مُتَحَابُّوْنَ فِی اللّٰہِ جو اللہ کے واسطے

محبت رکھنے والے ہیں، اس دن بے فکر رہیں گے۔

حدیث میں آتا ہے کہ ”عَنْ اَنس بِنِ مَالِكٍ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ لِلّٰهِ عِبَاداً يُوْضَعُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَنَابِرُ مِنْ نُوْرٍ لَيْسُوْا بِاَنْبِيَاء وَلَا شُهَدَاء يَغْبِطُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ وَ الشُّهَدَاءُ۔ فَقَالُوْامَنْ هُمْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ هُمْ مُتَحَابُّوْنَ فِى اللّٰهِ“۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے کچھ بندوں کے لیے نور کے منبر قایم فرمائے گا، وہ بندے نہ انبیا میں سے ہوں گے اور نہ ہی شہدا میں سے، بلکہ انبیا و شہدا اُن پر رشک کریں گے۔ صحابہ کرام نے پوچھا کہ ’اللہ کے رسول! یہ کون خوش نصیب لوگ ہوں گے؟‘ جواب دیا کہ ’یہ وہ لوگ ہوں گے جو محض اللہ کے لیے ایک دوسرے محبت کرتے ہیں۔‘

حضرت معاذ بن جبل ؓ کی ایک حدیث میں ہے ”سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ: اَلْمُتَحَابُّوْنَ فِىْ جَلَالِىْ لَهُمْ مَنَابِرُ مِنْ نُوْرٍ يَغْبِطُهُمُ النَّبِيُّوْنَ وَالشُّهَدَاءُ“ (ترمذی) معاذ بن جبل ؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ’میری عظمت و بزرگی کے لیے آپس میں محبت کرنے والوں کے لیے قیامت کے دن نور کے ایسے ممبر ہوں گے جن پر انبیاء و شہدا بھی رشک کریں گے۔

غرض یہ محبت بڑی قیمتی ہے۔ یہ محبت اگر حاصل ہو جائے تو انسان انسان بن جائے اور اگر یہ نہ ہو تو وہ کچھ اور ہے۔

عنداللہ وعندالناس محبوبیت کا نسخۂ کیمیا:

وہ صحابی سوال کرتے ہیں کہ ’اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسا عمل بتایئے جب میں اس کو کروں تو اللہ مجھ سے محبت کرنے لگیں‘۔ سبحان اللہ! اور جس سے اللہ نے محبت کر لی وہ کامیاب در کامیاب ہو گیا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی......’اور جب میں اس عمل کو کروں تو لوگ بھی مجھ سے محبت کرنے لگیں‘۔ اس سے بڑھ کر کون خوش نصیب ہوگا جس سے لوگ بھی محبت کریں اور اللہ بھی محبت کرے۔ دشمنی بھی اگر ایسے شخص سے کسی

کو ہوگی تو عارضی ہوگی، ختم ہو جائے گی۔

رسول اللہ ﷺ سے لوگوں نے بہت دشمنی کی، بہت دشمنی کی۔ آپ ﷺ طائف گئے تو وہاں لوگوں نے بہت دشمنی کی، بہت تکلیف پہنچائی لیکن جب طائف سے لوٹے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے نقشہ ہی بدل دیا۔ پہلے جناتوں کو بھیجا، جو غیبی مخلوق ہیں کہ جاؤ اسلام لاؤ۔ حضور ﷺ قرآن پڑھ رہے ہیں، تمام جنات آگئے اور آپ کو گھیر لیے۔ آپ ﷺ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیے۔ اب تو تسلی ہوئی کہ لوگ نہیں مانتے، محبت نہیں کرتے تو یہ آئے ہیں محبت کرنے۔ اچھا اور ٹھہرو! پھر کچھ دن کے بعد آپ ﷺ سے کہا گیا ’چلو آسمان پر۔‘ ایک ہی رات میں بیت المقدس، ساتوں آسمان دکھا دیا گیا کہ یہ سارا آسمان تم سے محبت کرتا ہے سب تمھارے ساتھ ہیں۔ اگر دنیا کے چند لوگ تم سے محبت نہیں کرتے تو کیا تکلیف کی بات ہے؟

صرف اتنے ہی پر بس نہیں ہوا بلکہ پھر یہ ہوا کہ جو لوگ آپ سے محبت نہیں کرتے تھے، آپ کی دشمنی کے درپے تھے، ان کے قلوب کو اللہ نے پھیر دیا اور آپ کی محبت ان کے رگ و ریشے میں بسا دی۔ حضرت ہندہ حضرت ابوسفیان ؓ کی بیوی جب مسلمان ہوئی ہیں تو کہتی ہیں کہ ’اے اللہ کے رسول! آپ کے چہرے سے زیادہ مجھے کسی چہرے سے نفرت نہیں تھی۔ مگر آج آپ کے چہرے سے زیادہ کوئی محبوب نہیں ہے۔‘ آپ ﷺ مدینہ طیبہ ہجرت کر کے گئے تھے، کیسا چھپ کر گئے تھے۔ تین دن غار ثور میں رہے، پھر نکلے ہیں تو آہستہ آہستہ مدینہ پہنچے ہیں۔ مگر دس سال کے بعد جب حضور ﷺ حج کے لیے آرہے ہیں تو آپ کے ساتھ ایک بہت بڑا لشکر تھا۔ حضرت جابر ؓ فرماتے ہیں کہ ’میں ٹیلے پر چڑھ گیا اور دیکھا کہ آپ ﷺ کے آس پاس انسانوں کا جم غفیر تھا، صرف سر ہی سر نظر آرہے تھے۔‘ یہ سب لوگ وہ تھے جو آپ سے انتہا درجہ محبت رکھنے والے تھے۔

انھوں نے جو سوال کیا کہ ’مجھے ایسا عمل بتا دیجیے کہ اس کے کرنے سے میں خدا کے نزدیک پسندیدہ ہو جاؤں اور مخلوقِ خدا کے نزدیک بھی۔‘ سوال بڑا ٹیڑھا ہے۔ اس

سوال کا جواب پیغمبر کے علاوہ کوئی نہیں دے سکتا، کوئی کتنا ہی زور لگائے جواب نہیں دے سکتا، چاہے کتنا ہی بڑا فلسفی ہو، چاہے کتنا ہی بڑا مصلح ہو، نہیں دے سکتا۔ رسول اللہ ﷺ نے دو مختصر جملوں میں اس کا جواب دیا اور ایسی بات بتائی جو قیامت تک کے لیے ہے۔ خدا کی منشا کے عین مطابق اور انسان کی نفسیات کے عین مطابق۔ ایسا تیر بہدف نسخہ بتلایا کہ کبھی چُوک نہیں سکتا، جس کا جب جی چاہے اس کو آزما کر دیکھ لے۔ کسی بھی زمانہ میں ایک رتّی نتیجہ میں فرق نہیں آئے گا۔ وہ نسخہ کیا تھا ”اِزْهَدْ فِی الدُّنْیَا یُحِبَّكَ اللّٰهُ وَازْهَدْ فِیْ مَا عِنْدَ النَّاسِ یُحِبُّوْكَ“ (ابن ماجه) دینا سے زُہد اختیار کرلو، دنیا سے مستغنی ہوجاؤ، دنیا کو جھاڑ کر پھینک دو، دنیا کو ویسے ہی برتو جیسے خدا نے برتنے کا حکم دیا۔ اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔ اور دنیا والوں کے پاس جو ہے یعنی مخلوقِ خدا کے پاس جو کچھ ہے، اس سے یکسو ہوجاؤ، ان کے سامنے کبھی دستِ سوال نہ بڑھاؤ، ان کے مال کی طرف کبھی نگاہِ التفات نہ ڈالو، ان سے کبھی کچھ لینے کی کوشش نہ کرو، حتی کہ ان سے اپنی عزت بھی نہ طلب کرو۔ مخلوق مجبور ہوگی تم سے محبت کرنے پر۔ وہ خود بخود تمھارے تقاضے کے بغیر تم سے محبت کرنے لگے گی۔

بظاہر یہ دو مختصر جملے ہیں مگر اس میں ایک جہانِ معانی پوشیدہ ہے۔ دنیا و آخرت کی فلاح پوشیدہ ہے۔ واقعی نبی کا کلام بھی کلاموں کا نبی ہوتا ہے۔ ایسا جامع کلام نبی ہی کی زبان سے نکل سکتا ہے۔ ضرورت اس بات ہے ہم اس کو گرہ باندھ لیں، حرزِ جان بنالیں، اسی کے مطابق زندگی ڈھالنے کی کوشش کریں۔ اگر ایسا ہوگیا تو پھر ان شاء اللہ زمین آسمان ہماری محبت سے بھر جائے گا اور ہر طرف اس پر عمل کرنے والے کی محبت کا غلغلہ مچ جائے۔ بس شرط یہ ہے جیسا زبانِ نبوت سے نکلا عمل بھی ویسا ہی ہو۔

اللہ تعالی ہم کو اس پر عمل کی توفیق بخشے اور دونوں جہاں میں کامیاب بنائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین

❑❑❑

رزق حلال کا اہتمام ضروری ہے

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِ الْعَالِمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی آلِه وَاَصْحَابِه اَجْمَعِیْنَ۔ اَمَّا بَعْدُ:

فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمان الرحیم۔

یَا اَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ۔ (سورۃ المومنون آیۃ ۵۱)

محترم بزرگو اور دوستو! اس وقت ایک مختصر سی بات عرض کرنی ہے اور یہ بات بہت کام کی اور ضروری ہے۔ اس سے غفلت کی وجہ سے آدمی نے اپنی دنیا و آخرت دونوں برباد کر رکھی ہے۔ جو آدمی اس سے غافل ہو، اس کو دنیا و آخرت دونوں جگہ کا عذاب بھگتنا ہے اور جس نے اس کا اہتمام کیا، اس کے لیے دنیا میں بھی چین ہے، راحت ہے، قلبی سکون ہے، اطمینان ہے اور آخرت میں بھی پورے طور سے اطمینان و سکون اور حق تعالیٰ کی رحمت ہے۔ اور یہ بات جسے میں کہنا چاہتا ہوں اللہ نے رسولوں کو مخاطب کر کے کہی ہے۔ فرماتے ہیں "یَا اَیُّھَا الرُّسُلُ" "اے رسولو! ظاہر ہے کہ جو حکم اتنا اہم ہو کہ اس کے لیے رسولوں کو مخاطب کیا گیا ہے، وہ عام بندوں کے لحاظ سے کتنی اہمیت کا حامل ہوگا! پھر ارشاد ہوا" کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبَاتِ "پاکیزہ اور حلال چیزیں کھاؤ۔

انسان کی روزی دو طرح کی ہے:

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی روزی کا اہتمام فرمایا ہے، اور یہ روزی دو طرح کی ہیں۔ ایک حلال روزی ہے، اور دوسرے حرام روزی ہے۔ قرآن پاک میں دونوں طرح

کی روزیوں کا تذکرہ ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے ”وَلَا تَـأْكُـلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ “ (سورۃالبقرۃ آیة ١٨٨) اپنے مالوں کو آپس میں غلط طریقے سے مت کھاؤ۔ دوسری جگہ ارشاد ہے ” يَـا اَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ اٰمَـنُـوْا لَا تَأْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ “(سورۃالنساء آیة ٢٩) اے ایمان والو! اپنے مالوں کو ناحق اور ناجائز طور سے مت کھاؤ مگر یہ کہ آپس کی رضامندی کے ساتھ خرید وفروخت ہو (تو یہ تمھارے لیے حلال ہے) معلوم ہوا کہ مال کھانے کے بعض طریقے حلال ہیں اور بعض طریقے حرام ہیں۔ حلال طریقے سے حاصل کیا ہوا مال حلال روزی ہے اور حرام طریقے سے لیا ہوا مال حرام روزی ہے۔ دونوں طرح کی روزیاں دنیا میں بکھری پڑی ہیں۔ اللہ تعالی نے انسان کے لیے روزی مقدر کی ہے لیکن اس کے سامنے دونوں طرح کی روزیاں ہیں، حلال بھی ہے حرام بھی ہے۔

رزقِ حرام انسان کے امتحان کے لیے ہے:

اور یہ بھی انسان کے لیے امتحان اور آزمائش کی چیز ہے کہ دونوں طرح کا راستہ کھلا ہوا ہے۔ ایک راستہ یہ ہے، اور ایک راستہ وہ ہے۔ آدمی اپنے اختیار سے جس پر چاہے چلے۔ اُسے اختیار ہے کہ روزی حلال طریقے سے حاصل کرے یا حرام طریقے سے۔ لیکن اس کے بعد اللہ نے اسے پابند کیا ہے کہ دیکھو حرام روزی کے طریقوں کو اختیار تو کر سکتے ہو، اس کی قدرت تو ہے لیکن خبردار! اس کے قریب نہ جاؤ۔

حرام وحلال کی یہ تفریق وحد بندی اللہ تعالی نے ابتدا ہی سے کر رکھی ہے۔ سیدنا شعیب علیہ السلام ایک ایسی قوم میں پیدا ہوئے تھے جو تاجر تھی۔ لیکن وہ تجارت میں کمی بیشی کیا کرتی تھی۔ لینے کا پیمانہ دوسرا بنا رکھا تھا اور دینے کا پیمانہ دوسرا۔ اُنھوں نے اپنی قوم سے کہا: ’اے لوگو! تم حلال طریقے سے مال حاصل کرو۔‘ اس پر ان لوگوں نے ان پر الزامات لگانے شروع کر دیے لیکن انھوں نے صاف طور سے ارشاد فرمایا کہ ’اللہ نے تم کو روزی دی ہے تو اس میں حرام کا ارتکاب نہ کرو اور غلط اور ناجائز طریقہ مت اختیار کرو۔‘

آدمی بسا اوقات یہ خیال کرتا ہے کہ ہم حلال روزی اختیار کریں گے تو ہماری آمدنی بہت کم ہوگی۔ بے شک ہوسکتا ہے کہ آمدنی کم ہو۔ حرام طریقہ میں یکایک بہت ساری آمدنی ہوجاتی ہے۔ آدمی ڈاکہ ڈالے، اکٹھا بہت ساروپیہ حاصل ہوجائے گا۔ رشوت لے، بہت ساروپیہ جمع ہوجائے گا۔ چوری کرلے، بہت ساروپیہ ہاتھ لگ جائے گا۔ لیکن وہ سارے روپے جو زیادہ نظر آرہے ہیں، بہت تھوڑے ہیں۔ اور حلال روپیہ تھوڑا بھی ہوگا تو اس کی برکت کی وجہ سے وہ بہت زیادہ ہوجائے گا۔ لیکن آدمی اس کا احساس نہیں کرتا۔ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ’اگر حلال روزی ملنے میں دیر ہورہی ہو تو کبھی حلال کو چھوڑ کر حرام کے اندر مت پڑ جانا‘ گو کہ دیر ہورہی ہے، گو کہ تم کو دشواری محسوس ہورہی ہو لیکن اس جلدی میں کہ روزی زیادہ ملے، ایسا نہ ہو کہ تم حلال روزی چھوڑ کر حرام کے اندر پڑ جاؤ اور حرام روزی کمانے میں لگ جاؤ۔ اس لیے کہ حرام روزی میں پرورش پانے والا خون اور گوشت جہنم کا مستحق ہے۔ حرام روزی سے بنا ہوا جو بھی انسان کا حصۂ جسم ہوگا، خون ہو، گوشت ہو، پوست ہو، سب جہنم کے قابل ہیں۔

عمل صالح کی بنیاد رزق حلال ہے:

اللہ تعالی نے یہاں دو چیزوں کو ایک ساتھ جوڑ رکھا ہے۔ ”یَا اَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا“ اے رسولو! تم پاکیزہ اور حلال روزی کھاؤ اور عمل صالح کرو۔ ان دونوں کو ایک ساتھ ذکر کرنے کا راز اور منشا یہ سمجھ میں آتا ہے کہ آدمی جب حلال روزی کھائے گا تو اس سے بہتر اعمال سرزد ہوں گے۔ اس لیے کہ حلال روزی پاکیزہ چیز ہے اور پاکیزہ چیز کھانے سے پاکیزہ اثرات پڑیں گے۔ اسی جسم سے سارے اعمال صادر ہوتے ہیں، اسی جسم کے اندر ایمان ہے، اسی جسم کے اندر تقوی وطہارت ہے، اسی جسم سے نماز روزہ اور دوسری عبادات ہیں۔ ساری عبادتوں اور سارے اعمال کا تعلق اسی جسم سے ہے اور اس جسم کی پرورش کھانے سے ہوتی ہے۔ تو جب حلال اور جائز کھانا ہوگا تو اچھے اعمال سرزد ہوں گے۔ حرام اور ناجائز کھانا ہوگا تو برے اعمال سرزد ہوں گے۔ اللہ تعالی چاہتے ہیں

بندے اچھے اعمال پیش کیا کریں۔

اللہ تعالیٰ صرف پاکیزہ چیز قبول کرتے ہیں:

حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”اَللّٰہُ طَیِّبٌ لَا یَقْبَلُ اِلَّا طَیِّباً“ (رواہ مسلم) اللہ پاک ہے اور پاک چیز کے علاوہ کوئی چیز قبول نہیں کرتا۔ وہی چیز قبول کرے گا جو پاک ہوگی۔ ناپاک چیز وہ قبول نہیں کرے گا۔

مومن کو اللہ نے اپنے دربار میں حاضری کے لیے نماز کا حکم دیا تو شرط قرار دیا کہ وضو کرکے پاک ہوکر آؤ۔ ناپاکی کے ساتھ تمھاری نماز قبول نہیں ہوگی، چاہے وہ ناپاکی ظاہراً نظر نہ آئے۔ بے وضو ہونا ایسی ناپاکی ہے جو ظاہراً نظر نہیں آتی لیکن اس کے باوجود اللہ بے وضو کی نماز قبول نہیں کرتے۔ پاک ہو لو، کپڑے پاک کرلو، بدن پاک کرلو وضو کرلو، جگہ پاک ہو، تمام شرطیں پاکی کی لگادی ہیں۔ اس کے بعد نماز قبول ہوگی۔ اس کے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی۔ تو معلوم ہوا کہ انسان کو اللہ تعالیٰ سر سے پاؤں تک، اندر سے باہر تک پاک ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اندر کی پاکی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کھانا پاک ہو، تاکہ اس سے پاک اعمال پیدا ہوں۔ جب انسان حرام روزی کھائے گا اور حرام روزی کا طریقہ کا اختیار کرے گا تو بظاہر اچھا عمل کرتا ہوا بھی نظر آئے گا لیکن وہ اچھا عمل اللہ کے حضور جائے گا ہی نہیں۔ اس لیے کہ وہ ناپاک جسم سے نکل رہا ہے، ناپاک دل سے اس کا ظہور ہو رہا ہے، وہ نجس خون سے تیار ہوا ہے۔ لہٰذا وہ خدا تک جانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ آدمی حرام روزی حاصل کرنے کو تو کرلے گا اور اسے کھا بھی لے گا لیکن اس کا حاصل یہی نکلے گا جیسے جانور ہوتے ہیں، کبھی پیشاب پیتے ہیں، کبھی پاخانہ کھاتے ہیں تو ان کا جسم کیسا تیار ہوتا ہے؟ ان کا گوشت کیسا تیار ہوتا ہے؟ ان کا دودھ کیسا تیار ہوتا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ جیسی غذا ہوگی ویسے ہی اثرات پیدا ہوں گے۔ تو اگر ہم نے حرام غذا کھائی تو حرام اور غلط قسم کے افعال و اعمال صادر ہوں گے۔

نیکی اور تقویٰ کے لیے رزق حلال کا اہتمام ضروری ہے:

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ حلال روزی کا اہتمام کرتے ہیں اکثر و بیشتر آپ ان کو

نیک دیکھیں گے۔ ان کے اعمال صحیح ہوں گے۔ اور اگر حلال روزی کا اہتمام نہیں ہے تو اعمال کی گارنٹی نہیں ہے کہ کب ایمان دل سے نکل جائے۔ اس لیے کہ اس نے اپنے جسم کے اندر ایک ناپاک چیز داخل کر لی ہے تو اس کے ایمان کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ اسی لیے حضرات صحابہ کرام اور ان کے بعد لوگوں نے بھی اس کا بہت اہتمام کیا۔ سود نہیں، رشوت نہیں، چوری کا مال نہیں، ڈاکے کا مال نہیں، کوئی بھی ناجائز طریقے سے حاصل کیا ہوا مال گھر میں آ جائے تو مصیبت بن جاتا ہے۔ اور اس کو کسی طریقہ سے گوارا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چھوٹے بچے بھی اگر باہر سے کوئی سامان لے آئیں اور معلوم ہوا کہ ہمارا نہیں ہے تو جب تک اس کو گھر سے نکال نہ دیا جائے چین نہیں آتا تھا۔ اس لیے کہ وہ مال ہمارا نہیں ہے، ہمارے لیے حلال نہیں ہے، پاکیزہ نہیں ہے۔ اب ہمارے زمانے میں معاملہ اس کے برعکس ہو گیا ہے۔ آدمی حرص و ہوس کی وجہ سے صرف مال چاہتا ہے وہ اس کو نہیں دیکھتا کہ کس طور پر گھر میں آیا ہے؟ جائز طریقے سے آیا ہے ناجائز طریقے سے آیا ہے؟ رشوت کا مال ہے، چوری کا مال ہے یا کس طریقے سے کمایا گیا ہے؟ اس کا کوئی اہتمام نہیں ہے۔

رزق کے تین ذرائع۔ پہلا کاشتکاری:

عموماً مال جو آتا ہے وہ تین چار طریقے سے آتا ہے۔ ایک طریقہ کاشتکاری کا ہے۔ کاشتکاروں کی روزی بڑی حلال ہوتی ہے، بہت صاف ستھری ہوتی ہے، اس لیے کہ وہ براہ راست زمین سے حاصل ہوتی ہے۔ اپنا بیج ڈالا، اپنی زمین میں ڈالا، اس میں جو کچھ پیدا ہوا اپنا ہے۔ اس میں حرام ہونے کا شائبہ نہیں ہے۔ لیکن آدمی اس کو بھی اپنی بری نیت کی وجہ سے اور غلط استعمال کی وجہ سے حرام بنا لیتا ہے۔ یہ کھیت خاص اس کی ملکیت ہے، اس میں کسی دوسرے کا حق نہیں ہے لیکن آدمی جوتنے جاتا ہے تو تھوڑا سا دوسرے کا بھی شامل کر لیتا ہے۔ ذرا سی آڑ ہی مار لی، اب جس حصہ کو اس نے اپنے کھیت میں شامل کر لیا آیا وہ راستہ تھا یا دوسرے کا کھیت تھا یا دوسرے کی میڑھ تھی؟ راستہ کو اپنے

کھیت میں شامل کر لینا یہ بھی ناجائز ہے اور دوسرے کے کھیت یا میڑھ کو شامل کر لینا یہ بھی ناجائز ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے دونوں کے بارے میں ایک ہی بات ارشاد فرمائی ہے کہ ’مسلمانوں کا کوئی راستہ ہو اور اس راستہ کو کوئی کانٹ چھانٹ کر اپنی زمین میں شامل کر لے تو قیامت کے دن اتنے حصے کو ساتوں زمینوں کا طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا اور جہنم میں پھینک دیا جائے گا‘ اسی طرح اگر دوسرے کے مال کو چھین لیا ہے یا دوسرے کی زمین لے لی ہے، اس کے لیے بھی یہی حکم ہے۔ لیکن کسانوں کو اس وقت تک تسکین نہیں ہوتی جب تک ایک آدھ ہل دوسرے کے کھیت میں نہ مار لیں۔ شاید سمجھتا ہے کہ اس کی روزی پوری نہیں ہوتی ہے جب تک اپنے حلال کے اندر حرام کو نہیں شامل کر لیتا۔ آدمی راہ چلتے ہوئے دوسرے کے کھیت سے کچھ توڑ لیتا ہے، کچھ لے لیتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ آدمی کو حلال روزی مل رہی ہے لیکن حلال کو چھوڑ کر حرام میں مبتلا ہوتا ہے۔ بچوں کو بھی اس کی تلقین کرنی چاہیے کہ ہرگز ہرگز اپنے کھیت کے علاوہ دوسرے کھیت میں ان کا ہاتھ نہ پڑے۔ اگر بچوں کو شروع سے تربیت دی جائے اور ابتدا ہی سے ان کو سکھایا جائے کہ دوسروں کا مال نہ لیا کریں تو وہ کسی دوسرے کے مال کو ہاتھ تک نہ لگائیں گے۔

حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی کا احتیاط واہتمام:

حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی ایک مرتبہ غالباً کہیں اپنے والد کے ساتھ جا رہے تھے۔ ان کے والد محتاط نہیں تھے، مگر مولانا شروع ہی سے محتاط تھے۔ راستے میں ایک درخت پر کچھ پھل تھے، ان کے والد نے ایک پھل توڑ کر کھا لیا۔ مولانا نے عرض کیا کہ ’یہ آپ کا مال نہیں تھا دوسرے کا تھا‘ کہنے لگے ’میاں! اس سے کیا ہوگا؟‘ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے اور حضرت مولانا فضل رحمان صاحب وہیں کھڑے رہے۔ باپ نے دیکھا کہ بیٹا نہیں آ رہا ہے تو پوچھا کہ ’کہاں رہ گئے؟‘ کہا کہ ’رکا ہوا ہوں کہ وہ آدمی جس کا یہ درخت ہے، آئے گا تو اس سے اجازت لے لوں گا تب آگے بڑھوں گا‘

دیکھیے یہاں تو بیٹے ہی نے پاپ کو سکھا دیا۔ لیکن اب تو اس طرح کی باتیں سیکھنے اور سکھانے کا دروازہ ہی بند ہو گیا۔ ہمارے گھر میں مال آتا ہے تو باپ کو بھی خبر نہیں کہ کس طرح کا مال آیا ہے؟ ماں کو بھی خبر نہیں کہ کس طور سے آیا ہے؟ جو جہاں سے مل گیا لے لیا۔ بلکہ ہم اپنے علاقے میں دیکھتے ہیں گنّا بیل گاڑی یا ٹریکٹر پر جا رہا ہے تو کچھ لوگ مالِ غنیمت کو لوٹنے کے لیے بیٹھے رہتے ہیں اور اس میں سے گنّا کھینچتے ہیں، اور اس کھینچ کر نکالنے کو اپنا کمال سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ یہ حرام روزی ہے، اس طرح دوسرے کا مال دبا لینا اور دوسرے کا مال چھپا لینا یہ سب ناجائز اور حرام ہے۔

گنگوہ کا ایک واقعہ:

حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ایک ہندو شخص گنگوہ میں ایک مسجد کے پاس سے گزرتا تو ہاتھ جوڑ کر وہاں دیر تک کھڑا رہتا، پھر آگے بڑھتا۔ وہاں ایک لکڑی کی ٹال تھی جس پر بڑے میاں بیٹھے رہا کرتے تھے، انھوں نے جب کئی بار اس کو ایسے کرتا دیکھا تو ایک دن بلا کر پوچھا کہ ‘یہ کیا حرکت کرتے ہو؟’ وہ کہنے لگا کہ ‘صاحب! میں ایک مرتبہ باہر سے کما کر آ رہا تھا، تین سو روپے چاندی کے تھے۔ میں یہیں مسجد کے پاس اترا، کنویں میں سے پانی نکال کر نہایا۔ روپیہ کی تھیلی مسجد کی دیوار پر رکھ دی تھی، نہا دھو کر میں اسے بھول کر آگے چلا گیا۔ گھر پہنچا تو خیال آیا، دوڑا ہوا آیا تو تھیلی نہیں ملی۔ اِدھر اُدھر پوچھا جب نہیں معلوم ہو سکا تو مایوس ہو گیا۔ اس کے بعد سے میرا دستور ہو گیا ہے کہ جب یہاں سے گزرتا ہوں تو ہاتھ جوڑ کر کچھ دیر کھڑا رہتا ہوں۔’ بڑے میاں نے پوچھا کہ ‘تمھارا روپیہ تھا؟’ کہا ‘جی ہاں میرا ہی روپیہ تھا۔’ کہا ‘دیکھو کھونٹی پر یہ کیا چیز لٹک رہی ہے؟’ دیکھتے ہی کہنے لگا کہ ‘ہاں یہ میری تھیلی ہے۔’ کہا ‘دیکھو تمھارا روپیہ پورا ہے نا؟’ گنا تو واقعی تین سو تھا۔ انھوں نے دیکھا بھی نہیں تھا کہ اس میں کتنا روپیہ ہے؟ اس نے لے لیا اور کہا کہ آپ کا بڑا کرم ہے کہ آپ نے اس کو بچایا اور اس کی حفاظت کی۔ اس نے بطور شکر گزاری کے کچھ دینا چاہا تو انھوں نے فرمایا کہ ‘مجھے کچھ مت

دو۔ اگر مجھے لینا ہوتا تو کبھی کا کھا پی گیا ہوتا، تم کو خبر بھی نہ ہوتی۔ لیکن اس کا ایک پیسہ بھی میرے لیے حرام ہے، تم لے جاؤ۔ میں نے اس کی اتنے دن حفاظت کی ہے اب مجھے تم سے اس پر کوئی عوض نہیں لینا ہے۔‘

ایک وہ اتنے ایمان دار لوگ ہوتے تھے جنھیں یہ تصور تھا کہ کسی کا مال غلط طریقے سے کھالینا سُوَّر کھانے کے برابر ہے۔ اور ایک ہم ہیں کہ دوسرے کا مال کسی طریقے سے ہم کو مل جائے ہمارے لیے جائز ہے۔

میں کاشتکاری کا تذکرہ کررہا تھا کہ وہ بہت ہی حلال روزی کا ذریعہ ہے۔ کھیتی کے ذریعہ بہت پاکیزہ روزی حاصل ہوتی ہے لیکن آدمی اپنی بداعمالی اور بدنیتی کی وجہ سے اس کو خراب کرلیتا ہے۔

دوسرا ذریعہ: تجارت:

دوسرا ذریعہِ معاش تجارت ہے۔ تجارت بھی حلال روزی کا ایک ذریعہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ”اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاءِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ“ (رواہ الترمذی عن ابی سعید الخذری) **امانت دار اور سچا تاجر قیامت کے دن انبیا، صدیقین اور شہدا کے ساتھ ہوگا۔** اس کو یہ بلند رتبہ کہاں سے حاصل ہوا؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس نے حلال روزی کا اہتمام کیا ہے۔ حلال روزی کا حکم رسولوں کو دیا گیا تھا تو اس نے رسولوں کا اتباع کیا ہے، اس واسطے کل قیامت کے دن رسولوں کے ساتھ اس کا حشر ہوگا۔ لیکن جب اسی پاک طریقہ میں ناپاک عمل شامل کرتا ہے، جھوٹ بولتا ہے یا سود لیتا یا دیتا ہے یا مال میں چوریاں کرتا ہے یا عیب کے باوجود اسے ظاہر نہیں کرتا بلکہ چھپاتا ہے، تو ان اعمالِ بد کی وجہ سے اس مال کے اندر حرمت شامل ہوجاتی ہے اور وہ حلالِ خالص نہیں رہ جاتا۔

تیسرا ذریعہ: ملازمت:

اسی طرح روزی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ملازمت ہے۔ ملازم کو تنخواہ ملتی

ہے۔ یہ تنخواہ حلال ہے، اس لیے کہ اس کی محنت ہے۔ اس نے کام کیا ہے تو اس کا اس کو معاوضہ ملا ہے۔ لیکن ملازم بھی اسے حلالِ خالص باقی نہیں رہنے دیتا۔ اس میں دو طرح سے خرابیاں پیدا کر لیتا ہے۔ اول یہ کہ جو کام اس کے ذمے ہے، اس میں وہ چوریاں کرتا ہے۔ پورا کام نہیں کرتا اور تنخواہ پوری وصول کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کام پورا نہیں کرے گا تو تنخواہ مشتبہ ہو جائے گی۔ سود اور رشوت کی طرح قطعی حرام تو نہیں ہوتی لیکن اس میں حرمت کا غبار شامل ہو جاتا ہے، اس لیے کہ اس نے کام میں چوری کی ہے۔ پوری تنخواہ کا استحقاق نہ ہونے کے باوجود اس نے پوری تنخواہ لی ہے۔

ہمارے اکابر کا اہتمام وتقوی:

ہمارے اکابر کا یہ حال تھا کہ کام کے درمیان اگر کچھ اپنا کام کر لیا تو اس کو نوٹ کر لیتے تھے اور بعد میں اپنی تنخواہ میں سے اتنا وضع کرا دیتے تھے۔ چوں کہ اتنی دیر ہم نے کام نہیں کیا ہے لہٰذا ہم یہ تنخواہ نہیں لیں گے، اس کے ہم مستحق نہیں ہیں۔ بڑے محتاط لوگ تھے۔ حضرت مولانا منیر صاحب نانوتوی ایک بزرگ تھے، دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے۔ وہ چندہ کرنے گئے اور راستے میں سارا مال چوری ہو گیا۔ وہ غریب آدمی تھے، اس کی ادائیگی کے لیے متفکر تھے۔ حضرت گنگوہی دارالعلوم دیوبند کے سرپرست تھے۔ انھوں نے اربابِ انتظام سے کہہ دیا تھا کہ 'مولوی صاحب نے مال کی حفاظت میں کوتاہی نہیں کی تھی، لیکن اس کے باوجود غائب ہو گیا ہے تو اُن پر تاوان نہیں ہے۔' مسئلہ یہی ہے کہ امانت کا مال باوجود حفاظت کے اور اہتمام کے اگر ضایع ہو جائے تو اس کا عوض دینا واجب نہیں ہے، اگر کوئی دینا چاہے تو دے سکتا ہے۔ حضرت مولانا منیر صاحب نے اہتمام کیا کہ جتنا روپیہ چوری ہو گیا ہے، اتنے روپے کا انتظام کر کے مدرسہ کے دفتر میں داخل کر دوں۔ حضرت گنگوہی کی خدمت میں استفتا کیا گیا کہ 'مہتمم صاحب مدرسہ کی رقم لا رہے تھے، وہ راستے میں چوری ہو گئی تو کیا مہتمم کی ذمہ داری ہے کہ ان روپیوں کو جمع کریں؟' مولانا گنگوہی نے فتوی دیا کہ 'نہیں۔ چوں کہ حفاظت کا پورا اہتمام کیا گیا تھا،

چوری ہونا من جانب اللہ تھا، اس لیے ان کے ذمہ تاوان نہیں ہے۔' لوگوں نے مولانا منیر صاحب کو یہ فتوی دکھایا کہ 'آپ کے ذمہ تاوان نہیں ہے۔' مولانا منیر صاحب حضرت گنگوہی کے ساتھی اور معاصر تھے۔ انھوں نے ازراہِ ناز کہا کہ 'مولوی رشید احمد صاحب نے سارا فتوی میرے لیے ہی پڑھا ہے۔ چلیں ہیں ہم کو فتوی دینے۔ اپنا فتوی رکھیں، میں ایک ایک پیسہ جب تک جمع نہیں کر دوں گا، مجھے چین نہیں آئے گا۔'

لیجیے ادھر سے معافی مل رہی ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ 'نہیں میں تو ایک ایک پیسہ جمع کر دوں گا۔' اور واقعی انھوں نے ایک ایک پیسہ جمع کر دیا۔ اب تو لوگ چوریاں کر کے اعلان کر دیتے ہیں کہ چوری ہوگئی، تا کہ ہم پر کوئی مواخذہ نہ ہو۔

ملازمین کا ایک طریقہ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ کام میں چوری کرتے ہیں اور اس پر تنخواہ پوری لیتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ اگر سرکاری ملازم ہو تو رشوتیں لیتا ہے، اور رشوت کی تو اتنی زور بازاری ہوگئی ہے کہ ہمارا پورا ملک، کہنا چاہیے کہ حرام مال ہی پر چل رہا ہے۔ پتہ نہیں اللہ تعالی کس کی برکت سے ملک کو قایم رکھے ہیں ورنہ تو اس کو تو سڑ گل جانا چاہیے۔ جتنی رشوت اس ملک میں چل رہی ہے بس اللہ ہی جانتا ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ تنخواہ کتنی ہے؟ تو معلوم ہوتا ہے کہ تنخواہ تو معمولی ہے لیکن اوپری آمدنی کی تو بس مت پوچھیے، اس کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں۔ آدمی ایسی جگہوں کو تلاش کرتا ہے جہاں اوپری آمدنی زیادہ ہو۔ ایک بزرگ کہا کرتے ہیں کہ 'جب کسی سرکاری ملازم کا مکان دیکھو کہ اس پر 'ھذا من فضل ربی' لکھا ہوا ہے، یعنی یہ میرے رب کے فضل سے ہے تو جانتے ہو، تنخواہ کا مال تو محنت کا ہے اور یہ جو 'ھذا من فضل ربی' ہے وہ کیا ہے؟ ظالموں نے رشوت کے مال کا ترجمہ کر رکھا ہے۔

میرے ایک دوست کہہ رہے تھے کہ 'میرا لڑکا داروغہ ہے، سب انسپکٹر ہے۔ اس کا حال یہ ہے کہ چھ سو روپے تنخواہ پاتا ہے لیکن اس کی بیوی مارکیٹنگ کے لیے دو ہزار روپے خرچ کرتی ہے۔' داروغہ کے بہت سے ہاتھ ہوتے ہیں، اوپر، نیچے، دائیں، بائیں

ہر طرف ہاتھ مارتے ہیں۔ تو اس طرح حرام مال رشوت کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ نجاست اور گندگی انسان کھائے گا، اپنی اولاد کو کھلائے گا، اپنے متعلقین کو کھلائے گا، اپنے مہمانوں کو بھی کھلائے گا۔ سوچیے اس نے گندگی کہاں کہاں پھیلا دی ہے؟ جہاں جہاں یہ گندگی جائے گی وہاں وہاں اعمالِ صالحہ کا وجود مٹتا چلا جائے گا اور برے اعمال کا وجود ہوگا۔ آدمی تھوڑا مال حاصل کرے لیکن حلال طریقے سے حاصل کرے تو اس کے اندر کفایت ہوگی اور اس مال کے اندر برکت ہوگی۔ بہت سارا حرام مال کما لیا تو وہ جس طریقہ سے آیا تھا اُسی طریقہ سے چلا جائے گا آدمی کو پتہ بھی نہیں چلے گا اور جہنم اس کے لیے لکھ دی جائے گی۔

وراثت کی عدمِ تقسیم، جس میں ابتلاے عام ہے:

یہ تین طرح کے لوگ ہوگئے۔ تاجر، کسان اور ملازم۔ اور یہ طریقے ہیں حلال کو اپنے اوپر حرام بنالینے کے۔ اس کے علاوہ ایک اور حرام میں ساری اُمت مبتلا ہے اِلَّا ماشاء اللہ۔ نہ اس میں تاجر کی کوئی تخصیص ہے نہ کسان کی اور نہ ملازمین کی۔ وہ ہے وراثت کا مال۔ جب کوئی آدمی مرجاتا ہے تو شریعت کے اعتبار سے اس کے جتنے وارث ہورہے ہیں، بیٹے ہیں، بیٹیاں ہیں، باپ ہے، ماں ہے، شریعت کے اعتبار سے ان کو حصہ ملنا چاہیے۔ ترکہ میں ہر ایک کا حصہ متعین کردیا گیا ہے۔ باپ کا اتنا، ماں کا اتنا، بیٹا کا اتنا، بیٹی کا اتنا، سب کا حصہ متعین ہے۔ لیکن آدمی عموماً کیا کرتا ہے؟ باپ مرگیا جس کا جو جی چاہا دبالیا۔ دوسروں کا حق نہیں دیا۔ لڑکیاں یہ سمجھتی ہیں کہ ہم کو لینا ہی نہیں ہے، اگر ہم لے لیں گے تو اس گھر میں کیسے آئیں گے؟ حالاں کہ وہ لینے کے بعد بھی آنے کی مستحق ہیں۔ ترکہ میں جیسے بیٹوں کا حق ہوتا ہے ویسے ہی بیٹیوں کا بھی حق ہوتا ہے لیکن عموماً غفلت کی وجہ سے یا لاعلمی کی وجہ سے یا بری نیت یا بے ایمانی کی وجہ سے آدمی لڑکیوں کا حصہ نہیں دیتا ہے، ان کو محروم کردیتا ہے اور ان کے حصے کو زبردستی لے کر کھاتا پیتا رہتا ہے اور حرام کھاتا ہے۔ اس حرام کے اندر ساری امت اِلَّا ماشاء اللہ ہمارے ہندوستان میں

مبتلا ہے۔ بعض لوگ سوچتے ہیں کہ ابھی تو وفات ہوئی ہے فوراً کیا وراثت تقسیم کریں، لوگ کہیں گے کہ اسی انتظار میں گویا بیٹھے تھے۔ لیکن نبی کریم ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے، آپ دفن بھی نہیں کیے گئے ہیں، آپ کا جسدِ مبارک رکھا ہوا ہے اور حضرات صحابہ کرام میں خلافت کا مسئلہ چل پڑا۔ خلافت طے کرنی تھی، صدیق اکبر پر خلافت طے ہوگئی۔ شیعہ آج تک طعنہ دیتے ہیں لیکن ان کا طعنہ لغو ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ابھی نبی کی نعش پڑی ہوئی ہے اور ان لوگوں کو خلافت کا چکر لگ گیا۔ حالاں کہ اگر خلافت کا چکر نہ چلا ہوتا تو رسول اللہ ﷺ کے کفن دفن اور غسل میں اتنا اختلاف ہوجاتا کہ لڑائی کی نوبت آجاتی۔ چنانچہ جب غسل دینے کا وقت ہوا تو حضرات انصار نے للکارا کہ ہم غسل دیں گے، ہمارا حق ہے۔ حضرات مہاجرین نے کہا کہ ہمارا حق ہے۔ اہل بیت کو اصرار تھا کہ ہمارا حق ہے۔ جھگڑے کی صورت ہوگئی تھی لیکن خلافت طے ہوچکی تھی، صدیق اکبر ؓ نے کھڑے ہوکر اعلان کیا کہ حضور ﷺ کے گھر والوں کو نہلانے کا حق ہے۔ البتہ انصار میں سے ایک صاحب آئیں اور مہاجرین میں سے ایک صاحب آئیں۔ چنانچہ انصار و مہاجرین میں سے ایک ایک فرد شریک ہوئے۔ باقی سب لوگ حضور ﷺ کے گھرانے کے تھے، اور اہتمام سے غسل دیا گیا۔ پھر اس بات پر اختلاف ہوا کہ کہاں دفن کیا جائے؟ وہاں بھی صدیق اکبر ؓ کی خلافت کام آئی۔ انھوں نے کہا کہ میں نے خود حضور ﷺ سے سنا ہے کہ 'جہاں نبی کی وفات ہوتی ہے وہیں دفن کیا جاتا ہے۔' اس پر بھی اتفاق ہوگیا۔

جاہل لوگ طعنہ دیں تو دیا کریں لیکن جو صحیح بات ہے اس کو پورا کرنا چاہیے۔ مرنے والا جب مرگیا تو جس کا حصہ ہو فوراً نکال کر اس کے حوالے کر دینا چاہیے۔ اگر فوراً نکال کر اس کے حوالے نہیں کیا گیا تو بعد میں جھگڑے کھڑے ہوتے ہیں۔ اگر حصہ مانگنے والا اپنا حصہ مانگتا ہے اور خدانخواستہ یہ مانگنے والی لڑکی ہو تو اس پر پل پڑتے ہیں کہ اس گھر میں تم کو آنا نہیں ہے۔ خبردار! اب گھر میں مت آنا، اپنا حصہ مانگتی ہو۔ گویا حصہ مانگنا جرم ہوگیا، حالاں کہ وہ اللہ تعالی کا دیا ہوا اپنا حصہ مانگتی ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں

اللہ کے دیے ہوئے حصے کو روکنے والے۔ اس حرام کے اندر بھی بکثرت لوگ مبتلا ہے۔

رزق حرام کا سب سے بڑا نقصان دعا کی عدمِ قبولیت:

آدمی کے لیے اللہ نے حلال روزی کا انتظام کیا ہے لیکن وہ خود حرام میں پڑ جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے برے اعمال کا صدور ہوتا ہے اور ایک بڑی قباحت یہ ہوتی ہے کہ آدمی کی دعائیں قبول نہیں ہوتی ہیں۔ جس نے حرام روزی کھالی، اس کا دل نجس ہو گیا، اس کی زبان نجس ہوگئی، اب وہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرتا ہے، لیکن اس کی دعا قبول نہیں ہوتی ہے، اس لیے کہ اس میں نجاست ملی ہوئی ہے۔ وہ اس لائق نہیں ہے کہ اللہ کے حضور جائے۔

دعاؤں کی قبولیت کا سب سے موثر ذریعہ یہ ہے کہ آدمی اَکلِ حلال کا اہتمام کرے۔ نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ 'کتنے لوگ ایسے ہیں جو سفر میں ہوں گے، پراگندہ بال ہوں گے، پریشان حال ہوں گے۔ ظاہر بات ہے کہ مسافرت اور پریشانی کی حالت دعا کی قبولیت کی حالت ہے۔ ایسے وقت میں وہ ہاتھ اٹھا کر 'یا ربی! یا ربی!' کہتا ہے'۔ 'یا ربی' کا لفظ ہی ایسا ہے کہ جس سے دعا قبول ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں جتنی دعائیں ہیں اکثر و بیشتر 'رَبَّنَا' سے شروع ہوتی ہیں۔ رب کا لفظ ایسا ہے کہ اس کو جب انسان بولتا ہے تو فوراً رحمتِ الٰہی متوجہ ہوتی ہے۔ وہ 'رَبِّی رَبِّی' کہتا ہے لیکن اس کی دعا قبول نہیں ہوتی، کیوں؟ اس لیے اس کا کھانا حرام ہے، اس کا پینا حرام ہے، اس کا لباس حرام ہے، تو اس کی دعا کیسے قبول ہوگی؟ (رواہ مسلم عن ابی ہریرۃ)

اگر ہم حلال روزی کا اہتمام کریں تو ہماری دعا بھی قبول ہوگی اور اچھے اعمال بھی پیدا ہوں گے، گھروں میں چین وسکون بھی ہوگا، بیماریاں بھی دفع ہوں گی۔ حرام روزی کی وجہ سے خواہ مخواہ بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ آدمی مقدمہ میں پھنس جاتا ہے، بلا اور مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اور جب حلال روزی ہوگی، تھوڑی ہی ہوگی لیکن اس کا کام اسی تھوڑی روزی سے پورا ہوتا رہتا ہے۔ بیماری میں پڑے گا تو معمولی دوا سے اچھا ہو جائے گا۔ کوئی پریشانی ہوگی تو اللہ تعالی اس سے حفاظت فرمائیں گے۔ اس لیے کہ وہ

دعائیں کرے گا اور اللہ تعالی اسے قبول فرمائیں گے۔

دعا سے بلائیں ٹل جاتی ہیں:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ''اِنَّ الْبَلَاءَ لَیَنْزِلُ فَیَتَلَقَّاهُ الدُّعَاءُ فَیَعْتَلِجَانِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ''(رواه الحاکم عن عائشة رضی الله عنها) **اوپر سے بلائیں** نازل ہوتی ہیں اور نیچے سے دعا جاتی ہے تو بلا اور دعا میں ٹکراؤ ہوجاتا ہے اور بلا انسان کے پاس نہیں آتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالی نے حلال روزی کھانے کا حکم دیا ہے۔'' یا اَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًااِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ''اے رسولو! پاکیزہ روزی کھاؤ اور اچھا عمل کرو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اس کو میں جانتا ہوں۔ انسان نے جو کچھ کیا، حلال روزی کا اہتمام کیا یا حرام روزی حاصل کی، اس کے دل میں کیا ہے؟ اللہ تعالی اسے جانتے ہیں۔ لہٰذا انسان کو حرام میں پڑنے سے بچنا چاہیے۔

خلاصہ کلام:

غرض یہ ایک مختصر سی بات تھی جس کو میں نے عرض کیا۔ ہم لوگوں میں اس کا بالکل اہتمام نہیں ہے۔ آدمی خود اپنے طور پر اپنے گھر کا جائزہ لے اور جس چیز میں شبہ ہو کہ یہ حرام ہے، فوراً کسی معتبر عالم سے پوچھ لے اور اس کی بات پر عمل کرے۔ اگر وہ عالم کہتا ہے کہ حرام ہے تو فوراً آنکھ بند کر کے اسے چھوڑ دے۔ اللہ تعالی اس سے بہتر دوسرا انتظام فرمادیں گے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی شخص اللہ کے لیے کسی حرام کو چھوڑ دے تو اللہ تعالی اسے محروم کردیں۔ خدا تعالی کا یہ دستور نہیں ہے۔ ان کے یہاں اس سے بہتر دینے کا دستور ہے۔ بس یقین ہونا چاہیے خدا پر بھروسہ ہونا چاہیے۔

اللہ تعالی ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین

❑❑❑

روزی کا مسئلہ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہ وَنَسْتَعِیْنُہ وَنَسْتَغْفِرُہ وَنُؤمِنُ بِہ وَنَتَوَکّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلّ لَہ وَ مَن یُّضْلِلْہ فَلَا ھَادِیَ لَہ۔ وَنَشْھَدُ اَن لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہ لَا شَرِیْكَ لَہ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مَحَمّداً عَبْدُہ وَرَسُوْلُہ اَرْسَلَہ بِالْحَقِّ بَشِیْراً وَنَذِیْراً ۔ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہ وَاَصْحَابِہ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً۔

اَمَّا بَعْدُ:

فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمان الرحیم

وَلَوْ اَنَّ اَھْلَ الْقُرَی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْھِمْ بَرَکَاتٍ مِنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ وَلَكِنْ کَذَّبُوْا فَاَخَذْنَاھُمْ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ(۹۶) [سورۃ الاعراف]

رزق کا مسئلہ:

محترم بزرگو اور دوستو! ایک چیز میں آج کی دنیا بہت پریشان ہے۔ ہر جگہ لوگ اس میں ایسے مبتلا ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی مقصودِ زندگی ہے کہ اگر وہ حاصل نہیں ہوا تو زندگی بے کار ہے۔ اور وہ چیز ہے ’روزی‘۔ آدمی روزی کے لیے بھٹکتا پھرتا ہے، اور ہماری زندگی اس طرح گزرتی ہے جیسے ہم اسی کے لیے جی رہے ہوں، اسی کے لیے مر رہے ہوں۔ اور اگر کسی کے پاس بظاہر اس کا انتظام ہے تو وہ بھی پریشان ہے کہ اُس سے زیادہ چاہیے، اور جس کے پاس نہیں ہے وہ چاہتا ہے کہ کاش ہمارے پاس ہوتا۔ غرض ہر ایک اپنی جگہ پریشان ہے۔ اسی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے اللہ کے رسول ﷺ

نے ارشاد فرمایا تھا کہ ”لَوْ اَنَّ لِابْنِ آدَمَ وَادِیاً مِنْ ذَهَبٍ أَحَبَّ اَن یَّکُوْنَ لَهُ وَادِیَانِ وَلَن یَّمْلَأَفَاهُ اِلَّا التُّرَابُ وَیَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰی مَنْ تَابَ“ (رواه البخاری فی الصحیح عن انس بن مالك ﷺ) اگر انسان کے پاس سونے کی ایک وادی ہو تو وہ چاہے گا کہ دو ہو جائیں۔ اور اس کا منھ قبر کی مٹی کے سوا اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔ اور اللہ توبہ قبول کرتا ہے جو توبہ کرے۔ ایسے لوگ آج کے زمانے میں بہت کم ہیں جو اللہ کی دی ہوئی روزی پر قناعت کریں، اور اس کا شکر ادا کریں۔

سیدنا جنید بغدادی علیہ الرحمہ کی خدمت میں ایک صاحب نے خطیر رقم پیش کی اور کہا کہ ’اسے اپنے مریدین میں خرچ کریں۔‘ آپ نے فرمایا کہ ’آپ جو یہ رقم بطور ہدیہ کے پیش کر رہے ہیں تو کیا آپ کی پوری ملکیت یہی ہے؟ یا اور بھی کچھ گھر میں موجود ہے؟‘ کہا ’گھر میں جو موجود ہے، اس میں سے کچھ لایا ہوں‘۔ آپ نے فرمایا کہ ’جو رقم تمھارے پاس موجود ہے وہ تمھاری ضرورت کے لیے کافی ہے یا اس سے زیادہ چاہیے؟‘ کہنے لگا کہ ’مزید کی ضرورت ہے۔‘ تو آپ نے فرمایا کہ ’میرے پاس جتنی رقم موجود ہے وہ میرے لیے کافی ہے۔ آپ کو ضرورت ہے، آپ اس رقم کو لے جائیں اور اسی میں شامل کر دیں۔‘

ایسے لوگ جو اللہ کی دی ہوئی رزق پر قناعت کرتے ہیں، اب بہت کم ہیں۔ اگر آج کے زمانے میں ایسا کوئی مل جائے تو وہ اس زمانہ کا بہت بڑا ولی ہے۔

آج عام طور سے ہر آدمی ہر وقت پریشانیوں میں گھِرا ہوا ہے۔ بیماری ہے، مکان بنانا ہے، بیٹے بیٹی کی شادی کا مسئلہ ہے۔ اور بھی دنیا بھر کے اتنے مسائل ہیں کہ کسی وقت سکون میسر نہیں ہے۔ اس لیے ہر انسان چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ دنیا حاصل ہو جائے۔

رازق صرف اللہ کی ذات ہے:

میں اس وقت یہ تدبیر نہیں بتا رہا ہوں کہ روزی کیسے زیادہ ملے گی؟ بلکہ ایک

دوسری بات بتانے جارہا ہوں۔

ہم مسلمان ہیں اور اللہ پر یقین رکھتے ہیں۔ اور اس سے کسی مسلمان کو اختلاف نہیں ہے کہ روزی دینے والے اللہ تبارک وتعالی ہیں۔ چاہے کتنا کمزور مسلمان ہو، وہ ملازم ہو، کاشتکار ہو، تاجر ہو، سب یہی کہتے ہیں کہ روزی اللہ تعالی دیتے ہیں۔ قرآن پاک کے حق ہونے میں کس کو اختلاف ہوسکتا ہے۔ خود قرآن میں اللہ نے ارشاد فرمایا ”وَمَا مِنۡ دَابَّةٍ فِیۡ الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلٰی اللّٰهِ رِزۡقُهَا“ (سورۃ ھود آیۃ ٦) زمین پر چلنے والی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کا رزق اللہ نے اپنے ذمہ نہ لے لیا ہو۔ اور صرف ہم ہی نہیں بلکہ زمین پر چلنے والی پوری کی پوری کائنات، سمندر کی مچھلیاں حتی کہ پیڑ پودے سب روزی کے محتاج ہیں، اور سب کو اللہ رزق دیتے ہیں۔

رزق رسانی بندے کے بس سے باہر ہے:

میں نے بچپن میں ایک کتاب پڑھی تھی۔ اس میں ایک واقعہ لکھا تھا کہ 'حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ نے ایسی حکومت دی تھی کہ نہ ان سے پہلے کسی کو ایسی حکومت ملی تھی اور نہ ان کے بعد۔ انھوں نے خود دعا کی تھی ”رَبِّ هَبۡ لِیۡ مُلۡكاً لَّا یَنۡبَغِیۡ لِاَحَدٍ مِنۡ بَعۡدِیۡ“ (سورۃ ص آیۃ ۳۵) اے پروردگار! مجھے ایسی حکومت عطا فرما جو میرے بعد کسی کو نہ ملے۔ چنانچہ انسان، جنات، چرند، پرند، درند ہر ایک پر ان کی حکومت تھی، بلکہ یہ حال تھا جنگل کی جڑی بوٹیاں خود بتاتی تھیں کہ میں فلاں کام کی ہوں۔

انھوں نے ایک دن دعا کی کہ 'یا اللہ! آپ ایک دن اجازت دیجیے کہ میں آپ کی تمام مخلوقات کی دعوت کروں'۔ حکم ہوا کہ 'یہ تمھارے بس کا نہیں، روزی دینا ہمارا کام ہے، یہ ہم ہی کر سکتے ہیں۔ کسی مخلوق کے بس کی بات نہیں'۔ کہنے لگے 'صرف ایک بار ہم اجازت چاہتے ہیں'۔ حکم ہوا کہ 'ٹھیک ہے، جب تم چاہتے ہو تو کر کے دیکھ لو'

دعوت کا دن طے ہوا، اور اس کے لیے سارے انتظامات ہونے لگے۔ دعوت کا دن آیا تو معلوم ہوا کہ آج اللہ کا مطبخ بند ہے۔ آج سب کی دعوت بادشاہ کے یہاں ہے۔

سمندر سے ایک مچھلی آئی اور کہنے لگی ’آج تو اللہ کا مطبخ بند ہے، آپ اپنے مطبخ سے کھانے کی اجازت دیجیے۔‘ حضرت سلیمان نے فرمایا ’ابھی رکو۔‘ اس نے کہا ’ناشتہ چاہیے۔‘ اور اس ایک مچھلی نے ناشتہ کے نام پر سارا کھانا چٹ کرلیا اور پھر کہا کہ ’اور چاہیے۔‘

اس واقعہ میں کتنی صداقت اور واقعیت ہے اس سے بحث نہیں۔ اس کے ذکر کرنے کا مقصد بس اتنا ہے کہ انسان روزی کا انتظام نہیں کرسکتا۔ سلیمان علیہ السلام اتنی بڑی حکومت کے مالک ہونے کے باوجود صرف ایک دن کی روزی رسانی سے عاجز رہے۔

انسان جہاں ہو اُس کی روزی وہیں پہنچتی ہے:

اس میں تو کوئی مسلمان اختلاف نہیں کرسکتا کہ روزی اللہ کے ذمے ہے۔ مزید فرماتے ہیں کہ ”وَيَعۡلَمُ مُسۡتَقَرَّهَا وَمُسۡتَوۡدَعَهَا “(سورة هود آية٦) اور اللہ مستقل ٹھکانے کو بھی جانتا ہے اور عارضی ٹھکانے کو بھی۔ جو جہاں گیا اس کی روزی وہیں ملتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ گھر میں ہوں تو روزی ملے گی، باہر ہوں تو بند ہوجائے گی۔ ہم کبھی اپنے گھر تھے تو وہاں ہماری روزی تھی، اب یہاں آگئے ہیں تو یہاں ملتی ہے۔ اب ہم یہ کہیں کہ ہماری روزی یہاں تھی، اس لیے ہم یہاں آگئے ہیں، یا یہ کہیں کہ ہم یہاں آگئے تو ہماری روزی یہاں آگئی۔ بہرصورت اللہ کو مستقر (دائمی قیام کی جگہ) اور مستودع (عارضی قیام کی جگہ) کا پورا پورا علم ہے۔ اور ہر ایک کی روزی وہیں پہنچتی ہے جہاں وہ ہوتا ہے۔ اس کا اقرار ہر ایک کرتا ہے، حتی کہ کفار بھی یہ مانتے ہیں کہ روزی دینے والی ذات اللہ کی ہے۔ ”قُلۡ مَن يَّرۡزُقُكُم مِّنَ السَّمَاۤءِ وَالۡاَرۡضِ“(سورة يونس آية٣١) جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ ’بتاؤ! تمھیں آسمان اور زمین سے کون روزی دیتا ہے، تو ان کا جواب ہوتا ہے کہ اللہ۔

رزق کی بجائے رزق رساں کو تلاش کرنا چاہیے:

حضرت اصمعی ماہر عربی داں محدث ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ’میں قبیلہ قبیلہ لوگوں میں گھومتا تھا اور عربی زبان سیکھتا تھا۔ ایک بار کسی دیہات کے رہنے والے سیدھے

ساڑھے مسلمان سے ملاقات ہوگئی، اور وہ ہمارے ساتھ ہوگیا۔ ہم سے کہنے لگا کہ 'آپ نے اللہ کا کلام پڑھا ہے۔' ہم نے کہاں 'ہاں'، اس نے کہا کہ 'ہم نے نہیں پڑھا ہے، ہمیں اللہ سے محبت ہے۔ آپ ہمیں قرآن سکھلا دیجیے۔' ہم نے سورہ ذاریات سنانی شروع کی، جب اس آیت پر پہنچے ”وَفِی السَّمَاءِ رِزْقُکُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ“ (سورۃ ذاریات آیۃ ۲۲) اور تمھاری روزی آسمان میں ہے اور وہ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ یہ روزی آسمان سے آتی ہے اور اللہ تعالی ہر ایک کو ایک متعین مقدار سے عطا کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ”وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ“ (سورۃ الشوری آیۃ ۲۷) اور اگر اللہ اپنے تمام بندوں کے لیے رزق کو کھلے طور پر پھیلا دیتا تو وہ زمین میں سرکشی کرنے لگتے۔ روزی کا نزول اوپر سے ہوتا ہے، اِسی کو یہاں فرمایا کہ تمھاری روزی آسمان میں ہے۔ تو وہ دیہاتی کہنے لگا کہ 'میں اپنی روزی زمین پر ڈھونڈھتا ہوں، جب کہ اللہ فرماتے ہیں کہ تمھاری روزی آسمان میں ہے۔ لہٰذا اب سے میں آسمان میں تلاش کروں گا، یعنی روزی کی فکر چھوڑ کر روزی رساں کو تلاش کروں گا۔' حضرت اصمعی فرماتے ہیں کہ 'پھر ہم دونوں الگ الگ ہوگئے۔ پھر ایک زمانے کے بعد حج میں طواف کے دوران ایک شخص نے ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا اور پوچھا کہ 'آپ ہمیں پہچانتے ہیں؟' میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو اس نے کہا کہ 'میں وہی شخص ہوں جسے آپ نے وہ آیت سنائی تھی۔ اب میں سب چیز سے بے نیاز ہوگیا اور اللہ کی عبادت میں لگ گیا، اور اللہ تعالی مجھے روزی پہنچاتے ہیں۔' پھر اس نے کہا کہ 'اب اس آیت کے بعد آپ سنا سکتے ہیں؟' تو میں نے اگلی آیت سنائی ”فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِثْلَ مَا اَنَّکُمْ تَنْطِقُوْنَ“ (سورۃ ذاریات آیۃ ۲۳) لہٰذا آسمان اور زمین کے پروردگار کی قسم! یہ بات یقیناً ایسی ہی سچی ہے جیسے یہ بات کہ تم بولتے ہو۔ تو وہ تعجب سے کہنے لگا کہ 'اللہ کے بندے اللہ کو جھٹلاتے بھی ہیں کیا؟'

ہر ایک مسلمان بالکل تسلیم کرتا ہے کہ روزی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ایسا کبھی

نہیں ہوسکتا کہ اللہ کی طرف سے روزی روک لی جائے، اور وہ مل جائے۔ اسی طرح یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ دی جائے اور کوئی روک لے۔ ’’لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ‘‘ جب چاہتے ہیں، دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں، روک لیتے ہیں۔ اس میں کوئی دخیل نہیں ہوسکتا۔ تو جب ایسا ہے تو آدمی کو سب سے زیادہ روزی رساں کی فکر کرنی چاہیے، روزی کا تو وعدہ ہے وہ خود بخود آئے گی۔

نوجوان عابد کا واقعہ:

مولانا روم نے مثنوی میں لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ایک نوجوان بڑا عابد وزاہد تھا، اور بظاہر معیشت کا اس کے پاس کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس کو ہمارے زمانے میں کہتے ہیں کہ ’بیکار‘ ہے۔ شادی بیاہ کے وقت اسی کو دیکھتے ہیں کہ برسرِ روزگار ہے یا نہیں؟ اگر لڑکا برسرِ روزگار نہیں، تو چاہے کتنا ہی دیندار ہو، کہتے ہیں کہ یہ بیکار ہے۔ حالاں کہ روزی لکھی ہوئی ہے۔ تو وہ نوجوان برسرِ روزگار نہیں تھا، اور تلاش بھی نہیں کرتا تھا۔ اسے عبادت کی دھن تھی۔ وہ کہتا تھا کہ ’یا اللہ میں آپ کی عبادت کروں گا، روزی تلاش نہیں کروں گا، روزی تو آپ پہنچائیں گے۔‘ بہت دعائیں کی۔ ایک دن اس کے گھر میں ایک گائے گھس آئی، بس وہ سمجھا کہ روزی آگئی ہے۔ اسے پکڑ کر ذبح کیا، خود بھی کھایا اور دوستوں کو بھی کھلایا۔ بعد میں ایک آدمی تلاش کرتا ہوا آیا۔ معلوم ہوا کہ گائے اسی کی تھی۔ اس نے مطالبہ شروع کردیا۔ یہ نوجوان کہنے لگا کہ ’وہ میری روزی تھی۔ میں نے اللہ سے دعا کی اور اللہ نے بھیج دی۔ اس لیے ہم کوئی جرمانہ نہیں دیں گے۔‘ اس نے دھمکی دی کہ ’میں داؤد علیہ السلام کے پاس مقدمہ کردوں گا۔‘ نوجوان نے کہا ’مجھے فکر نہیں، میں دعا کا حوالہ دوں گا۔‘ بالآخر یہ مقدمہ داؤد علیہ السلام کے پاس گیا۔ مدعی نے اپنا دعوی پیش کیا، نوجوان نے بھی اپنی بات رکھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس نوجوان کا چہرہ دیکھا، جھوٹ کے اثرات نہیں تھے۔ نوجوان سچا معلوم ہورہا تھا، مگر کیس اس کے خلاف جارہا تھا۔ چنانچہ سوچا کہ اس معاملہ میں اللہ سے رجوع کرکے فیصلہ

کروں گا، اور کیس کو کل پر موخر کر دیا۔ رات میں اللہ سے دعا کی کہ ’لڑکا سچا معلوم ہوتا ہے مگر کیس اس کے خلاف ہے۔ یا اللہ! اس معمہ کو حل فرما دیجیے۔‘ اللہ نے فرمایا کہ ’لڑکا بے شک سچا ہے، اور وہ گائے اس کی روزی تھی، اور وہ مدعی اس کا غلام ہے، اور اس کی ساری جائیداد نوجوان کی ملکیت ہے۔‘ پھر اللہ نے حقیقت واضح فرمائی کہ ’اس نوجوان کا باپ سفر میں تھا، وہ غلام بھی ساتھ تھا۔ راستہ میں غلام کی نیت بگڑ گئی، اس نے اپنے آقا کو قتل کر دیا، اور پوری جائیداد پر قابض ہو گیا۔ کل جب تمھارے پاس مقدمہ پیش ہو تو یہ کہنا کہ اس مقدمہ کا فیصلہ فلاں درخت کے نیچے ہوگا۔‘ چنانچہ صبح کو داوٗد علیہ السلام نے ایسا ہی کیا اور جب مدعی سے کہا کہ ’اس کا فیصلہ فلاں درخت کے نیچے ہوگا‘ تو وہ گھبرا گیا، اس نے کہا ’ایسا کیوں؟‘ مگر اسے خاموش کر دیا گیا اور پوری کچہری وہاں گئی۔ زمین کھودوائی تو وہ لاش ملی۔ تب اس شخص نے ساری باتوں کا اقرار کیا اور اسے قصاصاً قتل کر دیا گیا، اور پوری جائیداد نوجوان کو مل گئی۔ اس نوجوان نے اللہ سے مانگا تو اللہ نے اسے دیا۔

اصل فکر روزی رساں کی ہونی چاہیے:

ہم اللہ سے مانگیں، جب ہم اس سے مانگیں گے تو ہمیں پتہ بھی نہیں چلے گا کہ اس نے کہاں سے دیا۔ روزی دینے والی ذات تو وہی ہے۔ ہم روزی کی بہت فکر کرتے ہیں، روزی رساں کی فکر نہیں کرتے۔ حالاں کہ اللہ کے خزانہ میں کسی طرح کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ہم مانگیں تو سہی، ضرور ملے گا۔ یہود نے کہا تھا ”یَدُ اللّٰہِ مَغْلُوْلَةٌ“ اللہ کے ہاتھ بندھ گئے ہیں۔ اللہ نے فرمایا ”بَلْ یَدَاہُ مَبْسُوْطَتَانِ“ (سورة المائدة آیة ۶۴) اللہ کے ہاتھ تو کھلے ہوئے ہیں۔ اللہ فرماتے ہیں کہ ’تمام جن و انس ایک جگہ جمع ہو کر اپنی اپنی خواہشات و ضروریات کا اظہار کریں اور ہر ایک کی ساری خواہشات پوری کر دی جائیں، تب بھی میرے خزانے میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔‘ آج تک مخلوقات کو روزی دے رہے ہیں، کبھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی، اور جنت میں ایمان والوں پر جو لا تعداد انعامات ہوں گے، وہ الگ۔ تو صحیح بات یہ ہے کہ روزی رساں کی فکر کریں:

کار ساز ما در فکر کار ما
فکر ما در کار ما آزار ما

ان کی خوشنودی ورضامندی چاہیے، روزی ملتی رہے گی۔ ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اللہ کو راضی کریں۔ ہم نے جو آیت پڑھی ہے اس میں حق تعالی فرماتے ہیں ’اگر آبادی والے ایمان رکھتے اور تقوی اختیار کرتے، اللہ کے احکامات کی اطاعت کرتے، نافرمانی سے بچتے، اللہ کو خوش کرنے کی کوشش کرتے تو ہم ان کے اوپر آسمان کی برکتیں اور زمین کی برکتیں سب کھول دیتے۔ مگر انھوں نے ہماری بات نہیں مانی تو ہم نے ان کے کرتوت کی وجہ سے سخت پکڑ کی۔‘ روزی بند ہوگئی، کاروبار بند ہوگئے۔ ”لَئِنُ شَكَرُتُمُ لَاَزِيُدَنَّكُمُ“ اگر میرا شکر یہ ادا کروگے تو میں بڑھادوں گا۔ ”وَلَئِنُ كَفَرُتُمُ اِنَّ عَذَابِىُ لَشَدِيُدُ“ (سورة ابراهيم آية ۷) اور اگر ناشکری کروگے تو میرا عذاب سخت ہے۔ مگر آدمی کو جب ملتا ہے تو ناشکری کرتا ہے، اتراتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اب یہ مال ہمارے پاس سے نہیں جائے گا۔ ”يَحُسَبُ اَنَّ مَالَهٗ اَخُلَدَه“ (سورة الهمزة آية ۳) وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس ہمیشہ رہے گا۔ اسے نہیں معلوم کہ جو دینا جانتا ہے وہ لینا بھی جانتا ہے۔

جو دینا جانتا ہے وہ لینا بھی جانتا ہے:

حضرت شاہ وصی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ ’ایک چوہا بہت پریشان رہا کرتا تھا، ایک بزرگ کے پاس گیا اور کہا کہ ’میں فلاں بلی سے بہت پریشان ہوں، دعا کر دیجیے کہ میں بھی بلی بن جاؤں۔‘ بزرگ نے فرمایا کہ ’بلی بن کر اور زیادہ پریشان ہوجاؤ گے۔‘ مگر اس نے دعا کے لیے اصرار کیا تو بزرگ نے ہاتھ پھیر دیا، وہ بلی بن گیا۔ پھر کچھ دن کے بعد آیا اور کہا کہ ’میں کتوں سے بہت پریشان ہوں، دعا کر دیجیے کہ میں کتا بن جاؤں۔‘ بزرگ نے ہاتھ پھیر دیا، وہ کتا بن گیا۔ پھر آیا کہنے لگا کہ ’کتا بننے کے بعد گھروں میں جانا مشکل ہوگیا ہے، باہر بھیڑیے رہتے ہیں، ان سے ڈر لگتا ہے۔ دعا کر دیجیے کہ

بھیڑیا بن جاؤں۔‘ بزرگ نے ہاتھ پھیر دیا، وہ بھیڑیا بن گیا۔ پھر کچھ دن کے بعد آیا کہ ’بھیڑیا بننے کے بعد آبادی میں نہیں جا پاتا، اور جنگل میں شیر سے ڈر لگتا ہے۔ دعا کر دیجیے کہ شیر بن جاؤں۔‘ بزرگ نے پھر ہاتھ پھیر دیا اور وہ شیر بن گیا۔ شیر بننے کے بعد اسے بھوک لگی۔ سامنے بزرگ صاحب کے علاوہ کوئی اور خوراک تھی نہیں، غرا کر کہتا ہے کہ ’مجھے بھوک لگی ہے، اب آپ ہی کو کھاؤں گا۔‘ بزرگ نے جب دیکھا کہ واقعی مجھ پر ہی حملہ کر دے گا تو چپکے سے دعا کی اور ہاتھ پھیر دیا۔ وہ شیر سے چوہا بن گیا۔ دیا تو دھیرے دھیرے، مگر جب لیا تو سب یک بیک چھین لیا۔ جو دینا جانتا ہے وہ لینا بھی جانتا ہے۔ تو اللہ کسی کو تھوڑا تھوڑا دیتے ہیں، لیکن بندہ جب تکبر کرنے لگتا ہے تو سب چھین لیتے ہیں۔ قارون کو اتنا دیا مگر کیا ہوا؟ مال کسی ایک کے پاس نہیں رہتا، اور جب جاتا ہے تو بہت کم ہی دوبارہ واپس آتا ہے۔

ایک عبرت ناک واقعہ:

ایک صاحب بہت مالدار تھے۔ اپنے بیوی کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ اسی دوران ایک فقیر نے آواز لگائی۔ انھیں بڑا غصہ آیا، کوئی وقت نہیں ہوتا ان لوگوں کے پاس، جب جی میں آیا، آ دھمکتے ہیں۔ نوکروں کو حکم دیا کہ ’اسے دھکے دے کر نکال دو۔‘ اس کے بعد ان صاحب پر زوال آنا شروع ہوا، سارا مال دھیرے دھیرے ان کے قبضے سے نکل گیا۔ یہاں تک کہ بیوی کو کھلانے کا انتظام بھی نہیں رہ گیا، تو اس نے بیوی سے کہا کہ ’اب ہمارے پاس تمھیں کھلانے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اس لیے ہم تمھیں طلاق دیتے ہیں اور خود اپنی روزی کے لیے مانگنے نکلتے ہیں۔‘ چنانچہ اسے طلاق دیا اور خود مانگنے نکل گیا۔ اس عورت نے کسی اور سے نکاح کر لیا۔ ایک دن اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی کہ ایک فقیر سوال کرتا ہوا آیا۔ شوہر نے بیوی سے کہا کہ ’اسے کھانا پہنچا دو۔‘ عورت کھانا لے کر فقیر کے پاس گئی، اسے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ وہ اس کا پرانا شوہر ہے۔ اسے اس حال میں دیکھ کر زور سے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔ فقیر نے جب یہ

منظر دیکھا تو وہاں سے سرپٹ بھاگا کہ ہم پر کہیں کوئی الزام نہ آ جائے۔ امیر کا دروازہ ہے، پکڑے گئے تو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ اور اس کی چیخ سن کر اس کا شوہر دوڑا، فقیر غایب تھا اور عورت بے ہوش پڑی تھی۔ اس کو ہوش میں لانے کی تدبیر کی۔ جب وہ ہوش میں آئی تو ماجرا پوچھا، تو اس عورت نے پورا ماجرا سنایا کہ 'یہ فقیر میرا پرانا شوہر تھا، اور بہت مالدار تھا۔ ہم دونوں اسی طرح کھانا کھا رہے تھے کہ ایک فقیر آیا، جسے اس نے دھکے دے کر بھگا دیا تھا، اس کے بعد سے اس کی حالت خراب ہونی شروع ہوئی تو آج یہ حال ہو گیا ہے کہ بھیک مانگ رہا ہے۔' اس کے شوہر نے کہا کہ 'اچھا یہ بات ہے۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات سنو کہ 'وہ فقیر میں ہی تھا۔' اللہ نے اس کا سب کچھ چھین کر میرے حوالے کر دیا ہے حتی کہ اس کی بیوی بھی مجھے مل گئی۔'

نہ کس می دہاند نہ کس می دہد
خدا می دہاند خدا می دہد

اصل برکت ہے، کثرت نہیں:

اللہ فرماتے ہیں کہ اگر آبادی والے ایمان رکھتے اور تقوی اختیار کرتے تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکتیں سب کھول دیتے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں "مَن یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجعَل لَّہٗ مَخرَجاًوَیَرزُقہُ مِن حَیثُ لَا یَحتَسِبُ"(سورۃ الطلاق آیۃ ۲،۳) جو اللہ کو راضی کرتا ہے اور تقوی اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالی تمام مشکلات میں آسانی پیدا فرماتے ہیں، اور ایسی جگہ سے روزی دیتے ہیں جہاں سے خیال بھی نہیں ہوتا۔ روزی گننے کی چیز نہیں ہے، برکت کی چیز ہے۔ مال گننے میں بہت زیادہ ہو مگر برکت نہ ہو تو وہ بے کار ہے۔ اور اگر مال میں برکت ہے تو بھلے گننے میں بہت تھوڑا ہو، اس سے اللہ بڑے سے بڑا کام بنا دیں گے۔

غزوہ بدر میں مجاہدین تین سو تیرہ تھے، وہ بھی نہتے۔ مگر ایک ہزار کی اسلحہ سے لیس کثیر فوج پر غالب آ گئے۔ " کَم مِن فِئَۃٍ قَلِیلَۃٍ غَلَبَت فِئَۃً کَثِیرَۃً بِاِذنِ اللّٰہِ"(سورۃ

البقـرۃ آیۃ ۲۴۹) نہ جانے کتنی چھوٹی جماعتیں ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں۔ تو مال میں برکت ہوگی تو کام ہوگا۔ اور برکت آتی ہے تقوی سے۔ برکت اللہ کے نام میں ہے، جہاں اللہ کا نام ہوگا برکت وہاں آئے گی۔ اللہ کا نام دل میں آئے گا تو برکت دل میں آئے گی۔

مومن ایک آنت میں کھاتا ہے:

حضور پاک ﷺ کے دربار میں اخیر زمانہ میں بہت سے لوگ آتے تھے، اور آپ ان کے کھانے کا انتظام صحابہ کے یہاں کر دیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ لوگوں سے فرمادیا کرتے تھے کہ ’ایک ایک مہمان اپنے گھر لے جاؤ۔‘ اور لوگ لے جاتے۔ ایک بار ایک صاحب آئے، ڈیل ڈول بہت تگڑا، نام بھی ویسا ہی تھا ’جہجاہ‘۔ آپ کے مہمان ہوئے۔ حضور ﷺ نے حکم دیا کہ ’لوگ ایک ایک مہمان لے جائیں۔‘ ان کو جو دیکھتا چھوڑ دیتا، حتی کہ سارے مہمان چلے گئے، اور یہ بے چارے اکیلے بیٹھے رہ گئے۔ حضور ﷺ نے ان کو اکیلا بیٹھا دیکھا تو فرمایا کہ ’تم میرے مہمان ہو۔‘ اور ازواج کے گھر سے کھانا منگا کر انھیں کھلایا۔ یہ صاحب سارا کھانا چٹ کر گئے۔ دوسرے دن بھی یہی ہوا۔ تیسرے دن بھی لوگ اور مہمانوں کو لے گئے اور ان کو چھوڑ گئے تو حضور ﷺ نے ایک گھر سے کھانا منگوا کر انھیں کھلایا۔ مگر خلافِ توقع انھوں نے آسودہ ہوکر کھایا اور کھانا بھی بچ گیا۔ ازواج کو بڑا تعجب ہوا کہ یہ صاحب دو دن تک سارے گھروں کا کھانا کھا کر بھی بھوکے رہ جاتے تھے، اور آج ایک گھر کا کھانا بھی بچ گیا۔ حضور ﷺ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ ’کل تک یہ شخص کافر تھا، اور آج مومن ہے۔ اور مومن ایک آنت میں کھاتا ہے۔‘ (حیات الصحابہ)

حضور ﷺ کی برکت:

حضرت مقداد بن عمرو الکندی ؓ کہتے ہیں کہ ’میں اور میرے دو ساتھی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہمیں بھوک لگی ہوئی تھی، ہم نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ’بھوک لگی ہے۔‘ آپ ﷺ نے چار بکری دودھ نکالنے کے لیے مجھے دی اور

فرمایا کہ ’ایک تمھارے لیے، ایک میرے لیے اور دو تمھارے ساتھیوں کے لیے۔‘ دودھ نکالا گیا اور ہم لوگوں نے پی لیا اور رسول اللہ ﷺ کا حصہ ڈھک کر رکھ دیا گیا۔ آپ باہر تشریف لے گئے تھے، میرے دل میں خیال آیا کہ آپ جہاں تشریف لے گئے ہیں وہاں سے رات کا کھانا کھا کر لوٹیں گے، آپ کو دودھ کی کیا ضرورت ہوگی؟ مسلسل یہ خیال میرے دل میں گردش کرتا رہا یہاں تک کہ میں نے آپ کا حصہ بھی پی لیا۔ اب مجھے یہ خوف ستانے لگا کہ کہیں رسول اللہ ﷺ بھوکے لوٹیں اور پیالے کو خالی پا کر میرے لیے بددعا نہ کردیں۔ اس خیال سے میری نیند اُڑ گئی مگر میں نے سونے والوں کی سی ہیئت بنالی۔ جب رسول اللہ ﷺ واپس لوٹے تو آہستہ سے سلام کیا کہ جاگنے والے سن لیں اور سونے والوں کی نیند میں خلل نہ پڑے۔ اور جب پیالے کو خالی دیکھا تو آسمان کی طرف سر اٹھایا اور یہ دعا پڑھی ”اَللّٰهُمَّ اَطْعِمْ مَنْ اَطْعَمَنَا وَاسْقِ مَنْ سَقَانَا“ میں نے جب دیکھا کہ آپ بددعا نہیں کررہے ہیں بلکہ دعا فرمارہے ہیں تو میں نے موقع کو غنیمت سمجھا اور اس ارادہ سے چھری لے کر اٹھا کہ ایک بکری آپ کے لیے ذبح کروں۔ جب بکری کو ذبح کے ارادے سے پکڑا تو اس کے تھن پر میرا ہاتھ لگا، دیکھا تو وہ دودھ سے بھرا ہوا تھا، دوسری بکریوں کو دیکھا تو ان کا تھن بھی دودھ سے لبریز تھا۔ برتن بھر کر پھر سے میں نے دودھ نکالا اور مسکراتے ہوئے آپ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ ’اے مقداد! یہ کیا ماجرا ہے؟‘ میں نے عرض کیا ’اے اللہ کے رسول! آپ پہلے دودھ پی لیجیے، اس کے بعد میں بتاتا ہوں۔‘ رسول اللہ ﷺ دودھ نوش فرمایا اور جو آپ سے بچا اس کو میں نے پھر پیا، اس کے بعد میں نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ رسول اللہ ﷺ فرمایا ’اے مقداد! یہ اللہ کی طرف سے برکت ہے۔ بہتر ہو کہ تم اپنے ساتھیوں کو جگا کر ان کو بھی اس برکت میں شامل کردو۔‘ میں نے عرض کیا کہ ’آپ نے پی لیا، میں نے پی لیا، بس کافی ہے۔ انھیں سویا ہی رہنے دیجیے۔‘ (دلائل النبوۃ لقوام السنۃ)

غرض مقداد بن عمرو رضی اللہ عنہ کو تین بار دودھ پینے کو ملا۔ ایک اپنا حصہ، ایک حضور ﷺ

کا حصہ، اور ایک بار یہ۔ یہ اللہ کی طرف سے برکت تھی۔ تقوی میں برکت ہوتی ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ اللہ کا نام لے کر کام کریں تو برکت آئے گی، اور اگر اللہ کا نام نہیں لیں گے تو آئی ہوئی برکت واپس چلی جائے گے۔

برکت اللہ کے نام میں ہے:

حضرت حذیفہؓ نے روایت کی ہے کہ ’جب ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھانا کھاتے تو ہم اپنے ہاتھ کو نہ ڈالتے جب تک رسول اللہ ﷺ شروع نہ کرتے اور ہاتھ نہ ڈالتے۔ ایک دفعہ ہم آپ کے ساتھ کھانے پر موجود تھے اور ایک لڑکی دوڑتی ہوئی آئی، جیسے اس کو کوئی ہانک رہا ہو، اور اس نے اپنا ہاتھ کھانے میں ڈالنا چاہا تو آپ ﷺ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر ایک دیہاتی دوڑتا ہوا آیا تو آپ ﷺ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر فرمایا کہ ’شیطان اس کھانے پر قدرت پالیتا ہے جس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے۔ اور وہ ایک لڑکی کو اس کھانے پر قدرت حاصل کرنے کو لایا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، پھر اس دیہاتی کو اسی غرض سے لایا تو میں نے اس کا بھی ہاتھ پکڑ لیا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اس (شیطان) کا ہاتھ اس لڑکی کے ہاتھ کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہے۔ (صحیح مسلم)

مدینہ طیبہ میں ایک بزرگ تھے، ان کے یہاں لوگ چائے پی رہے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ چائے پینے میں پندرہ نقصان ہیں۔ سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ بسم اللہ نہیں پڑھا جاتا۔ بہت اہم بات ہے۔ آدمی جو بھی کھائے پیے، جو کام کرے، سب پر اللہ کا نام لے۔ رات میں دروازہ بند کرے تو بسم اللہ پڑھ کر، بستر پر لیٹے تو بسم اللہ پڑھ کر۔ اللہ کا نام جہاں آئے گا، وہاں برکت ہوگی۔ کثرت سے اللہ کا نام لیجیے، بے برکتی ختم ہوجائے گی۔

ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ ’عجیب بے برکتی ہے۔ دس آدمی کا کھانا پکتا ہے اور پانچ آدمی کو بھی کافی نہیں ہوتا۔‘ میں نے کہا کہ ’میرے پاس برکت کی صرف ایک

تعویذ ہے۔ گھر کی عورتوں سے کہیے کہ برتن سے غلہ نکالنے کے وقت سے لے کر کھانا تیار ہونے تک، کثرت سے اللہ کا نام لیں۔ غلہ نکالیں تو بسم اللہ پڑھیں، آٹا گوندھیں تو پڑھیں، روٹی بیلیں تو پڑھیں، توے پر روٹی ڈالیں تو پڑھیں۔ کثرت سے اللہ کا نام لیتی رہیں، بے برکتی ختم ہوجائے گی۔' بہت دنوں کے بعد ان سے ملاقات ہوئی تو وہ صاحب گاڑی چلا رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ کثرت سے بسم اللہ پڑھ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ 'اب یہ حال ہوگیا ہے کہ کثرت سے اس کا ورد جاری ہے۔' تو کہنے لگے کہ 'ہاں، اسی کی برکت سے ساری بے برکتی ختم ہوگئی۔'

اللہ کا نام جہاں آئے گا، بے برکتی ختم ہوجائے گی، اور برکت آئے گی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے تو اس وقت بھی بسم اللہ کی تلقین کی ہے جب آدمی اپنی بیوی سے ملتا ہے۔ اس کی برکت سے اولاد اچھی اور نیک بخت پیدا ہوتی ہے۔

تین بات:

تین باتیں ہوئیں (۱) اللہ پر ایمان رکھیں (۲) تقوی اختیار کریں، اور اللہ کی اطاعت کریں۔ مال کی فکر نہ کریں، روزی حق تعالی دیں گے۔ بظاہر گننے میں کم ہوگی مگر ایسی برکت دیں گے کہ اسی میں سارا کام ہوجائے گا:

قَلِيْلٌ مِنْكَ تُكْفِيْكَ وَلٰكِنْ
قَلِيْلُكَ لَا يُقَالُ قَلِيْلٌ

اللہ کی ذات پر یقین رکھنے کے ساتھ ساتھ اللہ کی اطاعت کرنا ہے۔ مال کی فکر نہ کریں، یہ تو آنے جانے والی چیز ہے، اِدھر سے اُدھر ہوتا رہتا ہے۔

مال ودولت میں دوام نہیں ہے:

ایک بڑے عابد تھے۔ ایک بار ان کی بہو نے دیکھا کہ ایک عورت ان کے خاص کمرے کی طرف گئی، دروازہ کھلا اور اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد باہر نکلی اور واپس چلی گئی۔ بہو کو بڑا غصہ آیا کہ دنیا والوں کی نگاہ میں صاحب بڑے بزرگ بنتے ہیں،

چنیں ہیں چناں ہیں، اور تنہائی کا یہ عالم ہے کہ ایک عورت تنہائی میں ملا کرتی ہے۔ غصہ میں آگ بگولا تھی۔ شوہر آیا تو اس کو ساری داستان سنا ڈالی کہ اس عمر میں آپ کے ابا حضور کا یہ حال ہے۔ شوہر کو بھی بڑا غصہ آیا۔ والد کے پاس پہنچے، سارا ماجرا سنایا۔ والد نے پوچھا کہ ‘تم دیکھے ہو؟’ کہا ‘نہیں، آپ کی بہو نے دیکھا ہے۔’ پوچھا کہ ‘اس نے واقعی دیکھا ہے؟’ کہا ‘ہاں، اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔’ تب ان بزرگ نے بتلایا کہ وہ عورت نہیں، دولت تھی۔ میرے پاس آکر کہہ رہی تھی کہ ‘آپ کے پاس رہوں گی۔’ میں نے پوچھا کہ ہمیشہ کے لیے یا کچھ دنوں کے لیے؟’ اس نے کہا کہ ‘ہمیشہ تو میں کسی کے پاس نہیں رہتی۔’ تو میں نے کہا کہ ‘ہمیشہ رہنا ہو تو ٹھیک ہے ورنہ مجھے ضرورت نہیں ہے، تم جا سکتی ہو۔’ چنانچہ وہ چلی گئی۔ اب جب بیٹے نے سنا تو رال ٹپکنے لگی، کہا ‘ابا حضور! اسے روک لیے ہوتے۔’ باپ نے کہا کہ ‘بیٹا! وہ کچھ دن ہی رہتی، پھر اسے جانا ہی تھا۔’ بیٹے نے کہا کہ ‘کچھ دن ہی سہی، آرام سے گذرتے۔’ ابا نے کہہ دیا کہ ‘ٹھیک ہے، اب آئے گی تو روک لوں گا۔’ پھر کچھ دن کے بعد عورت کی شکل میں آئی اور گذارش کی کہ ‘میں آپ کے پاس رہوں گی۔’ انھوں نے روک لیا۔ اب صاحب کہاں جھونپڑی بھی نصیب نہ تھی، اب عمارتیں بن رہی ہیں، بلڈنگیں تیار ہو رہی ہیں، آرائش کے سارے سامان میسر ہو رہے ہیں اور رئیسانہ زندگی شروع ہوگئی۔ پھر کچھ دن کے بعد دنیا جانے لگی اور پھر وہی پرانی جھونپڑی، ساری چیزیں ایک ایک کر کے ختم! تو یہ دنیا کسی کے پاس نہیں رہتی۔ ہاں جن بندوں کا تعلق اللہ سے مضبوط ہوتا ہے، نہ اس کے آنے پر اتراہٹ ہوتی ہے اور نہ جانے پر تکلیف کا احساس ہوتا ہے، تو ان پاس کے مال کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہے۔ روزی جتنی ملنی ہے مل کر رہے گی، ہاں ہم دعا کریں کہ اللہ تعالی آسانی سے عطا فرما دیں اور اس میں برکت دیں۔

۳) تیسری بات یہ ہے کہ ہر جگہ اللہ کا نام لیتا رہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ”کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَأُ بِاِسْمِ اللّٰہ فَھُوَاَقْطَعُ“ (رواہ ابن ماجہ) جو کام اللہ کے نام کے

بغیر شروع کیا جائے وہ ناقص ہوتا ہے۔ آدمی روزی کے لیے پریشان نہ ہو، اللہ کی ذات پر یقین رکھے، سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ایک ریٹائرڈ پروفیسر مجھ سے کہنے لگے کہ مجھے کچھ رقم ملی ہے، اور میں حج کرنا چاہتا ہوں مگر بیٹی کی شادی کا بھی مسئلہ ہے۔ اور یہ رقم اتنی ہے کہ ایک ہی کام ہو سکتا ہے۔ میں نے فلاں صاحب سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ شادی کرنا ضروری ہے، حج فرض نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ انھوں نے غلط بتایا، شادی بیاہ میں جو فضول خرچیاں ہیں، وہ شرعاً ضروری تو ہیں نہیں، اور استطاعت کے بعد حج فرض ہے۔ اس لیے پہلے آپ حج پر جائیے، شادی بیاہ کا مسئلہ اللہ تعالیٰ حل فرما دیں گے۔ وہ صاحب پس و پیش کرنے لگے۔ میں نے خوب سمجھایا تو تیار ہو گئے۔ کچھ دنوں کے بعد ملاقات ہوئی تو انھوں نے خوش خبری سنائی کہ حج بھی کر لیا اور شادی بھی ہو گئی۔

میرے دوستو! اگر ہم نے ان باتوں کو دھیان میں رکھا تو ان شاء اللہ سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ دعا ماثورہ ہے۔ ”اَللّٰھُمَّ لَا سَھُلَ اِلَّا مَا جَعَلْتَہٗ سَھُلًا وَاَنْتَ تَجْعَلُ الْحُزْنَ سَھُلًا اِذَا شِئْتَ“ اے اللہ! سہل صرف وہی ہے جس کو آپ سہل بنا دیں، اور اگر آپ چاہیں تو رنج کو سہل کر دیں۔ اللہ نے جو کام ہمارے ذمہ کیا ہے وہ ہم کریں، اور جو کام انھیں کرنا ہے، وہ انھیں کے حوالے رکھیں، تو بے برکتی ختم ہو جائے گی اور سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

اللہ توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین

❑❑❑

بیان بعد نماز ظہر، بمقام جامع مسجد کھجوری، مدھوبنی
۲۵؍شوال ۱۴۲۷ھ بروز سنیچر

دین و دنیا ہر چیز میں خوبی مطلوب ہے

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہ وَنَسْتَعِیْنُہ وَنَسْتَغْفِرُہ وَنُوْمِنُ بِہ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہ وَ مَن یُّضْلِلْہ فَلَا ھَادِیَ لَہ۔ وَنَشْھَدُ اَن لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہ لَا شَرِیْکَ لَہ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمّداً عَبْدُہ وَرَسُوْلُہ اَرْسَلَہ بِالْحَقِّ بَشِیْراً وَنَذِیْراً۔ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہ وَاَصْحَابِہ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً۔ اَمَّا بَعْدُ:

فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمان الرحیم

تَبَارَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ(۱) الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیَاۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ(۲)[سورہ الملک)

محترم بزرگو اور دوستو! ایک بات کہنا چاہتا ہوں وہ ایسی بات جو ہمارے لیے ضروری بھی ہے اور مفید بھی ہے۔ کس انداز میں وہ بات پیش کروں دیر سے سوچ رہا ہوں۔ یہی سوچتے سوچتے بیٹھ گیا، دعا کیجیے کہ وہ بات میں اچھے انداز میں کہہ سکوں، ایسے انداز میں جو اللہ کو بھی پسند ہو اور رسول کو بھی پسند ہو۔

سورہ ملک کی فضیلت:

میں نے آپ کے سامنے دو آیتیں ابھی تلاوت کی ہیں۔ یہ دونوں آیتیں قرآن پاک کے انتیسویں پارے کی پہلی آیتیں ہیں یعنی سورہ ملک کی ہیں۔ یہ سورہ اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک بہت اہم ہے۔ اس کی اہمیت میں آپ کو بتاؤں۔ رسول اللہ ﷺ

ارشاد فرماتے ہیں کہ 'قیامت کے دن دو سورتیں یعنی سورہ 'ملک' اور 'الم سجدہ' بڑے بڑے پرندوں کی شکل میں آئیں گی۔ اتنے بڑے پرندے کی شکل میں کہ اس کے سائے میں بہت سے لوگ آجائیں گے۔ اور اللہ کے سامنے عرض کریں گی کہ 'پروردگار! آپ کا فلاں بندہ جو جہنم میں جانے کا مستحق ہورہا ہے، وہ ہم کو پڑھتا تھا، ہماری تلاوت کرتا تھا۔ پروردگار! آپ اس کو بخش دیجیے۔' یعنی اللہ کا کلام اپنے پڑھنے والے کے حق میں سفارش کرے گا، اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ایک بات اور کہیں گی۔ وہ یہ کہ 'پروردگار! اگر آپ کو اسے بخشنا منظور نہیں ہے، جنت میں لے جانا منظور نہیں ہے تو ہم کو اپنے کلام سے خارج کردیجیے۔' اور یہ بات ظاہر ہے کہ جو کلامِ الٰہی ہے وہ کلام سے خارج نہیں ہوسکتا، وہ اللہ کی صفت ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ لیکن اتنی بڑی بات ان دونوں سورتوں کی طرف سے آئے گی۔ اللہ ان کی سفارش قبول کریں گے اور اس آدمی کو بخش دیں گے۔

ان دونوں سورتوں کا یہ مقام ومرتبہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں سورتوں کی تلاوت کی تاکید فرمائی ہے۔ ان دونوں کی تلاوت کا وقت بتلایا ہے رات میں سونے سے پہلے۔ آپ اس کی تلاوت مغرب بعد کرلیجیے یا عشا بعد کرلیجیے۔ اگر اس کی تلاوت کرتے رہے تو مرنے کے بعد اللہ تعالی اس کی برکت سے عذابِ قبر سے محفوظ کردیں گے۔ ان دونوں سورتوں کا عذاب قبر سے بچانے میں خاص دخل ہے۔ اور دوسرا موقع ان دونوں سورتوں کی برکت کے ظہور کا وہ ہے جس کا تذکرہ ہوچکا ہے یعنی آدمی اگر اپنے گناہوں کی پاداش میں سزا کا مستحق ہوگا یہ دونوں سورتیں اتنی زبردست سفارش کریں گی کہ اتنی بڑی سفارش والا شاید کوئی اور نہ ہو۔

نابالغ اولاد والدین کے حق میں سفارشی ہوں گے:

ایک شخص اور ہوگا جس کی اتنی بڑی اور زبردست سفارش کی جائے گی۔ اور وہ آدمی ہوگا جس کا چھوٹا بچہ، نابالغ بچہ مرگیا ہوں۔ وہ بچہ بھی سفارش کرے گا کہ 'پروردگار! میرے ماں باپ کو جنت میں لے چلیے، اور اگر آپ ان کو جنت میں نہیں لے جاتے تو

مجھے بھی جہنم میں ڈال دیجیے۔ میں اپنے ماں باپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔' اللہ کو یہ منظور نہیں ہوگا کہ اس بچے کو جہنم میں ڈالیں، اس لیے اس کے طفیل اس کے ماں باپ کو بھی جن کے حق میں جہنم کا فیصلہ ہو چکا ہوگا جنت میں پہنچا دیا جائے گا۔

لیکن اس سے کہیں بڑی بات یہ ہے کہ اللہ کا کلام، اللہ کی بات، قرآن پاک کی سورت یہ کہہ رہی ہے کہ میری تلاوت کرنے والے کو بخش دیجیے، نہیں تو ہمیں بھی اپنے کلام سے نکال دیجیے۔

دین یسیر الفہم ہے:

بہر حال سورہ ملک کی جس آیت کی میں نے تلاوت کی ہے اس کا ترجمہ کرتا ہوں اور ترجمہ کے بعد وہ بات کہتا ہوں جو مجھے کہنی ہے اور اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں، ان شاء اللہ آپ سمجھ بھی لیں گے۔ اس لیے یہ دین اسلام کی بات ہے اور دین اسلام میں کوئی ایسی بات نہیں جو مشکل ہو، جس کا سمجھنا دشوار ہو۔ اللہ نے دین کو آسان بنایا ہے۔ دوسرے علوم مشکل ہو سکتے ہیں، منطق و فلسفہ اور سائنس مشکل ہو سکتی ہے مگر اللہ کا کلام مشکل نہیں ہے۔ "وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ" (سورۃ القمر آیۃ ۱۷) قرآن پاک کو ذکر کے لیے آسان کر دیا گیا ہے۔ ہاں البتہ یہ ہے کہ اس میں غور کرنے والے غور کرتے ہیں، تلاش کرنے والے تلاش کرتے ہیں، اس کی گہرائیوں میں اترتے ہیں تو اپنے دماغ اور اپنی استعداد کے مطابق مسائل نکالتے ہیں۔ لیکن جو کم ذہن کے لوگ ہیں وہ بھی اس کو بآسانی سمجھ لیتے ہیں اور ان کا سمجھنا بھی اللہ کے نزدیک معتبر ہوتا ہے۔ جو لوگ گہرائی میں اترتے ہیں وہ تو خیر قانون و دستور نکال کر لاتے ہیں مگر ایک عام آدمی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ قرآن کی بات مجھے سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ پورا قرآن پڑھ لیجیے اور اگر آپ عربی نہیں جانتے تو کسی عربی خواں سے ترجمہ کرا لیجیے، کہیں آپ کو محسوس نہیں ہوگا کہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اور اگر کہیں بظاہر ایسا محسوس ہو تو کسی بھی عالم سے اس کو بہت آسانی سے دس منٹ میں سمجھ سکتے ہیں۔ قرآن کی بات، اللہ کی بات بہت آسان

ہے۔ دشواری تو ہمارا نفس پیدا کرتا ہے جو کلام اللہ کو دیکھ کر گھبرا جاتا ہے، پڑھنا نہیں چاہتا، سمجھنا نہیں چاہتا، اس سے بچنے کے لیے قسم قسم کے بہانے کرتا ہے۔ لیکن انسان نفس کو کچل کر ادھر آنا چاہے تو راستہ بہت آسان ہے۔ جو اللہ کو راضی کرنا چاہتا ہو اور دین حق کو اختیار کرنا چاہتا ہو اس کے لیے بہت آسان ہے۔

قادر مطلق صرف ذات واحد ہے:

بہر حال اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں ’’تَبَارَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ‘‘ با برکت ہے وہ ذات، بڑی برکت والی ہے وہ ذات جس کے قبضہ میں حکومت ہے۔ دنیا و آخرت کی سب حکومتیں ایک اسی وحدہ لاشریک لہ کے قبضہ میں ہے۔ کون ہے جو کہے کہ یہ بات میری سمجھ نہیں آئی۔ یہ بات صرف مسلمان ہی نہیں دنیا کا ہر انسان سمجھتا ہے کہ حکومت سب اللہ کے اختیار میں ہے۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں ’’قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ‘‘ (سورة آل عمران آية ۲۶) حکم آ رہا ہے کہ کہو اس بات کو کہ ’اے اللہ! اے حکومت کے مالک! جس کو آپ چاہتے ہیں حکومت عطا کرتے ہیں اور جس سے چاہتے ہیں حکومت کو چھین لیتے ہیں۔ اس کا دنیا میں کون منکر ہوگا؟ کون انکار کرے گا؟ کائنات کا ہر فرد چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم سب اسے مانتے ہیں۔ دنیا میں بہت بڑے بڑے بادشاہ گزرے ہیں جن کے بارے میں سوچا نہیں جا سکتا تھا کہ ان کے ہاتھ سے حکومت چلی جائے گی مگر چلی گئی۔ ’’تِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ‘‘ (سورة آل عمران آية ۱۴۰) یہ زمانہ ہے، یہ وقت ہے اس میں ہم الٹ پلٹ کر لوگوں کو دیتے رہتے ہیں۔ کسی کو دیا، کسی سے لیا، یہ ہمیشہ چلتا رہتا ہے۔ بڑے سے بڑا آدمی علاج کرتا ہے، بڑے بڑے ڈاکٹر علاج کرتے ہیں، مگر جب پوچھا جاتا ہے کہ ’کوئی فایدہ ہے؟‘ تو کہتا ہے ’نہیں صاحب! کوئی فایدہ نہیں۔‘ ڈاکٹر سے پوچھا جائے تو کہتا کہ ’ہم نے اپنی پوری طاقت لگا دی جو دوا ہم دے سکتے تھے، دیدیا، جو کام کر سکتے تھے، کر دیا، مگر اب اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔‘ ہر آدمی

کو اپنی اوقات معلوم ہے۔ کوئی ایسا نہیں جو کہہ دے کہ 'میں اچھا کر دوں گا، صحت دینا میرے ہاتھ میں' کیوں کہ معلوم ہے میں بے بس ہوں، میرے اختیار میں نہیں، میں صرف دوا دے سکتا ہوں، صحت دینا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میرے اختیار میں کسی کو راستہ بتا دینا ہے، کامیاب کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔

عزت وذلت اللہ کے اختیار میں ہے:

ایک آدمی کامیابی کی تمام تدبیریں سوچ لیتا اور منصوبہ بند طریقے سے اس پر عمل کرتا ہے، کہیں چوک نہیں کرتا، اول سے آخر تک ساری تدبیریں ٹھیک ٹھیک اپنی جگہ استعمال کرتا مگر کامیاب نہیں ہوتا۔ اس لیے خدائے وحدہ لاشریک لہ کی طاقت کا منکر کوئی نہیں ہے، سب جانتے ہیں کہ حکومت اسی کی ہے۔ "تُؤتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ" جس کو آپ چاہتے ہیں حکومت دیتے ہیں جس سے چاہتے ہیں آپ حکومت چھین لیتے ہیں۔ "وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ" (سورة آل عمران آية ۲۶) نہ کسی کے ہاتھ میں عزت ہے، نہ کسی کے ہاتھ میں ذلت ہے۔ وہ جسے عزت دینا چاہیں اسے کوئی ذلیل نہیں کر سکتا، وہ ذلیل کرنا چاہیں تو کوئی عزت نہیں دے سکتا۔ تمام ذلت کے راستے ہوتے ہیں مگر اسی راستے میں عزت مل جاتی ہے۔ آدمی حیران وہکا بکا رہ جاتا ہے کہ ہم نے تو ذلت کا سارا سامان کیا تھا، اس کو ذلیل کرنے کے لیے ساری تدبیریں کی تھیں مگر دیکھیے کتنا اونچا ہو گیا۔

رسول اللہ ﷺ کی قدر افزائی:

حضور ﷺ جب طایف تشریف لے گئے تو وہاں کے لوگوں نے ذلیل کرنے کی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہاں کا سردار کہتا ہے کہ 'میں تم سے بات کرنا گوارا نہیں کرتا' اب اس سے بڑی ذلت کیا ہوگی؟ وہاں کے لوگوں نے لونڈوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا اور ان لوگوں نے آپ ﷺ پر وہ ستم ڈھائے کہ کہتے ہوئے زبان تھراتی ہے، دل کانپتا ہے۔ کوئی آدمی آپ ﷺ کی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوا، مگر آپ ﷺ نے اپنی بات پہنچانے

کی کوشش کی۔ لڑکوں کو لگا دیا کہ مارو۔ ایک معزز آدمی راستہ پر چل رہا ہے اور اَوباش اس پر پتھر برسائیں، اس سے زیادہ ذلت کی بات کیا ہوگی؟ کوئی حد نہیں چھوڑی آپ ﷺ کو ذلیل کرنے کی۔ یہ کام تو مکہ میں بھی نہیں ہوا تھا جو کام طائف میں ہوا۔ اس کا شدید احساس جناب نبی کریم ﷺ کو تھا۔ اس لیے جب آپ دعا کرنے کے لیے بیٹھے تو عجیب و غریب دعا کی۔

اور اس سے بڑھ کر میں آپ کو بتاؤں کہ غزوہِ احد میں رسول اکرم ﷺ زخمی ہوئے تھے۔ آپ کے سر پر ایک ظالم نے پتھر مار دیا تھا اور اس پتھر کی ضرب سے لوہے کی ٹوپی جو آپ اوڑھے ہوئے تھے جسے ''خَود'' کہتے ہیں، اس کی کڑیاں آپ ﷺ کے رخسار اور سر میں چبھ گئی تھیں، سامنے کے دانت شہید ہوگئے تھے۔ بڑی تکلیف ہوئی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ پوچھا کہ 'غزوہِ احد میں آپ کو جتنی تکلیف پہنچی ہے، زندگی میں اتنی تکلیف آپ کو نہیں پہنچی ہوگی۔' آپ ﷺ نے فرمایا کہ 'نہیں، اس سے زیادہ تکلیف مجھے طایف میں پہنچی تھی۔' یہاں تو پوری جماعت، فوج کی فوج میری مدد کے لیے موجود تھی، وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔' آپ ﷺ کے ایک آزاد کردہ غلام حضرت زید آپ کے ساتھ تھے۔ وہ بے چارے کیا کر سکتے تھے؟ یہاں تو دفاع کرنے والے موجود تھے وہاں کوئی نہیں تھا۔

طایف میں جب آپ ﷺ ظلم وستم سہہ کر نکلے تو ایک انگور کے باغ میں تشریف لے گئے، اس باغ کا مالک ایک عیسائی تھا، اس نے آپ ﷺ کو پہچان لیا۔ کتابوں میں آپ کی علامت پڑھ چکا تھا۔ خاطر مدارات کی، انگور اور پانی پیش کیا۔ آپ کے پاؤں مبارک سے اتنا خون نکلا تھا کہ جوتے چپک گئے تھے، نکل نہیں رہے تھے۔ حضرت زید نے نکال کر دھویا۔ اس وقت آپ نے ﷺ جو دعا فرمائی تھی وہ بڑی عجیب وغریب اور درد انگیز دعا تھی ''اَللّٰهُمَّ اِلَيْكَ اَشْكُوْ ضُعْفَ قُوَّتِىْ وَقِلَّةَ حِيْلَتِىْ وَهَوَانِىْ عَلَى النَّاسِ'' اے اللہ! میں آپ سے شکایت کرتا ہوں۔ کس کی شکایت کر رہے ہیں؟ کسی کی نہیں، یہ

نہیں کہہ رہے ہیں کہ ان لوگوں نے مجھے مارا، ستایا، ذلیل کیا ہے۔ ان کو برباد کردے۔ نہیں بلکہ یہ فرمایا کہ 'اے اللہ! میں آپ سے شکایت کرتا ہوں اپنی کمزوری کی۔ میں ہی کمزور ہوں، میری کمزوری کا فائدہ یہ لوگ اٹھا رہے ہیں۔' اور 'اے پروردگار! میں آپ سے شکایت کرتا ہوں تدبیر کی کمی کی۔' میرے پاس تدبیر نہیں، کروں تو کیا کروں؟ اور 'اے اللہ! میں شکایت کرتا ہوں اس بات کی کہ میں لوگوں کے نزدیک اتنا ذلیل ہوکر رہ گیا ہوں، اتنا کمزور ہوگیا ہوں کہ لوگ مجھے پتھر مارتے ہیں۔' 'اے اللہ! میں آپ سے اپنی کمزوری، تدبیر کی کمی اور لوگوں کے نزدیک اپنے ذلیل ہونے کی شکایت کرتا ہوں۔' یعنی کُل اپنے ہی بارے میں کہا۔ پھر فرماتے ہیں "یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعِفِیْنَ وَاَنْتَ رَبِّیْ !'' اے رحم کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر رحم کرنے والے! آپ کمزوروں کے رب ہیں اور میرے رب ہیں۔ "اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ" آپ مجھے کس کے حوالے کررہے ہیں؟ "اِلٰی عَدُوٍّ یَتَجَهَّمُنِیْ" کیا ایسے دشمن کے حوالے کررہے ہیں جو مجھ پر بڑھ بڑھ کر حملہ کررہا ہے۔ "اَمْ اِلٰی قَرِیْبٍ مَلَکْتَهٗ اَمْرِیْ" یا کوئی میرا ایسا قریبی آدمی ہے جو میرے تمام کاموں کا مالک ہے۔ پھر اس کے بعد فرماتے ہیں "اِنْ لَمْ تَکُنْ سَاخِطاً عَلَیَّ" اے پروردگار! اگر آپ مجھ سے ناراض نہیں ہے "فَلَا اُبَالِیْ" تو مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔ پھر فرماتے ہیں "غَیْرَ اَنَّ عَافِیَتَكَ اَوْسَعُ لِیْ" مگر آپ کے عافیت میرے لیے بہت کشادگی رکھتی ہے۔ پروردگار! آپ کی عافیت چاہتا ہوں۔

یہ سارا سامان انتہائی تذلیل کا تھا، انتہائی ذلت کا تھا، مگر یہی ذلت کا سامان جناب نبی کریم ﷺ کے لیے عزت کا سب سے بڑا سامان بن گیا۔ کیسے؟ آپ وہاں سے واپس آرہے ہیں، طایف سے ایک گونہ مایوسی ہوچکی تھی۔ اللہ کی طرف سے دو فرشتے ایک بڑی پیش کش لے کر آئے۔ ایک حضرت جبرئیل تھے اور دوسرے پہاڑوں کے فرشتے تھے جن کے ذمہ پہاڑوں کا کام ہوتا ہے۔ حضرت جبرئیل نے کہا کہ یہ پہاڑوں کا فرشتہ ہے اور آپ سے اجازت لینے آیا ہے، آپ کی فریاد آسمان پر سن لی گئی، ایک پہاڑ

اِس طرف ہے اور دوسرا پہاڑ اُس طرف ہے اور بیچ میں طایف کی آبادی ہے، اگر آپ اجازت دیں تو یہ فرشتہ دونوں پہاڑوں کے ملا دے اور درمیان میں طایف والے پس کر ختم ہو جائیں۔ آپ ﷺ کو ظالم دشمنوں سے بدلہ لینے کا موقع دیا گیا، اگر آپ چاہتے تو چشم زدن میں پوری آبادی ختم ہو جاتی مگر وہاں رحمۃٌ للعالمینی کی شان تھی، آپ رحمۃٌ للعالمین تھے، آپ کو یہ کب برداشت ہوتا؟ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ ’نہیں نہیں، میں یہ نہیں چاہتا، اگر یہ ایمان نہیں لاتے ہیں نہ لائیں، مگر مجھے امید ہے کہ ان اولادیں ایمان لائیں گی۔‘ اگر آپ چاہتے تو طایف قیامت تک کے لیے نشانِ عبرت بن جاتا مگر آپ نے اس امید پر کہ یہ نہیں تو ان کے بعد والے ممکن ہے کہ مان لیں، ان کو معاف فرما دیا۔ چنانچہ آپ ﷺ کی یہ امید ثمر آور ہوئی۔ اخیر اخیر زمانہ میں طایف کے لوگ بکثرت آپ کے پاس پہنچے اور ایمان لائے۔

ایک اعزاز تو یہ ہوا، اور دوسرا اعزاز یہ ہوا کہ جب آپ وہاں سے چلے تو ایک وادی میں فجر کا وقت ہو گیا۔ آپ فجر کی نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ نماز کے دوران جوق در جوق غیبی مخلوق یعنی جنات آنا شروع ہو گئے اور آپ کو گھیر لیا اور قرآن سننے لگے۔ بہت متاثر ہوئے اور سب نے وہیں اسلام قبول کیا۔ آپ ﷺ نے ان لوگوں کو بھیج دیا کہ جا کر اپنی قوم میں دعوت دو۔ چنانچہ قرآن میں اس واقعہ سے متعلق پوری ایک سورۃ نازل ہوئی جس کا نام سورۃ ’’جن‘‘ ہے۔

آپ کی تسلی اور اطمینان کے لیے اللہ نے جناتوں کو بھیج دیا کہ ’اے نبی! اگر آنکھوں کے سامنے رہنے والی مخلوق آپ کی بات نہیں مانتی، آپ کو ذلیل کرتی ہے، آپ کی مخالفت کرتی ہے، تو ہم ایک اَن دیکھی مخلوق بھیجتے ہیں جو سرکشی میں بہت آگے ہے مگر آپ کے قدموں میں جھک جائے گی۔ دیکھیے! اب اللہ نے اپنے بندے، اپنے رسول کی کیسے دل جوئی بلکہ دوسرے لفظوں میں کہیے تو ناز برداری شروع کی۔ تم کو یہاں ستایا گیا، تم کو شکایت ہے کہ تم لوگوں کے نزدیک ہلکے ہو گئے ہو۔ نہیں نہیں، تم بہت عزت والے ہو

ابھی لوگ تم کو ذلیل کر رہے تھے مگر اب دیکھو کہ غیبی مخلوق جس کو انسان کی آنکھیں نہیں دیکھ سکتی، یہ بہت بڑی مخلوق ہے، طاقت ور مخلوق ہے، تمھارے قدموں میں جھک رہی ہے تمھاری بات مان رہی ہے۔

یہ تو راستہ میں ہوا۔ مکہ پہنچنے کے کچھ دنوں کے بعد آپ ﷺ حضرت ام ہانی، جو آپ کی چچازاد بہن ہیں، کے گھر لیٹے ہوئے ہیں۔ فرشتہ آتا ہے اور کہتا ہے ’اٹھیے یہاں سے چلیے۔‘ آپ حرم شریف میں تشریف لائے۔ حطیم میں دو فرشتوں نے آپ کا سینۂ مبارک چاک کیا، زمزم کے پانی سے سینہ کی صفائی کی۔ اس کے بعد اللہ جانے کیا کیا احوال گزرے۔ اس کے بعد براق کی سواری حاضر کی گئی، جس کی خوبی یہ تھی کہ جہاں تک اس کی نگاہ جاتی تھی وہاں تک اس کا قدم بھی جاتا تھا۔ اس پر بیٹھ کر بیت المقدس پہنچے۔ بیت المقدس میں ایک عجیب منظر تھا، پوری مسجد بھری ہوئی ہے۔ کن لوگوں سے بھری ہے؟ نورانی شکلوں اور مقدس چہروں سے۔ آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک کے سارے انبیا جمع ہیں۔ ایک عجیب روحانی منظر ہے۔ سارے انبیا اِکٹھا ہیں، ان کا اجتماع کبھی نہیں ہوا تھا، یہ لوگ اپنے اپنے زمانے میں تھے اور وقت پورا کر کے جا چکے تھے، مگر ان کو اللہ نے جمع کر دیا، کس کے لیے؟ کس کے استقبال کے لیے؟ آپ ﷺ کے استقبال کے لیے۔ آپ ﷺ کی دل جوئی کے لیے۔ آپ ﷺ نے مخلوق کی نگاہ میں ہلکے ہونے کی جو شکایت کی تھی، اس شکایت کو دور کرنے کے لیے کہ ’دیکھیے! آپ کا وزن کیا ہے! جو کام کبھی نہیں ہوا، وہ آپ کے لیے ہو رہا ہے۔‘ چشمِ فلک نے اتنا مقدس اجتماع کبھی نہیں دیکھا، آج آپ کے اعزاز کے لیے دنیا کی برگزیدہ ترین مخلوق کو جمع کیا گیا ہے۔ نماز کا وقت ہو گیا ہے، لیکن نماز پڑھائے کون؟ انبیا کی امامت کون کرے؟ انتظار تھا آپ ہی کے آنے کا، آپ امام الانبیا ہیں، سارے لوگ آپ ہی کے منتظر تھے۔ حضرت جبرئیل نے آپ ﷺ کو آگے بڑھایا۔ آپ نے امامت کی۔ ’آپ کہہ رہے تھے کہ میں لوگوں کے نزدیک ذلیل ہو گیا ہوں۔‘ دیکھیے اپنی عزت! اس سے بڑا اعزاز دنیا میں اور

کیا ہوسکتا ہے! کہ دنیا کی جو سب سے برگزیدہ ہستیاں تھیں، جن کا کوئی جواب نہیں، ان سب کے آپ امام بنائے گئے۔ نماز کے بعد آپ نے خطبہ دیا، اس کے بعد یہ مقدس مجلس برخاست ہوئی۔

ابھی آپ زمین پر ہیں، ابھی آپ نے اپنی زمین کی عزت دیکھی ہے۔ ابھی آپ کا آسمان پر جانا باقی ہے، وہاں جو اعزاز ہوگا وہ دیکھیے۔ پھر آپ آسمان پر لے جائے گئے۔ پہلا آسمان، دوسرا آسمان، تیسرا آسمان، چوتھا آسمان، پانچواں آسمان، چھٹا آسمان پھر ساتواں آسمان۔ مخلوقات کی حد ختم ہوگئی، مگر ابھی نہیں، ابھی اور آگے چلیے۔ اس لیے کہ ساتویں آسمان کے بعد بھی کچھ ہے۔ پھر عرش ہے، کرسی ہے۔ وہاں تک لے جایا گیا۔ اتنا اونچا اٹھایا گیا کہ مقرب فرشتے حضرت جبرئیل کی حد بھی ختم ہوگئی۔ آپ ﷺ نے ایک مقام پر حضرت جبرئیل سے کہا کہ 'چلیے' مگر انھوں نے جواب دیا کہ 'نہیں، بس میری رسائی یہیں تک ہے۔ اس سے آگے کا مقام آپ کا ہے۔' چنانچہ آپ ﷺ آگے بڑھے، ساتھ میں کوئی نہیں، خدا جانے کہاں تک پہنچے:

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

اب کون پوچھے کہ کہاں تک پہنچے؟ اب وہی بتائیں گے تو پتہ چلے گا، دوسرا کوئی نہیں جانتا۔ ”فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى“ (سورۃ النجم آیۃ ۹) اتنا قریب پہنچے کہ صرف دو کمان کا فاصلہ رہ گیا یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ پتہ ہے کتنا؟ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ مجلس میں تشریف فرما تھے۔ ایک یہودی عالم آیا، اس نے پرکھنے کے لیے کہ واقعی آپ سچے نبی ہے یا نہیں؟ سوال پوچھا کہ 'اللہ کے نزدیک سب سے بہتر زمین کون سی ہے؟' آپ ﷺ اس کا سوال سن کر خاموش رہے، جبرئیل کے آنے کا انتظار کرنے لگے، تاکہ وہ آئیں اور جواب بتائیں۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت جبرئیل

آئے، آپ ﷺ دیکھ کر خوش ہوگئے۔ ان سے پوچھا کہ 'اللہ کے نزدیک سب سے بہتر زمین کون سی ہے؟' جبرئیل بھی ہکابکا رہ گئے کہ مجھے بھی نہیں معلوم۔ ”مَاالْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ“ جس سے پوچھا جارہا ہے، وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔ آپ ﷺ سمجھے تھے کہ علم لے کر آئے ہیں مگر اللہ نے علم دے کر نہیں بھیجا تھا، ویسے ہی بھیج دیا تھا کہ جاؤ تمھارا انتظار ہو رہا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ 'اچھا جائیے! پوچھ کر آیئے۔' اُدھر سے اللہ نے بھیجا تھا، اب آپ بھیج رہے ہیں۔ مجلس قایم ہے، یہودی عالم بیٹھا ہوا ہے اور لوگ بھی بیٹھے انتظار کر رہے۔ فرشتوں کو آنے جانے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ تھوڑی دیر میں پوچھ کر واپس آگئے۔ جس وقت آئے تھے، اس وقت حضرت جبرئیل کی کیا کیفیت تھی، اس کا تذکرہ حدیث میں اِن لفظوں میں ہے ”يَتَهَلَّلُ وَجْهُهٗ“ ”ان کا چہرہ خوشی کی وجہ سے دمک رہا تھا۔ اور آتے ہی جواب بتانے کے بجائے یہ کہا کہ 'اے محمد! آج میں اللہ سے اتنا قریب ہوا اتنا قریب ہوا کہ اس سے پہلے کبھی اتنا قریب نہیں ہوا تھا۔' یعنی معراج کی شب میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ اتنا قریب نہیں گئے تھے، بس جہاں تک ان کا مقام تھا وہیں تک گئے۔ آج اس سے بھی زیادہ قریب تک گئے تھے۔ آپ ﷺ بھی جواب پوچھنا بھول گئے اور پوچھا کہ ” كَيْفَ كَانَ ذَالِكَ يَاجِبْرَئِيْلُ !“ جبرئیل کیسے ہوا؟ کہاں تک پہنچے؟ کہنے لگے کہ 'میں تو آج اتنا قریب پہنچ گیا کہ میرے اور اللہ کے درمیان صرف ستر ہزار نور کے پردے تھے۔' صرف ستر ہزار! اللہ اکبر۔ آپ سوچیے کہ مقرب فرشتہ کا جو انتہائی قرب ہے، اس کے درمیان ستر ہزار نور کے پردے ہیں۔ اللہ کی ذات وراء الورا ثم وراء الورا ہے۔ اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ یہ قرب آپ ہی کی برکت سے تھا۔ کیوں کہ جبرئیل کو آپ نے بھیجا تھا، آپ کی رسائی جہاں تک تھی آپ کے قاصد کی رسائی بھی وہاں تک ہوئی۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ رسول اللہ ﷺ کا مقام و مرتبہ کیا ہے! قرآن نے آپ ﷺ کے قرب کو ”فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی“ (سورۃ النجم آیۃ ۹) سے بیان کیا۔ کہاں ستر ہزار نور کے پردے اور کہاں دو کمان یا اس سے بھی کم کا فاصلہ!

طایف والوں نے جتنا ذلیل کرنے اور ستانے کی کوشش کی تھی اللہ نے اس سے سوا عزت بخشی۔ ان لوگوں نے جس کو ذلت کا سامان سمجھا، اللہ نے اسے عزت کا سامان بنا دیا۔ گراؤ کتنا گراؤ گے؟ اٹھانے والا اٹھا رہا ہے۔ گیند کو جتنا زور سے زمین پر مارو گے اتنی ہی بلندی تک جائے گی۔ اتنی بلندی، اتنی عزت عطا کی کہ کائنات کی ہر چیز حیران رہ گئی۔ اس بلندی تک، اس اعزاز تک نہ آج تک کوئی پہنچا ہے اور نہ قیامت تک کوئی پہنچ سکتا ہے۔

خدا کے نزدیک سب سے بہتر زمین:

خیر فرشتے نے جو جواب بتایا وہ بھی سن لیجیے! اللہ نے جواب دے کر بھیجا کہ 'میرے نزدیک سب سے بہترین زمین مسجد ہے، جو صرف اللہ کی یاد کے لیے، اللہ کا نام لینے کے لیے، اللہ کی عبادت کے لیے بنائی جاتی ہے۔' سب سے بہتر زمین کا ٹکڑا وہ ہے جس پر مسجد بنا دی گئی ہو۔ اور ساتھ ہی ساتھ ایک بات اور بتا دی کہ 'میرے نزدیک سب سے بدتر زمین وہ ہے جس پر بازار ہو۔' (مسلم) بازار کا موضوع صرف دنیا ہے اور مسجد کا موضوع صرف اللہ ہے۔ اللہ کی ذات سب سے بڑی ہے، اس لیے جو زمین ان سے متعلق ہوگی وہ بھی سب سے بڑی ہوگی۔ اور اللہ کے نزدیک سب سے کم درجہ کی چیز دنیا ہے، اس لیے جو چیز دنیا سے تعلق رکھتی ہوگی اس کا درجہ بھی سب سے کم ہوگا۔

دنیا کی مہلت امتحان کے لیے ہے:

خیر میں دوسری طرف چلا گیا۔ میں کہہ رہا تھا کہ مالک الملک وہی ہیں۔ سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہے۔ "بِيَدِهِ الْمُلْكُ" اسی کے ہاتھ میں حکومت ہے۔ "وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" سب چیز پر قادر، ساری قدرت ان کو حاصل ہے۔ "اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ" وہ ذات جس نے موت پیدا کی اور جس نے زندگی پیدا کی۔ موت بھی انھیں کی مخلوق، زندگی بھی انھیں کی مخلوق۔ انسان ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا، زندگی لے کر آیا، حکم ہوا موت آ گئی۔ زندگی اور موت کے درمیان انسان کو گھیر دیا گیا ہے۔

لامحدود زندگی کسی کو نہیں ملی۔ اور یہ اس لیے کہ ” لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً “ تاکہ آزمایش ہو جائے کہ کون بہترین کام کرتا ہے۔

وقت متعین ہوتا ہے اور کم ہوتا ہے تو آدمی کوشش کرتا ہے، وقت کو غنیمت سمجھتا ہے کہ جلدی سے کوئی اچھا کام کرلے۔ جس کام کے لیے آیا ہے اسے پورا کرلے۔ اس کی ایک محسوس مثال میں بتاؤں۔ پہلے جب پانی کے جہاز چلا کرتے تھے تو بہت سے حاجی اس سے حج کے لیے جاتے تھے۔ پانی کے جہاز سے جانے میں بہت وقت ملتا تھا۔ تین چار مہینے قیام کا وقت ملتا تھا۔ ۱۹۸۹ء میں مَیں حج کے لیے گیا تھا تو اس سال پانی کے جہاز سے لوگ حج کے لیے گئے تھے۔ اس کے بعد سے یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ ہوائی جہاز سے جانے والوں کو وقت کم ملتا ہے یعنی کل چالیس دن۔ میں نے وہاں یہ فرق اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جو لوگ پانی کے جہاز سے آئے ہیں وہ مست ہیں، اِدھر اُدھر ٹہل رہے ہیں، بازاروں میں گھوم رہے ہیں، خریداری میں مصروف ہیں۔ حرم کی حاضری کی فکر کم ہوتی ہے، خریداری کی فکر زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ابھی وقت بہت ہے۔ اس چکر میں حرم کی حاضری کم کر دیتے ہیں اور بازاروں کی حاضری بڑھا دیتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں ہوائی جہاز سے جانے والوں کو وقت کم ملتا ہے تو ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ہر وقت حرم ہی میں رہیں۔ نہ ان کو سامان خریدنے کی فکر ہے اور نہ فرصت۔ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت حرم میں گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے پاس وقت کم ہے، اِدھر اُدھر ضایع کرنے کے بجائے جس کام کے لیے آئے ہیں، اسی میں لگے رہتے ہیں۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر ہم لوگ دعا کرتے تھے کہ ’یا اللہ! پانی کا جہاز بند کرا دیجیے۔ ہوائی جہاز سے آئیں گے، وقت کم رہے گا تو وقت کی قدر بھی رہے گی اور کم وقت میں زیادہ کام بھی ہوگا۔‘

اسی لیے جب نوجوان سے کہا جاتا ہے کہ ’ذرا ٹھکانے سے زندگی بسر کرو‘ تو وہ توجہ نہیں دیتا۔ کیوں کہ اس کی نگاہ میں وقت زیادہ ہوتا ہے، سوچتا ہے کہ بڑھاپے میں پابند ہو جائیں گے، ابھی رہنے دیں۔ یہی سوچتے سوچتے زندگی ختم ہو جاتی ہے اور توفیق

نہیں مل پاتی۔ اگر آدمی یہ سوچے کہ زندگی کم ہے، وقت تھوڑا ہے تو اسی کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی کوشش کرے گا۔

موت کا خوف:

بچپن میں ایک واقعہ پڑھا تھا، وہ یاد آرہا ہے۔ ایک بادشاہ تھا جو بہت موٹا ہو گیا تھا۔ اٹھنا بیٹھنا مشکل تھا۔ اطبا علاج کر کے تھک گئے تھے مگر کسی طرح دبلا نہیں ہو رہا تھا۔ ایک حکیم صاحب علاج کے لیے بلائے گئے۔ حکیم صاحب حاضر ہوئے تو انھوں نے بادشاہ سے کہا کہ ’میں صرف حکیم ہی نہیں ہوں بلکہ ایک اچھا نجومی بھی ہوں۔‘ بادشاہ نے کہا کہ ’ٹھیک ہے، حکمت اور نجوم دونوں کے اعتبار سے دیکھ کر بتاؤ کہ مجھے کیا ہوا ہے؟‘ اس نے دیکھنے کے بعد کہا کہ ’پہلے میں نے علم نجوم سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ آپ کی عمر اب صرف چالیس دن باقی ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اب موٹاپے کے علاج کا کوئی فایدہ نہیں؟‘ بادشاہ اپنی موت کی خبر سن کر اس پر بہت خفا ہوا، جیل میں ڈالنے کا حکم دیدیا۔ مگر بادشاہ کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اب چالیس دن زندہ رہنا ہے۔ اس لیے اس نے سوچا کہ اب حکومت کون کرے، اس میں تو صرف جھوٹ، فساد، قتل وغارت گری اور ظلم وزیادتی ہے۔ اس نے لڑکے کو بلا کر تخت پر بیٹھایا اور خود گوشہ نشین ہو کر عبادت میں لگ گیا۔ موت کے اندیشے اور خوف سے کھانا پینا چھوٹ گیا۔ ہر دن کے گزرنے کے ساتھ موت کا وقت قریب تر ہوتا گیا۔ بے چارہ دن رات یادِ الٰہی اور توبہ میں رہنے لگا کہ جب جانا ہی ہے تو معافی تلافی کر کے جائیں۔ کسی وقت کچھ کھٹک جاتا تو ملک الموت کا گمان ہوتا۔ چالیس دن گزر گئے، مگر مرا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا، پہچاننا مشکل ہو گیا کہ وہی ہے یا کوئی اور؟ چالیس دن کے بعد حکیم صاحب کی طلبی ہوئی کہ ’بلاؤ اس خبیث کو، سر قلم کر دو، اتنے دن ہمیں خوف کی حالت میں رکھا۔‘ حکیم صاحب حاضر کیے گئے تو انھوں نے دست بستہ عرض کی کہ ’بادشاہ سلامت! میں تو آپ کا علاج کر رہا تھا۔ آپ موٹاپے سے پریشان تھے دبلے نہیں ہو رہے تھے تو میں نے یہ علاج کیا

ہے۔ میں صرف حکیم ہوں، نجومی وجومی کچھ نہیں ہوں۔ یہ سب صرف آپ کے علاج کی تدبیر تھی۔‘

آدمی کو جب احساس ہوجاتا ہے کہ میری عمر زیادہ نہیں ہے تو وہ اپنے آپ کو درست کرلیتا ہے۔ ہم انسانوں کو موت اور زندگی کے درمیان پیدا کیا گیا تاکہ امتحان ہوسکے کہ کون اس فرصت کو غنیمت جان کر اپنے آپ کو اچھے عمل میں مشغول رکھتا اور کس نے برے کاموں میں اپنا وقت ضایع کیا۔

ہر چیز میں اچھائی مطلوب ہے:

دنیا والوں کو بھی اچھائی مطلوب ہے اور اللہ کو بھی۔ کسی سے بھی آپ پوچھ کر دیکھ لیجیے کہ ’آپ کو کیسا آدمی چاہیے؟‘ کوئی پاگل بھی نہیں ہوگا جو کہے کہ ’مجھے خراب آدمی چاہیے۔‘ ہر کوئی یہی کہے گا کہ مجھے اچھا آدمی چاہیے، اچھا کام کرنے والا چاہیے، اچھا سامان چاہیے۔ مثل مشہور ہے کہ ’آدمی بازار سے دو پیسے کی ہانڈی بھی خریدتا ہے تو ٹھونک بجا کر خریدتا ہے کہ چراغی تو نہیں ہے؟ گڑبڑ تو نہیں ہے؟‘ کوئی معمولی سے معمولی سامان ہو، آدمی اچھا ہی طلب کرتا ہے۔ بیڑی بھی آدمی پیتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ اچھی بیڑی ہو۔ اگر کسی نے کہہ دیا کہ میری بیڑی اچھی ہے تو بیڑی پینے والے اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

ریل میں آپ سفر کرتے ہیں تو وہاں دیکھتے ہوں گے، چائے بیچنے والے آتے ہیں اور سب اپنی چائے کی تعریف کرتے ہیں۔ ٹرین کی چائے اگرچہ کسی لایق نہیں ہوتی مگر اس کو اچھا ہی کہہ کر بیچتے ہیں۔ یہ اگرچہ جھوٹ کا کاروبار ہے مگر اپنی چائے کو کوئی خراب نہیں کہتا۔ اس لیے کہ مطلوب اچھائی ہے۔

ایک مرتبہ میں ٹرین پر سفر کررہا تھا تو ایک دلچسپ لطیفہ ہوا۔ ایک چائے بیچنے والا آیا اور اس نے الٹی بولی بولنی شروع کی کہ ’صاحب! سب سے خراب چائے لایا ہوں، اتنی خراب کہ آپ نے کبھی نہیں پی ہوگی۔‘ مسافر سمجھ گئے کہ یہ الٹی بولی بول رہا ہے۔ اس کی چائے خوب بکی خوب بکی۔ اور واقعتاً اس کی چائے بہت اچھی تھی، اتنی اچھی چائے کا

تصور ٹرین کے سفر میں نہیں ہے۔ اس کی چائے اچھی تھی اس لیے آناً فاناً ختم ہوگئی۔

سامان اگر اچھا ہوتا ہے تو سب اس کو پسند کرتے ہیں۔ اللہ کو بھی اچھا سامان پسند ہے۔ حضور ﷺ اپنے ایک صحابی حضرت معاذ ؓ کو نصیحت کرتے ہیں کہ 'اے معاذ! دیکھو ہر نماز کے بعد یہ دعا ضرور کرنا، اس دعا کو کبھی مت چھوڑنا'۔ "اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِكَ وَشُکْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ" (ابو داؤد) اے اللہ! آپ سے مدد چاہتا ہوں، میری مدد کیجیے اپنے ذکر پر کہ میں آپ کو یاد کرتا رہوں۔

انسان بہت ناشکرا واقع ہوا ہے:

اور میری مدد کیجیے اپنے شکر پر کہ آپ کی نعمتیں بے انتہا ہیں۔ مگر انسان بھی ناشکرا بے انتہا ہے۔ جس سے پوچھیے وہی درد سنائے گا کہ بہت پریشانی ہے۔ انسان کی زندگی میں پریشانیوں کے ساتھ اچھائیاں بھی بہت ہیں۔ آپ کو پریشانی صرف ایک یا دو معاملہ میں ہوگی، اس کے علاوہ ہزاروں ایسے معاملات اور چیزیں ہوں گی جس میں آپ مطمئن رہتے ہیں۔ انسان ان اطمینان بخش اور اچھی چیزوں کو بھول جاتا ہے اور صرف پریشانی کا رونا لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ اللہ فرماتے ہیں "وَقَلِیْلٌ مِنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ" (سورۃ سبا آیۃ ۱۳) میرے بندوں میں شکر کرنے والے بہت کم ہیں۔ کون ایسا ہے جس کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ 'دین کے معاملہ میں اپنے سے برتر آدمی کو دیکھو، اور دنیا کے معاملہ میں اپنے سے کم تر آدمی کو دیکھو۔ اس سے دین داری کا جذبہ بیدار ہوگا اور شکر کرنے کی عادت بنے گی۔' (مسلم)

حضرت سعدی فرماتے ہیں کہ 'ایک وقت میرے اوپر ایسا آیا کہ غریب الوطنی کی حالت میں غربت کا یہ عالم ہوا کہ میرے پاؤں میں جوتے نہیں تھے اور جیب میں اتنے پیسے نہیں تھے کہ جوتا خرید سکوں۔ اسی حالت میں مسجد میں پہنچا تو ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے پاؤں ہی نہیں ہے، یونہی گھسٹ کر چل رہا ہے۔ میں کہا 'یا اللہ! آپ کا بڑا شکر ہے، پروردگار! آپ کا بڑا احسان ہے کہ آج جوتا نہیں تو نہ سہی، کل خرید لوں گا مگر پاؤں تو ہیں'۔

آدمی اگر اپنے سے اوپر والے کو دیکھتا ہے تو حسرت پیدا ہوتی ہے اور شکر کا جذبہ سرد ہو جاتا ہے۔ فلاں کے پاس ایسی گاڑی ہے، میرے پاس نہیں ہے۔ فلاں کے پاس ایسا مکان ہے، میرے پاس نہیں ہے۔ اور اگر نیچے والے کو دیکھے تو اطمینان ہوتا ہے اور شکر کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ پھر وہ سوچتا ہے کہ جھونپڑا ہی سہی، کم از کم یہ تو مجھے ملا ہے، فلاں کے پاس تو وہ بھی نہیں ہے۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں" لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ" (سورة ابراهيم آية ٧) اگر تم شکر کرو گے تو ہم اور دیں گے۔ نعمتیں بڑھا دیں گے مصایب کم کر دیں گے۔

عبادت میں حسن پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے:

بہر کیف بات دوسری طرف چلی گئی۔ اس دعا کا تیسرا جملہ ہے "وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ" میری مدد کیجیے اس بات پر کہ میں آپ کی اچھی عبادت کروں۔ صرف اچھی عبادت نہیں بلکہ بہت اچھی عبادت ہونی چاہیے، انتہائی خوبصورت عبادت ہونی چاہیے۔ دنیا کے معاملات میں جب اچھے کی تلاش ہوتی ہے تو پھر عبادت میں کیوں نہیں؟ اللہ کو بھی وہی آدمی پسند آتا ہے جو اچھا اور خوبصورت عمل کرتا ہے۔ ایسا عمل جو ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے اچھا ہو، قاعدے اور ضابطے کے مطابق ہو۔

حضرت امام ابوحنیفہ کے استاذ تھے حضرت سیدنا عطا بن رباح۔ یہ تابعی تھے، حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے خاص شاگردوں میں سے ہیں۔ میں آپ کو ان کی شکل وصورت بھی بتا دوں۔ حبشہ کے رہنے والے تھے، بالکل سیاہ فام، موٹے موٹے ہونٹ اور جسمانی عیوب سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک آنکھ نہیں تھی، پاؤں سے لنگڑے تھے، ایک کان بھی غائب تھا۔ ان کے اندر کئی ایک جسمانی عیوب تھے۔ مگر ان کا مقام و مرتبہ کیا تھا! عالم یہ تھا کہ خانہ کعبہ کے پاس ان کی مجلس ہوتی تھی اور بادشاہ کی طرف سے حکم تھا کہ عطا بن رباح کے علاوہ کوئی مسئلہ نہ بتائے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ ’ہم لوگ عطا بن رباح کی مجلس میں بیٹھتے تھے تو ایسے کہ گویا کہ ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں کہ اگر

ہلیں گے تو وہ اُڑ جائیں گے۔' اتنے ادب سے بیٹھتے تھے۔ ظاہری عیوب میں شاید ہی کوئی ایسا عیب تھا جو ان میں نہ تھا مگر اس کے باوجود لوگوں کا حال یہ تھا کہ ان پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ ان کو دیکھنے کے لیے، ان کے پاس بیٹھنے کے لیے، ان سے فایدہ اٹھانے کے لیے۔ یہ اس لیے کہ اللہ نے اپنا علم اور اپنی شریعت کے مطابق ان کو عمل دیدیا تھا۔ یعنی ان کے پاس اچھا علم تھا اور اس کے ساتھ خوبصورت عمل اللہ کی طرف سے ودیعت ہوا تھا، جس نے سب کے نزدیک ان کو خوبصورت بنادیا تھا۔ بدصورت سے بدصورت آدمی خوبصورت ہوجاتا ہے اگر اس کا عمل اچھا ہو۔

اچھے عمل کا سب سے عمدہ نمونہ آپ ﷺ کی ذات اقدس ہے:

اللہ تعالی فرماتے ہیں "لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً"، تاکہ اللہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون بہتر ہے عمل کے اعتبار سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے لیے اللہ نے جو معیار مقرر کیا ہے، وہ عمل کی بہتری ہے۔ اور اس بہتر عمل کے لیے جو سب بڑا نمونہ ہے وہ جناب نبی کریم ﷺ کی ذاتِ مبارک ہے۔ آپ کی زندگی کا کوئی بھی لمحہ یا کوئی بھی موقع ایسا نہیں ہے جس میں اچھا اور خوبصورت عمل نہ ہو۔ اس لیے اللہ تعالی نے عام اعلان کردیا کہ "لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ" (سورۃ الاحزاب آیۃ ۲۱) تمھارے لیے اللہ کے رسول بہترین نمونہ ہیں۔

نمونہ کہتے ہیں اس بہتری اور خوبی کو جو بطور مثال پیش کی جائے، اور جس کو آدمی سامنے رکھ کر اپنا عمل اچھا بنائے۔ آپ ﷺ کی ذات بہترین نمونہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا جیسا اخلاق تھا ویسا ہی ہمارا بھی ہونا چاہیے، ان کا جیسا مزاج تھا ویسا ہی ہمارا بھی ہونا چاہیے، ان کی جیسی عبادت تھی ویسی ہی ہماری بھی ہونی چاہیے، لوگوں کے ساتھ ان کا جیسا برتاؤ تھا ویسے ہی ہمارا بھی ہونا چاہیے۔ تمام روایتیں اور تمام حدیثیں اس پر متفق ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا برتاؤ ہر ایک ساتھ نہایت اعلی درجہ کا تھا۔ آپ کا اخلاق، آپ کی محبت، آپ کا تعلق، آپ کی مہربانیاں سب اعلی درجہ کا تھا۔ کائنات انسانی کی

تاریخ گواہ ہے کہ کبھی کوئی شخص انگلی نہیں رکھ سکتا کہ یہاں آپ نے بداخلاقی کی ہے۔ دوریاں اخلاق کے بگاڑ ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ طور طریقہ درست نہیں ہوتا تو درمیان میں دشمنیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالی نے ترغیب دی اور حکم فرمایا ہے کہ ” قُلُ اِنُ کُنُتُمُ تُحِبُّوُنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوُنِیُ“ (سورۃ آل عمران آیۃ ۳۱) تم کہہ دو کہ اگر تم کو اللہ سے محبت ہے تو میری پیروی کرو۔

اللہ سے محبت انسان کی مجبوری ہے:

کائنات میں کون ایسا آدمی ہوگا جس کو اللہ سے تعلق نہ ہو، محبت نہ ہو۔ اللہ سے تعلق رکھنا ہر آدمی کی مجبوری ہے۔ کیوں کہ فریاد اسی سے کرنا ہے، لوٹ کر اسی کے پاس جانا ہے۔ آدمی جب بے بس اور مجبور ہوتا ہے تو صرف اسی کو پکارتا ہے۔ اللہ نے ہر دل میں اپنی محبت ڈال رکھی ہے۔ جب ہمارے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے پیدا کیا تھا تو اسی وقت ان کی ساری اولاد سے سوال ہوا تھا کہ ” اَلَسُتُ بِرَبِّکُمُ“ کیا میں تمھارا مالک، پروردگار اور پالنے والا نہیں ہوں؟ اس وقت ساری کائناتِ انسانی نے بیک زبان اقرار کیا تھا ” بَلٰی“ کیوں نہیں، آپ ہی پروردگار ہیں۔ اسی اقرار کا اثر آج تک ہے کہ کوئی بھی انسان نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اللہ سے تعلق نہیں ہے۔ اگر کسی نے وقتی جذبات کی وجہ سے ایسا کہہ بھی دیا تو آخر تک جاتے جاتے زندگی کے کسی نہ کسی مرحلہ میں جب اسے اپنی بے بسی اور لاچاری کا احساس ہوتا ہے تو وہ ضرور اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ انسان اللہ سے تعلق توڑ کر کہاں جائے گا؟ اگر بظاہر کچھ دنوں تک تعلق ٹوٹا ہوا نظر آئے تو وہ دن بھی ضرور آتا ہے جب اسے پریشانیاں اور مجبوریاں گھیرتی ہیں تو بھاگا بھاگا اللہ کی طرف آتا ہے اور فریاد کرتا ہے۔ اس لیے کہ سب کو معلوم ہے کہ جب سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں تو وہی صرف ایک ایسا بچتا ہے جو مدد کرتا ہے۔

اسم اعظم:

حضور ﷺ کی اولاد میں ایک بزرگ ہیں حضرت جعفر صادق جو حضرت حسین

رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں۔ حضرت علی زین العابدین ان کے لڑکے تھے۔ حضرت جعفر صادق بہت بڑے بزرگ اور امام ابوحنیفہ کے استاذ ہیں۔ ایک آدمی ان سے کہتا ہے کہ ’حضرت! مجھے اسم اعظم بتا دیجیے۔‘ اب تو اسم اعظم اَنہونی چیز ہوگئی، ورنہ پہلے لوگ اس کو سیکھنے کے لیے بڑی محنت کیا کرتے تھے۔ اسم اعظم اللہ کا وہ نام ہے جس کو لے کر اگر دعا کی جائے تو فوراً اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ یہ وہ دولت تھی کہ اگر کسی کو مل جاتی تو پھر اس کو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ جس چیز کی ضرورت ہوتی اللہ سے مانگ لیتا، وہ فوراً عطا ہو جاتی۔

ایک بزرگ کے پاس ایک آدمی گیا کہ ’مجھے اسم اعظم سکھا دیجیے۔‘ انھوں نے کہا کہ ’ایک سال میرے پاس رہو تو سکھاؤں گا۔‘ وہ آدمی سال بھر ان کے پاس رہا۔ سال گزرنے کے بعد بزرگ نے مٹی کی دو رکابی ایک کو دوسرے پر ڈھک کر دیا (رکابی کو ہماری زبان میں ’’پَرَئی‘‘ کہتے ہیں) اور کہا کہ ’ندی کے اس پار فلاں صاحب رہتے ہیں ان کو دے آؤ، اور ہاں اس کو کھول کر مت دیکھنا کہ اس میں کیا ہے؟‘ بس یہی کہنا غضب ہوگیا۔ ’’اَلْاِنْسَانُ حَرِیْصٌ لِمَا مُنِعَ‘‘ انسان کو جس چیز سے منع کر دیا جائے، اس کا وہ حریص ہو جاتا ہے۔ وہ لے کر چلے مگر بار بار دل میں خیال آ رہا تھا کہ آخر اس میں ہے کیا؟ منع کیا تھا اس لیے تھوڑی دیر تو صبر کیا، مگر پھر ’کیا ہے؟ کیا ہے؟‘ دماغ میں اتنا تکرار ہوا کہ کھول دیا، جیسے ہی کھولا ایک چوہیا اس میں سے پھدک کر بھاگ گی۔ اس نے دل میں سوچا کہ یہ بزرگ لوگ بھی کیا کیا تماشہ کرتے ہیں؟ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ چوہیا بند کر کے دیدی کہ فلاں کو دے آؤ۔ بہر حال اس نے پھر اسی طرح ڈھک دیا اور ندی پار ان صاحب کی خدمت میں پہنچا اور رکابی پیش کی۔ انھوں نے کھول کر دیکھا تو کچھ نہیں تھا۔ پوچھا کہ ’کس نے بھیجا ہے؟‘ بتایا کہ ’فلاں صاحب۔‘ کہا ’اسم اعظم سیکھنے آئے تھے؟‘ کہا ’ہاں‘۔ تب انھوں نے کہا کہ ’چوہیا کی تو حفاظت ہو نہیں سکی تم سے، اسم اعظم کی کیسے حفاظت کرو گے؟ اگر اسم اعظم تم کو سکھا دیا جائے تو کیا کرو گے؟ جیسے ہی کسی سے تکلیف

پہنچے گی فوراً بددعا کردو گے اور وہ بے چارہ برباد ہوجائے گا۔ اسم اعظم اس کو سکھایا جاتا ہے جو ہزارہا تکالیف برداشت کرلے مگر سامنے والے کو بددعا نہ دے۔ یہ ایسا تیر ہے جو ٹھیک نشانے پر بیٹھتا ہے۔ اس کے جاننے والوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ ہزاروں تکلیف سہہ جاتے ہیں مگر دوسروں کا برا کبھی نہیں چاہتے۔ اس کو سیکھنے کے لیے بہت بڑے جگر کی ضرورت ہوتی ہے۔'

ایک بزرگ کا واقعہ:

ایک صاحب ایک بزرگ کا واقعہ سنا رہے تھے کہ انھوں نے دیکھا کہ 'ایک بچھو پانی میں ڈوب رہا ہے۔ یہ بچانے کے لیے اس کو پکڑ کر نکالنے کی کوشش کی تو اس نے ڈنک مار دیا۔ انھوں نے چھوڑ دیا پھر وہ ڈوبنے لگا، پھر پکڑا نکالنے کے لیے مگر اس نے پھر ڈنک مار دیا۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا تو ایک شخص جو یہ دیکھ رہا تھا اس نے کہا کہ 'حضرت! کیوں اس کو بچانے کے درپے ہیں؟ چھوڑ دیجیے مرنے دیجیے۔ ڈنک مار مار کر کتنی آپ کو تکلیف دی ہے۔ چھوڑیے، ڈوبے مرے، آپ کی بلا سے۔' انھوں نے جو جواب دیا وہ قابلِ غور ہے۔ انھوں نے کہا کہ 'یہ برا ہو کر اپنی برائی نہیں چھوڑتا تو میں بھلا ہو کر اپنی بھلائی کیوں چھوڑوں؟ مجھے کیا ہے، میں تو اپنی بھلائی پر قایم رہوں گا۔'

اسم اعظم:

میں یہ بتا رہا تھا کہ حضرت جعفر صادق کے پاس ایک آدمی اسم اعظم سیکھنے کے لیے آیا۔ آپ نے اس سے کہا کہ ایک مہینے کے بعد آنا۔ اس کے جانے کے بعد آپ نے ایک ملاح کو بلا کر کہا کہ ایک کشتی تیار کرو، اس کی قیمت میں تم کو دوں گا۔ دریاے دجلہ کے کنارے رہنا، ہم دو آدمی اس میں بیٹھنے کے لیے آئیں گے۔ جب کشتی منجدھار میں پہنچے تو کوئی ایسی ترکیب کرنا کہ کشتی ڈوب جائے۔ کشتی پر سوار ہونے کے بعد ملاح نے ہدایت کے مطابق کشتی منجدھار میں ڈبو دی۔ حضرت جعفر اور ملاح تیر کر کنارے آگئے اور وہ ڈوبنے لگا۔ پہلے تو حضرت کو پکارتا رہا مگر جب ان سے مدد کی کوئی امید نہیں رہی تو اس

نے خدا کو پکارنا شروع کیا۔ پانی کی ایک لہر آئی اور اسے کنارے چھوڑ دیا اور وہ زندہ بچ گیا۔ جب تک اس کے حواس ٹھکانے ہوتے تب تک حضرت جعفر وہاں سے جا چکے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ آدمی ان کے پاس آیا اور لگا برا بھلا کہنے کہ آپ ایسے ہیں ویسے ہیں، مجھے تو ڈبو کر مار ہی دیا ہوتا، آپ کو اِتنا پکارا مگر ایک مرتبہ پلٹ کر دیکھا بھی نہیں۔ حضرت جعفر نے پوچھا کہ 'تم بچے کیسے؟' اس نے کہا 'کیسے بچتا، آپ کو بلا بلا کر عاجز آ گیا آپ نے کوئی توجہ نہیں دی اور ہر طرف سے رشتۂ امید ختم ہوگیا تو میں نے خدا کو پکارا۔ اس پاک نام کی برکت سے میری جان بچی اور ایک لہر نے مجھے منجدھار سے دھکیل کر کنارے تک پہنچا دیا۔' حضرت جعفر نے فرمایا کہ 'تم کو اسم اعظم سکھا دیا۔' وہ حیران ہوا کہ 'کیسے؟' فرمایا کہ 'اس وقت تمھارے دل کی جو کیفیت تھی کہ تمھیں یقین ہو چکا تھا کہ اللہ کے علاوہ کائنات کی کوئی چیز تمھیں نہیں بچا سکتی، جب یہ کیفیت تمھارے دل میں پیدا ہوئی تو تم نے اللہ کا نام لیا اور تم بچا لیے گئے۔ دل کی اس کیفیت کے ساتھ اللہ کا جو بھی پاک نام تم پکارو گے، وہی اسم اعظم ہوگا۔ اسم اعظم کوئی لفظ نہیں ہے بلکہ دل کی یہ کیفیت خدا کے ہر نام کو اسم اعظم بنا دیتی ہے۔ اگر مستقل طور سے تمھارے دل میں یہ خیال جم جائے کہ اللہ کے علاوہ میرا کوئی حامی و ناصر نہیں ہے تو سمجھ لو کہ تم کو اسم اعظم حاصل ہو گیا۔'

بزرگانِ دین کا یہی حال ہوتا ہے، وہ ساری کائنات کو دیکھتے ہیں مگر انھیں یقین ہوتا ہے کہ کائنات کے کسی ذرے میں کوئی طاقت نہیں ہے، جو بھی ہے اور جو کچھ بھی ہوگا وہ اللہ ہی کے کرنے سے اور اسی کے حکم سے ہوگا۔ اگر مدد آئے گی تو اسی کی طرف سے اور اگر کوئی ضرر پہنچے گا تو اسی کے حکم سے۔ اللہ والے محنت کر کے اپنے قلب کا یہ حال بنا لیتے ہیں، اس کے بعد وہ مطمئن ہو جاتے ہیں۔

اچھا ہونے کا معیار صرف ایک ہے:

بہرحال آدمی کو اچھا ہونا چاہیے، ہر اعتبار سے اچھا۔ جب آدمی اتنا اچھا ہوتا ہے تو اللہ کو بھی اچھا لگنے لگتا ہے۔ اور اچھا ہونے کا معیار جناب نبی کریم ﷺ ہیں۔ جو عمل ان

کے عمل کے مطابق ہوگیا، وہ اچھا ہے، جو آدمی ان کے مطابق ہوگیا، وہ اچھا ہے، جس کا اخلاق ان کے اخلاق کے مطابق ہوگیا، وہ اچھا ہے، جس کے احوال ان کے احوال کے مطابق ہوگئے، وہ اچھا ہے۔ معیار وہی ہیں، کوئی دوسرا نہیں ہے۔ صحابہ کرام اس معیار پر پورے اترے تو وہ بھی معیار بن گئے۔

میں یہی بتا رہا تھا کہ اچھا ہونا سب کو منظور ہے، سب چاہتے ہیں کہ اچھا ہوجاؤں، مگر اچھا ہونے کا معیار لوگوں نے بدل دیا ہے۔ آپ مت بدلیے، آپ کے لیے معیار وہی ہونا چاہیے۔ جب بھی کوئی معاملہ ہو تو پہلے آپ پوچھ لیجیے کہ حضور اکرم ﷺ نے اس معاملہ میں کیا کیا ہے؟ یا آپ کی اس سلسلہ میں تعلیم کیا ہے؟ اگر آپ نے اس کا اہتمام کرلیا تو پھر آپ اچھے ہیں، اب آپ کو کبھی کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ لیکن اگر آپ ان سے منحرف ہوجائیں گے، ان کے طریقے سے ہٹ جائیں گے تو پھر نقصان ہی نقصان ہے۔

ایک آدمی وہ ہے جو تکلیف اٹھا کر بھی صبر کرتا ہے، برداشت کرتا ہے، لوگوں کو دعائیں دیتا ہے تو آپ بھی کہتے ہیں کہ بہت اچھا آدمی ہے۔ ایک آدمی وہ ہے جو بات بات میں گالی دینے لگتا ہے، تو اسے سارے لوگ کہتے ہیں کہ بہت خراب آدمی ہے۔ حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ ”ثَلَاثُ مَنْ کُنَّ فِیْہ کَانَ مُنَافِقاً خَالِصاً“ خالص منافق کی تین علامت ہے، جس میں تینوں میں سے ایک بھی پائی جائے وہ منافق ہے۔ ایک ”اِذَا خَاصَمَ فَجَرَ“ جب جھگڑا ہو تو گالی دینے لگے۔ ”وَاِذَا عَاھَدَ غَدَرَ“ کسی سے معاہدہ ہو تو دھوکہ دیدے۔ کسی سے بات کیا، اس کو اطمینان دلایا کہ ہاں میں یہ کام کردوں گا مگر نہیں کیا، تو ایسا آدمی منافق ہے۔ ”وَاِذَا حَدَّثَ کَذَبَ“ بات کرے تو جھوٹ بولے۔ (صحیح مسلم)

بڑے سے بڑا جھوٹا آدمی جب کسی کو جھوٹ بولتے دیکھتا ہے تو کہہ دیتا ہے کہ ’بڑا غلط کام کررہے ہو کہ جھوٹ بول رہے ہو‘ حالاں کہ وہ آدمی خود بھی جھوٹ بولتا

ہے۔ مگر غلط آدمی بھی غلط کام کو غلط کہنے کے لیے تیار ہے، یہ الگ بات ہے کہ اپنے غلط کو غلط نہ کہے، دوسرے کے غلط کو غلط کہے۔

میرے دوستو! اچھے بنو اور اچھا بننے کا جو معیار ہے، اسے اختیار کرو۔ اگر یہ کرلیا تو دنیا کی کوئی شکایت نہیں رہ جائے گی۔ دیکھیے حضور اکرم ﷺ اچھے تھے، دنیا نے کتنا ستایا تھا مگر آپ بتائیے کہ جو دعا میں نے نقل کی ہے، جو رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے حضور پیش کی تھی، اس میں لوگوں کی شکایت تھی؟ دعا کے کسی جز میں یہ بات ہے کہ میں لوگوں کی شکایت کرتا ہوں۔ آپ ﷺ نے لوگوں کی شکایت کرنے کے بجائے اپنی کمزوری کی شکایت کی۔ کیوں کہ ان کو یقین تھا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ جو آدمی اچھا ہوگا وہ ہمیشہ اپنی اچھائی پر رہے گا۔ برا اگر اس کے ساتھ برائی کرے گا تو بھی یہ اس کے ساتھ اچھائی کرے گا، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے طایف والوں کے ساتھ کیا۔ بدلہ لینے کی قوت تھی مگر آپ نے ان کے ساتھ اچھائی کی اور معاف کر دیا۔

زبان کو اچھا رکھیے:

شروع میں جو میں نے کہا تھا کہ 'ایک بات کہنا چاہتا ہوں' وہ یہی تھی کہ اچھے بنیے، اللہ آپ کو اچھا دیکھنا چاہتا ہے۔' آپ کا اخلاق اچھا رہے، آپ کی زبان اچھی رہے۔ انسان کے جسم میں بہت سے اعضا ہیں ہاتھ پیر زبان وغیرہ۔ ہاتھ پیر چلانے کے لیے سوچنا پڑتا ہے مگر زبان چلانے کے لیے انسان کو کچھ نہیں سوچنا پڑتا۔ جس کو چاہا جب چاہا برا بھلا کہہ دیا۔ ہاتھ پیر کی چوٹ اتنی سخت نہیں ہوتی جتنی زبان کی ہوتی ہے۔ مگر آدمی اس کو چلانے میں بے تکلف ہوتا ہے۔ زبان درازی انتہائی غلط بات ہے۔ اخلاق و معاملات کا تعلق دیگر اعضا سے کم، زبان سے زیادہ ہے۔ اس لیے سب سے زیادہ اسی میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ حضور اکرم ﷺ حضرت معاذ ﷺ کو نصیحت کر رہے تھے، بہت سی باتیں بتلانے کے بعد آپ نے فرمایا کہ " اَلَا اُخبِرُكَ بِمَلَاكِ ذَالِكَ كُلِّهِ" جتنے اچھے اعمال میں نے تم کو بتائے ہیں، کیا ان میں سب سے گُر کی بات نہ بتا دوں؟ 'یا رسول

اللہ! ضرور بتائیں۔‘ تو آپ ﷺ نے اپنی زبان کو ہاتھ سے پکڑا اور فرمایا ” كُفَّ عَلَيْكَ هٰذَا “ اسے اپنے قابو میں رکھو۔ یعنی زبان سے کوئی بری بات نہ کہو، زبان کو غلط مت استعمال کرو۔ یہ سب سے زیادہ گر کی بات ہے۔ (رواہ الترمذی)

سب سے زیادہ انسان کی زبان ہی استعمال ہوتی ہے اور غلط استعمال ہوتی ہے، اس کو درست کر لینا چاہیے۔ آدمی کی بول اچھی ہو تو بہت اچھا آدمی ہے اور اگر بول خراب ہو تو بہت خراب آدمی ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ’ایک موقع سے مجھ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ’دیکھو! فرشتے کیا بات کر رہے ہیں؟‘ میں نے کہا ’پروردگار! وہ درجات کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں کہ دنیا و آخرت میں کن چیزوں کی وجہ سے انسان کے درجات بلند ہوتے ہیں۔‘ کہا بتاؤ ’وہ کیا چیز ہیں؟‘ درجہ بلند کرنے والی پہلی چیز جس کے بارے میں فرشتے بات کر رہے تھے وہ ” لِيْنُ الْكَلَامِ “ یعنی کلام اور زبان کی نرمی ہے۔ زبان کی نرمی سب سے اہم ہے۔ کوئی کتنا ہی اچھا کام کر لے اگر زبان غلط ہو گئی تو سارا کام غلط ہو جائے گا۔

ایک شخص کا عجیب واقعہ:

ہمارے ایک بزرگ تھے، وہ کہتے تھے کہ ایک صاحب بہت مہمان نواز تھے۔ ان کو مہمان کی خاطر داری اور مدارات کا خاص ذوق تھا۔ جب کوئی آدمی ان کے یہاں مہمان بن کر پہنچ جاتا تو بہت خوش ہوتے اور خوب خدمت کرتے، خوب کھلاتے پلاتے۔ مگر ایک بڑا عیب یہ تھا کہ جب مہمان رخصت ہونے لگتا تو کہتے کہ ’بھائی! آپ آئے، مجھے بہت اچھا لگا، بہت خوشی ہوئی مگر اب آئندہ مت آیئے گا۔‘ ساری مہمانی کر کرائی، ساری خدمت بیکار محض ان کے اس ایک جملے سے۔ ان کی یہ عادت بہت مشہور تھی، اس لیے لوگ ان کے پاس جانے سے کتراتے تھے۔ ایک صاحب نے ہمت کی اور کہا کہ میں ان کے پاس جاؤں گا اور ان سے پوچھوں گا کہ آپ ایسا کیوں کہتے ہیں؟ وہ پہنچے، معمول کے مطابق خوب خاطر داری ہوئی۔ جب رخصت ہونے لگے تو جی میں سوچا کہ ابھی کہیں

گے کہ آئندہ مت آیئے گا تو میں پوچھوں گا کہ کیوں نہ آؤں؟ مگر معاملہ الٹا ہوگیا، جب جانے لگے تو ان صاحب نے خلاف توقع ان سے کہا کہ ’بہت اچھا آپ تشریف لائے، بہت خوشی ہوئی، آئندہ بھی آتے رہیے گا۔‘ ان کی زبان سے یہ بات سنی تو رک گئے اور کہا کہ ’آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔‘ ’ہاں پوچھیے۔‘ کہا کہ ’میں نے سنا ہے کہ آپ مہمان کو رخصت کرتے وقت کہتے ہیں کہ ’آئندہ مت آیئے گا‘، مگر آج آپ مجھ سے الٹی بات کہہ رہے ہیں۔ آخر بات کیا ہے، جو آپ سب سے یہ کہتے ہیں؟‘ تو انھوں نے بتایا کہ ’بھائی! بات دراصل یہ ہے کہ مجھے مہمانوں کی خدمت کا بڑا شوق ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مہمان کی ہر خدمت کروں، مگر جب مہمان آتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ یہاں بیٹھیے، تو تکلف کرتے ہیں اور انکار کردیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ کھائیے، تو تکلف میں انکار کردیتے ہیں۔ غرض میں جو خدمت کرنا چاہتا ہوں وہ تکلف میں انکار کردیتے ہیں اور یہ بات مجھے گراں گزرتی ہے، پسند نہیں آتی، اس لیے جاتے جاتے کہہ دیتا ہوں کہ آئندہ مت آیئے گا۔ اس لیے کہ آپ کے آنے سے فایدہ کیا؟ آپ واحد ایسے آدمی ہیں کہ آپ کی جو خدمت میں نے کرنی چاہی ہے، آپ نے کرنے دی ہے، انکار نہیں کیا ہے۔ اس لیے مجھے آپ سے بہت خوشی حاصل ہوئی ہے، آپ پھر آیئے گا۔

خیر میں نے قصہ تو یوں ہی سنا دیا۔ اصل مجھے یہ کہنا تھا کہ اتنی خدمت اور مہمان نوازی کے بعد وہ آدمی صرف ایک جملہ کہتا تھا کہ ’آئندہ مت آیئے گا۔‘ تو اس کی ساری خدمت و مہمان نوازی بیکار ہو جاتی تھی۔ زبان کی تھوڑی سی حرکت سے سارا کیا کرایا بیکار ہو جاتا ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں ”كُفَّ عَلَيْكَ هٰذَا (لِسَان)“ زبان کو تھامو، اس کو قابو میں رکھو۔ صحابی نے پوچھا کہ ’یا رسول اللہ! کیا زبان کی وجہ سے آدمی گڑبڑ ہو جائے گا؟‘ فرمایا ”ثَكِلَتْكَ اُمُّكَ يَا مُعَاذُ! وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِى النَّارِ عَلٰى وُجُوهِهِمْ اَوْ عَلٰى مَنَاخِرِهِم اِلَّا حَصَائِدُ اَلْسِنَتِهِمْ“ (رواہ الترمذی) تمھاری ماں تم پر روئے اے معاذ! لوگ اپنی زبانوں کی بڑبڑ ہی کی وجہ سے تو اوندھے منھ یا نتھوں کے بل جہنم میں

ڈالے جائیں گے۔

زبان چلانا سب سے زیادہ آسان ہے مگر سب سے زیادہ اسی کے بارے میں محتاط رہنا چاہیے۔ آج دنیا کا زیادہ تر فساد زبان کی وجہ سے ہے۔ کسی نے کچھ کہہ دیا، اُدھر سے کسی نے بیان دیدیا اِدھر سے کسی نے اس کے خلاف بیان دیدیا۔ اخبار نے چھاپ دیا، ریڈیو نے نشر کردیا، ٹیلی ویژن والوں نے مکالمہ بازی شروع کردی۔ معلوم ہوا کہ کسی ایک صاحب کی بیان بازی یعنی زبان کی غلط حرکت کی وجہ سے پوری دنیا ہل رہی ہے، کہرام مچا ہوا ہے، فسادات ہورہے ہیں۔ اگر آدمی سوچ سمجھ کر ذمہ داری کے ساتھ بولے تو یہ سب نہ ہو۔

پیغمبر ﷺ نے بتایا کہ زبان کو ٹھیک کرلو۔ اگر زبان ٹھیک ہوگئی تو آدمی خوبصورت ہوگیا۔ جس کی زبان نرم ہوتی ہے ہر آدمی اس کے پاس بیٹھنا چاہتا ہے، اس سے گفتگو کرنا چاہتا ہے، کیوں کہ وہ اچھا آدمی ہے، اس کا عمل خوبصورت ہے۔

دوستو! اچھا بنیے اور اچھا بننے کی کنجی یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی پیروی کیجیے۔ زبان اور قلب دونوں کی حفاظت بہت ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے حفاظت کی تاکید کی ہے، اس کو اختیار کیجیے۔ آج دنیا میں برائی کی کثرت ہے، بھلائی کم ہوگئی ہے۔ بھلائی بڑھایئے، اچھائی پھیلایئے۔ آپ کی زبان میٹھی ہوجائے، آپ کا عمل اچھا ہوجائے تو پھر دیکھیے یہ دنیا خود بخود جنت بننے لگے گی۔

اللہ تعالی ہم سب کو توفیق عطا فرمائیں۔

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمين

❑❑❑

اول و آخر سہارا اللہ ہی کی ذات ہے

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُه وَنَسْتَعِیْنُه وَنَسْتَغْفِرُه وَنُوْمِنُ بِه وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْه وَ نَعُوْذُ بِاللّٰه مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَه وَ مَنْ یُّضْلِلْه فَلَا هَادِیَ لَه۔ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَه لَا شَرِیْكَ لَه وَنَشْهَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مَحَمّداً عَبْدُه وَرَسُوْلُه اَرْسَلَه بِالْحَقِّ بَشِیْراً وَنَذِیْراً۔ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَیْه وَعَلٰى آلِه وَاَصْحَابِه وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً كَثِیْراً كَثِیْراً۔ اَمَّا بَعْدُ:

اعوذ بالله من الشيطان الرجيم۔ بسم الله الرحمان الرحيم

فَاِذَا رَكِبُوْا فِیْ الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَاهُمْ یُشْرِكُوْنَ (٦٥) لِیَكْفُرُوْا بِمَا اٰتَیْنَاهُمْ وَلِیَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ (٦٦) [سوره عنكبوت]

جب وہ لوگ سوار ہوتے ہیں کشتی پر تو اللہ کو پکارتے ہیں اس کے لیے دین کو خالص کر کے۔ پھر جب ہم بچالاتے ہیں ان کو خشکی کی جانب تو وہ شرک کرنے لگتے ہیں۔ ہماری دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کر لیں اور مزے اڑا لیں، وہ وقت دور نہیں جب انھیں سب پتہ چل جائے گا۔

سہارا صرف اللہ کی ذات ہے:

یہ کفار کا حال ہے اور کفار کا کیا؟ عام طور پر انسانوں کا حال کچھ اسی طرح کا ہے جس کو یہاں اللہ تعالی نے بیان کیا ہے۔ اور یہی ایک جگہ نہیں ہے متعدد جگہوں میں یہ

بات اللہ تعالی نے فرمائی ہے۔ وہ یہ کہ جب انسان بے سہارا ہوتا ہے، تمام سہارے اس کے ٹوٹ جاتے ہیں، اضطرار کی حالت میں ہوتا ہے کہ اب اسے دکھائی دینے لگتا ہے کہ مخلوقات میں سے کوئی اس کی مدد کرنے والا نہیں ہے۔ مشرکین پہلے تو مدد حاصل کرنے کے لیے اپنے آس پاس کے لوگوں دیکھتے ہیں، جب ان سے کام چلنے والا نہیں ہوتا ہے تو اپنے بتوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جن کی وہ پوجا کرتے ہیں، جب ان سے بھی آس ٹوٹ جاتی ہے، ان کا بھی سہارا ختم ہو جاتا ہے تو پھر ٹوٹ کر پکارتے ہیں اللہ تعالی کو۔ اس وقت پھر کوئی چیز ان کو یاد نہیں رہتی، کچھ دھیان نہیں رہتا، نہ کسی معبود کا خیال رہتا ہے اور نہ کسی اور کا خیال رہتا ہے۔ اور اس کا سب سے عجیب منظر سمندر میں ہوتا ہے کہ آدمی سمندر میں جہاز پر چل رہا ہے، کہیں خشکی نہیں ہے، کہیں کوئی مدد کرنے والا نہیں، طغیانی آجاتی ہے، جہاز ہچکولے لینے لگتا ہے، اب ڈوبا تب ڈوبا کی کیفیت آتی ہے تو ایسے موقع پر جب تمام سہارے ٹوٹ جاتے ہیں، تمام امیدیں ختم ہو جاتی ہیں، تب ایک ہی امید باقی رہ جاتی ہے۔ اس وقت دل سے یقین کرتے ہیں کہ وہی ایک ذات بچانے والی ہے جس کو آخر میں ہم نے یاد کیا۔ اس کو پہلے ہی کیوں نہیں یاد کر لیا۔ وہی اول بھی ہے اور وہی آخر بھی ہے، بیچ کی سب چیزیں تو مخلوق ہیں، اللہ کی محتاج ہیں، اس لایق نہیں کہ ان سے مدد مانگی جائے۔ کوئی اس لایق نہیں کہ اس کے سامنے ہاتھ پھیلایا جائے۔

عربوں میں کچھ نہ کچھ سمندری سفر کا رواج تھا، اس لیے وہ اس کو جانتے تھے۔ جو لوگ سمندر میں عام طور سے سفر کرنے والے ہیں انھیں اس کے بارے میں خوب معلوم ہے۔ ہم لوگوں کو تو سمندر کا سفر نصیب ہوا نہیں، کبھی کبھی ہوائی جہاز پر یہ کیفیت ہو جاتی ہے، اگر خدانخواستہ کوئی بات ہو جائے تو وہاں کوئی مدد کرنے والا نہیں ہے، کچھ ہو گیا تو آدمی نیچے چلا آئے گا۔ کبھی دریا میں بھی ایسی صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔

ہم لوگ غازی پور میں تھے، دریاے گنگا خوب بڑھا ہوا تھا، اس کا پاٹ دو میل کا ہو گیا تھا۔ بڑی طغیانی تھی، کلکٹر کی طرف سے ممانعت ہو گئی تھی کہ نہ کشتی چلے گی نہ اسٹیمر

چلے گا۔ اِدھر سے اُدھر جانا خطرناک تھا۔ غیر قانونی طور سے کچھ کشتیاں چل رہی تھیں۔ ہم لوگوں کو غازی پور سے زمانیہ جانا تھا۔ ساتھ میں حضرت مولانا ضمیر احمد صاحب جلال پوری بھی تھے۔ گھاٹ پر گئے کہ شاید کوئی کشتی مل جائے۔ دور سے معلوم ہوا کشتی آرہی ہے۔ جب قریب آئی تو بیٹھ گئے، ہوا پرسکون تھی، طغیانی نہیں تھی، کشتی پر بیٹھ گئے۔ میرے ہاتھ میں کتاب تھی حضرت سید احمد شہید علیہ الرحمہ کی سوانح حضرت علی میاں ندوی کی لکھی ہوئی۔ میں مولانا جلال پوری صاحب کو کتاب سنانے لگا، کشتی آگے بڑھ رہی تھی، کچھ دیر کے بعد طغیانی شروع ہوگئی، ہوا تیز ہوگئی۔ میں کتاب سنانے میں مشغول تھا اور مولانا سننے میں۔ ہمیں کچھ زیادہ خیال نہیں ہوا، تھوڑی دیر کے بعد کشتی میں شور ہوا، غیر مسلموں کی تعداد زیادہ تھی، ہم دو چار ہی تھے۔ آواز آرہی تھی 'ہائے گنگا میّا بچائیو! ہائے گنگا میّا بچائیو!' ہنگامہ شروع ہوگیا مگر طغیانی ہے کہ بڑھتی ہی جارہی ہے، گنگا میا شباب پر آتی جارہی ہیں، جب آخری حد ہوگئی اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ کشتی اب ڈوبی تب ڈوبی، تب سب بھول گئے، کسی نے گنگا میا کو نہیں پکارا، سب 'ہے بھگوان! ہے ایشور!' ان کی زبان میں جو اللہ کا لفظ تھا اسی کو پکارنے لگے۔ میں نے مولانا سے کہا کہ 'دیکھیے قرآن کی آیت یہاں صادق آرہی ہے۔ اس وقت کوئی کسی کو یاد نہیں کررہا ہے، سب اللہ ہی کو یاد کررہے ہیں، اپنی اپنی زبان میں یاد کررہے ہیں۔' دیکھ رہے ہیں خطرہ سامنے ہے، موت کھڑی ہے، اب اگر کوئی بچانے والا ہے تو وہ اللہ ہی ہے۔ نہ کوئی میا نہ کوئی بابا، کوئی نہیں بچا سکتا ہے صرف ایک ذات بچا سکتی ہے۔

خیر بڑی زوروں کی پکار پڑی، کچھ دیر کے بعد طوفان تھم گیا، طغیانی کم ہوگئی اور کشتی کنارے کے قریب پہنچ گئی تو کوئی کہتا ہے 'گنگا میانے بچالیا۔' ''اِذَاهُمْ يُشْرِكُوْنَ'' ابھی تو اللہ کو یاد کررہے تھے، ابھی شرک کرنے لگے۔ گنگا میا تو خود اپنے اختیار میں نہیں، اس کو ہوا نے ہلا کر رکھ دیا تھا، وہ کیا بچاتی؟ مگر یہی ہے جب مصیبت پڑے تو اللہ کو پکارا اور جب اللہ نے اس مصیبت کو دور کردیا تو شرک کرنے لگے کہ ارے فلاں نے بچالیا۔

کس نے بچایا؟ بچایا تو اللہ نے ہے مگر انسان کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ ” فَاِذَا رَکِبُوْا فِی الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ “ جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو پکارنے لگتے ہیں اللہ کو خالص اسی پر اعتقاد رکھ کر۔ پھر کوئی اور چیز ان کے ذہن میں نہیں رہتی، کوئی اور بات ان کے دل میں نہیں رہتی، سب طرف سے یکسو ہو کر انسان اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ ” فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَی الْبَرِّ “ پھر جب اللہ ان کو بچالاتے ہیں خشکی کی جانب ” اِذَاهُمْ یُشْرِكُوْنَ “ اس وقت شرک کرنے لگتے ہیں۔ جب کشتی کنارے پر آئی شرک شروع ہو گیا۔

عام انسانوں کا حال یہی ہے، جب مصیبت آتی ہے تو آدمی اللہ کو یاد کرتا ہے اور جب چلی جاتی ہے تو پھر بھول جاتا ہے۔ وہ تو بڑا مسئلہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے مسائل میں جب انسان اضطراری کیفیت میں گرفتار ہوتا ہے، جب دیکھتا ہے کہ کوئی سہارا اس کا نہیں ہے تب سمجھتا ہے کہ اللہ ہی اس کو دور کر سکتے ہیں۔ اور جب اللہ نے اس کو نجات دیدی تب وہ کچھ اور سوچنے لگتا ہے۔

ایک ظریفانہ واقعہ:

اس پر مجھے ایک ظریفانہ واقعہ یاد آیا۔ ایک مرتبہ آسمان سے بڑے بڑے پتھر برسے۔ غازی پور ضلع میں اتنا بڑا پتھر گرا کہ اس کو دوسرے دن کلکٹر کے پاس لے گئے تو ۱۸؍کلو کا تھا۔ رات میں مغرب کے بعد پڑا تھا اور کلکٹر کے پاس دس بجے دن میں اس کو تولا گیا تو ۱۸؍کلو کا تھا، بہت سا گل گیا تھا۔ ایک شرابی آدمی کھیت میں استنجا کر رہا تھا، جب پتھر پڑنا شروع ہوا تو اس نے سمجھا کہ مجھی پر پتھراؤ کیا جا رہا ہے، تو کہنے لگا کہ 'یا اللہ! اب نہیں پیوں گا، یہ آخری ہے۔ یا اللہ! بچا لیجیے اب نہ پیوں گا۔' پھر اللہ نے بچا لیا تو اس نے نہیں پیا۔ بعد کے بارے میں نہیں معلوم مگر اس وقت اس نے چھوڑ دیا تھا۔ اس نے سمجھا کہ یہاں کوئی بچانے والا ہے نہیں، بڑے بڑے پتھر گر رہے ہیں، اب تو مرنا ہے ہی تو کہنے لگا کہ 'بس اب نہ پیوں گا۔' بہر حال ایسے مواقع پر انسان پریشان ہوتا ہے، تنگ ہوتا

ہے تو اللہ کو یاد کرتا ہے۔

شاہ وصی اللہ صاحب کی کرامت:

ہمارے حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ بمبئی میں تھے۔ ایک صاحب بمبئی میں بہت زبردست دہریے تھے کہ کسی طرح اللہ کو ماننے کو تیار نہیں۔ ان کے لڑکوں میں کوئی کویت ہے کوئی جرمن ہے تو کوئی کہیں۔ وہ تھے مسلمان اور دارالعلوم میں کچھ دنوں پڑھا بھی تھا لیکن مولوی نہیں تھے، بس تھوڑے ہی دن پڑھا تھا۔ اللہ جانے کیا سنک سوار ہوگئی کہ دہریے ہوگئے۔ ان کا ایک پوتا تھا جو ان کو بہت عزیز تھا، اس کے جسم میں کہیں اندر پھوڑا نکل آیا۔ ڈاکٹروں کے یہاں اس کا بہت علاج ومعالجہ کیا مگر کچھ فایدہ ہوتا نظر نہیں آیا۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ 'آپریشن کرنا پڑے گا مگر آپریشن خطرناک ہے، پتہ نہیں بچہ بچے یا نہیں؟' کسی نے ان سے کہا کہ 'فلاں جگہ مولانا صاحب ہیں، ان سے دعا کرا لیجیے۔' ان صاحب نے کہا کہ 'اجی ہٹاؤ! ان کی دعا سے کیا ہوگا؟' وہ اصرار کرتے رہے اور یہ انکار کرتے رہے۔ مگر بہر حال پوتے کی جان عزیز تھی، کچھ کرنا چاہیے تو وہ دعا کرانے پہنچ گئے۔ پوتے کی حالت بیان کی۔ مولانا پانی پر دم کرکے دیدیا۔ اس کو لے جا کر پلایا اور دو تین کے بعد پھر ڈاکٹر کے پاس ایکسرے کے لیے لے گئے، تاکہ آپریشن کیا جا سکے۔ ایکسرے کیا تو پھوڑا غائب! کچھ تھا ہی نہیں، کوئی مرض اندر موجود تھا ہی نہیں۔ کیا ہوا؟ پہلے والا ایکسرے دیکھا گیا تو اس میں پھوڑا تھا۔ ڈاکٹر نے پوچھا کہ 'آپ نے کوئی علاج کیا ہے؟' جواب دیا کہ 'نہیں صاحب! ہم نے کوئی علاج نہیں کیا۔' 'کوئی دوا کھلائی؟' 'نہیں، آپ لوگوں کی دوا کے علاوہ کوئی دوا نہیں دی۔' پھر انھوں نے بتایا کہ 'ایک مولوی صاحب ہیں، لوگوں نے ہم کو انھیں کے پاس بھیج دیا تھا، وہاں گئے تو انھوں نے دعا کردی تھی اور پانی پر دم کرکے دیا تھا، وہی ہم نے پلایا تھا۔' ڈاکٹروں نے کہا کہ 'بس یہی بات ہے ورنہ سوال ہی نہیں ہوتا اتنی جلد پھوڑا ٹھیک ہوجائے۔' پھر سارے ڈاکٹر مولانا کے یہاں پہنچے اور ان سے دعا وغیرہ لی۔ ان صاحب کو اس کے بعد

ہدایت مل گئی، اب مان گئے، کیوں کہ کوئی صورت نہیں تھی کہ بچہ بچتا۔ پانی پر دم کر کے دیدیا اور اس نے پی لیا اور ٹھیک ہوگیا۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی طاقت ہے۔ پھر وہ دوبارہ مولانا کے پاس آئے، مولانا نے ان سے معانقہ کیا اور کئی مرتبہ کیا۔ اس کے بعد وہ بہت نیک ہو گئے اللہ والے ہو گئے، بہت اچھی موت مرے۔ ہمیشہ تلاوت کیا کرتے تھے ذکر کیا کرتے تھے۔

یہ ہے کہ آدمی جب مجبور ہو جاتا ہے تو اللہ کے پاس جاتا ہے۔ کتنا ہی بنتا بگڑتا رہے لیکن ایک وقت آجاتا ہے، ایک اضطرار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اس وقت خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اضطرار کی حالت میں کوئی بھی ہو، مسلمان ہونا شرط نہیں، غیر مسلم جو اللہ کو نہیں مانتا ہے، وہ بھی اس وقت اللہ کے پاس پہنچتا ہے اور اللہ سے دعا کرتا ہے تو اللہ اس کی دعا قبول کرتے ہیں۔

صحت و مرض سب اللہ کی طرف سے ہے:

اللہ کی مہربانیاں ہوتی ہیں۔ آدمی بڑا سرکش ہوتا ہے، بڑا باغی ہوتا ہے، مصیبت پڑتی ہے تو مان لیتا ہے اور ہٹ جاتی ہے تو انکار کرنے لگتا ہے۔ اچھا آدمی وہ ہے جو مصیبت پڑنے سے پہلے بھی مانے اور مصیبت پڑنے کے بعد تو ماننا ہے ہی اسے۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں ”اِذَاھُمْ یُشْرِکُوْنَ لِیَکْفُرُوْا بِمَا اٰتَیْنَاھُمْ“ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ ہم نے جو کچھ دیا ہے اس کا انکار کرتے ہیں کہ نہیں اللہ نے نہیں کسی اور نے دیا ہے۔ کسی اور کی طرف منسوب کرنے لگتے ہیں۔ اولاد اللہ تعالی دیتا ہے مگر کہتے ہیں کہ فلاں سے ملی ہے، صحت اللہ تعالی دیتے ہیں مگر کہتا ہے کہ فلاں سے حاصل ہوئی ہے۔ کوئی صحت دینے والا نہیں، کسی کی طرف سے مرض نہیں آتا، کسی کی طرف سے انسان کو کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی، جو کچھ ملتا ہے اللہ کی طرف سے ملتا ہے۔ بندوں کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔ ہمارے زمانے میں یہ شرک بہت بڑھا ہوا ہے، مسلمانوں کے اندر بڑھا ہوا ہے۔ بیماری ہے، تکلیف ہے، آزار ہے، آدمی علاج کرتے کرتے تھکتا ہے تو کہتا ہے کہ معلوم

ہوتا ہے کہ کسی نے کچھ کردیا ہے۔ ’’کچھ کردیا‘‘ ایک اصطلاح ہے یعنی جادو کردیا ہے۔ وہ یہ نہیں محسوس کرتا ہے کہ ہماری کسی غلطی کی وجہ سے یا اللہ نے براہ راست کسی مصلحت کی وجہ سے ہم پر کوئی بیماری بھیج دی ہے۔ وہ کسی اور کی طرف منسوب کرتا ہے۔ جس طرح صحت کو کسی اور کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا اسی طرح بیماریوں کو بھی کسی کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔ سحر برحق ہے، ہوتا ہے مگر کسی کو کیا معلوم؟ ہمارے پاس قطعی علم نہیں ہے۔ اور آدمی دوسرے کی طرف منسوب کرکے اپنے آپ کو گناہگار کرتا ہے اور شرک میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

سحر اور جادو سے روزی نہیں روکی جاسکتی:

ایک مرتبہ مدرسہ میں میرے پاس اعظم گڑھ شہر کے ایک صاحب آئے اور کہنے لگے کہ ’فلاں صاحب نے میرے اوپر جادو کردیا ہے، میرا سارا کاروبار فیل ہوگیا ہے، چنیں ہوگیا ہے چناں ہوگیا ہے۔‘ میں نے ان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ’نہیں بھائی! سحر سے یہ سب نہیں ہوتا، روزی پر سحر نہیں ہوتا۔ اللہ نے کچھ چیزوں کو سحر سے محفوظ رکھا ہے، اس میں سے روزی اور موت بھی ہے کہ ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہ اللہ کی مصلحت ہوتی ہے، باقی آدمی سحر کی وجہ سے بیمار پڑسکتا ہے، جیسے کسی نے طمانچہ ماردیا تو تکلیف ہوجاتی ہے۔ سحر کردیا تکلیف ہوگئی، لیکن کسی کی روزی جو اللہ دینے والا ہے، اسے کوئی روک نہیں سکتا۔‘ ’’اَللّٰھُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ‘‘ اے اللہ! جس کو آپ دیں اسے کوئی روک نہیں سکتا، کتنا ہی بڑا جادوگر ہو، روک نہیں سکتا۔ اور اگر نہ دینا چاہیں تو کوئی دے نہیں سکتا۔ میں نے سمجھانے کی کوشش کی مگر لوگوں کا مزاج ایسا بن گیا ہے کہ اس طرح کی باتیں سمجھایئے تو سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ خوب میں نے تجربہ کیا ہے، اگر کوئی شخص آیا اور کسی نے بتادیا کہ ’صاحب! آپ کے اوپر جن ہے۔‘ تو فوراً یقین کرلے گا کہ ’ہاں بالکل صحیح ہے۔ مولانا کو بہت آتا ہے، بہت اچھا جانتے ہیں۔‘ اور اگر بتادیا کہ ’تم پر کچھ نہیں ہے۔‘ تو کہیں گے کہ ’ان کو تو کچھ آتا ہی نہیں۔‘ یہ خود تجربہ مجھے ہوا ہے۔ اس دنیا

میں (تعویذ کی دنیا میں) میں بھی مبتلا ہوں۔

کچھ لوگ میرے پاس ایک معاملہ اسی سلسلہ کا لے کر آئے۔ میں نے سب کو دیکھا اور کہا کہ 'کچھ نہیں ہے۔' تو کہتے ہیں کہ 'ان کو تو کچھ آتا ہی نہیں'۔ میں نے کہا 'اچھی بات ہے، اگر یہی مان لیں تو میری جان چھوٹ جائے۔' میں نے سمجھانے کی کوشش کی کہ 'کچھ نہیں ہے' مگر وہ لوگ نہیں مانے لیکن چلے گئے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد آئے کہ 'صاحب! کچھ دیدیجیے بہت حالت خراب ہے۔' میں نے کہا کہ 'تعویذ لے جاؤ، دعا لے جاؤ مگر یہ سحر وغیرہ کچھ نہیں ہے۔' دوچار مہینے کے بعد پھر انھیں میں سے ایک صاحب آئے اور کہا کہ 'مولانا صاحب! تعویذ دیدیجیے، میرا لڑکا جیل میں چلا گیا، وہ چھوٹ جائے۔' میں نے پوچھا کہ 'کیوں چلا گیا ہے؟ کیا بات تھی؟' کہا کہ 'بات یہ ہے کہ وہ آدمی جو ہم پر جادو کر رہا تھا، اس کو میرے لڑکے نے گولی ماردی ہے۔' میں تو دنگ ہوگیا کہ معلوم نہیں اس نے کچھ کیا تھا یا نہیں؟ اور اس کو گولی ماردی۔ میں نے بہت زور سے اس کو ڈانٹا اور ڈانٹ کر کہا کہ 'نکل جاؤ، تمھارا لڑکا زندگی بھر جیل میں سڑتا رہے اور تم بھی سڑو۔' خیر وہ کمرے سے نکلا اور اصرار کرتا رہا کہ میری بات سن لیجیے مگر میں نے کہہ دیا کہ مجھے تمھاری کوئی بات نہیں سننی ہے۔ پھر وہ چلا گیا اور کبھی نہیں آیا۔ اللہ جانے اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ حال انسانوں کا ہوگیا ہے۔

پوچھنا بھی غلط اور بتانا بھی غلط:

یہ جس کا ذکر میں کر رہا ہوں یہ غیر مسلم نہیں بلکہ مسلمان تھا۔ اس طرح کی حرکتیں کرتے ہیں۔ آدمی یہ نہیں سوچتا کہ جو ہو رہا ہے اللہ کی طرف سے ہے۔ بلکہ فلاں نے کردیا ہے۔ اب اس کی جان کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، اس کے دشمن ہو جاتے ہیں بغیر کسی دلیل کے۔ اور ان عاملوں نے اور تماشہ کر رکھا ہے۔ وہ بتا دیتے ہیں کہ 'فلاں نے کیا ہے۔' یہ پوچھنا بھی غلط ہے اور بتانا بھی غلط ہے۔ مجھ سے کوئی پوچھتا ہے تو میں کہہ دیتا ہوں کہ 'نہ تمھارا پوچھنا جائز ہے اور نہ میرا بتانا جائز ہے۔' بتانا ناجائز کا کیا مطلب؟ ہمیں

معلوم ہی نہیں تو کیا بتائیں؟ جو بتاتا ہے جھوٹ بولتا ہے۔

انسان کی ضعیف الاعتقادی کا حال:

مگر انسانوں کی ضعیف الاعتقادیوں اور توہم پرستیوں کا یہ حال ہے کہ ’ایک صاحب کا لڑکا گم ہو گیا، انھوں نے مجھ سے کہا ’بتا دیجیے کہ کہاں ہے؟‘ میں نے کہا ’مجھے کیا معلوم ہے کہاں ہے؟‘ انھوں نے اصرار کرنا شروع کر دیا تو میں نے سختی سے انکار کیا۔ رونے لگے اور باہر جا کر کہا کہ ’مولانا کو معلوم ہے مگر بتاتے نہیں ہیں۔‘ میں نے کہا غلط کہتے ہیں ’مجھے کوئی علم نہیں ہے، یہ غیب کا علم صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ میرے پاس تحقیقات کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔‘ اس کے بعد ایک دن آئے تو بہت رو رہے تھے۔ میں نے کہا خیریت؟ تو معلوم ہوا کہ کسی عامل کے پاس پہنچ گئے تھے۔ اس نے کہا کہ رات بھر عمل کروں گا اس کے بعد بتلاؤں گا۔ صبح میں ان عامل صاحب نے بتایا کہ ’لڑکا مر گیا ہے۔ وہ میرے عمل میں نہیں آتا ہے، اس کی پرچھائیں آتی ہے، اس کا مطلب ہے کہ وہ مر گیا ہے۔‘ موت کی خبر سن کر وہ اور ان کے گھر والے سب پریشان تھے اور رو رہے تھے۔ ایک منٹ کے لیے آنسو نہیں رک رہا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ ’وہ عامل جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کو کیا پتا؟ کوئی کیا جانے؟ نہ میں جانتا ہوں نہ وہ جانتا ہے۔ جس نے کہا کہ مر گیا ہے وہ جھوٹ بول رہا ہے۔‘ میں نے پوری قوت سے کہہ دیا کہ جھوٹ بول رہا ہے تو ان کے آنسو تھمے۔ اور باہر جا کر کہنے لگے کہ ’میں کہہ رہا تھا کہ مولانا کو معلوم ہے۔ مولانا کہہ رہے ہیں کہ میرا بیٹا زندہ ہے۔‘ حالاں کہ میں یہ بھی کہہ رہا تھا کہ ’مجھے نہیں معلوم۔‘ لیکن ’نہیں معلوم‘ کہنا بالکل بے کار رہو گیا۔ اب ان کو یقین ہو گیا ہے کہ مولانا کو معلوم ہے تبھی تو کہہ رہے ہیں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ جا کر انھوں گھر والوں سے کہا کہ تم لوگ اطمینان رکھو، مولانا کہہ رہیں کہ ’وہ عامل جھوٹا ہے۔‘ خیر اتنا ہوا کہ سب کے آنسو تھم گئے اور دو چار مہینے کے بعد وہ لڑکا مل گیا۔ بات تو صحیح ہو گئی کہ ’وہ جھوٹ بول رہا ہے۔‘ لیکن یہ کہ میں جانتا ہوں یا کوئی جانتا ہے، یہ بالکل غلط ہے۔ مگر انسانوں کے نفس کی اور شیطان

کی شعبدہ کاریوں کا یہ حال ہے کہ علی الاعلان میں کہہ رہا ہوں کہ ’نہیں معلوم ہے‘، مگر وہ کہہ رہا ہے کہ معلوم ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک فرقہ کے لوگوں نے خدا کہا۔ ایک آدمی مصر ہے اسی بات پر کہ آپ خدا ہیں۔ یہ بات ان کے سامنے کہہ رہا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو بہت سمجھایا مگر وہ مان کے نہیں دیا۔ حضرت علی نے کہا کہ ’یہ مانے گا نہیں، اتنا زبردست فتنہ کر رہا ہے، اس کو آگ میں ڈال دو۔‘ جب آگ جلائی گئی اور اس کو ڈالا جانے لگا تو اس نے کہا کہ ’اب تو مجھے اور یقین ہوگیا ہے کہ آپ ہی اللہ ہیں۔ اس لیے کہ آگ کا عذاب اللہ ہی دے سکتا ہے، کوئی دوسرا نہیں دے سکتا۔‘ اب حضرت کیا کریں؟ ایک چیز سوچی تھی اس کو اس نے الٹ دیا۔ یہ انسانوں کی توہم پرستیاں ہیں، ضعیف الاعتقادیاں ہیں۔ کسی کو اگر کوئی پریشانی لاحق ہوگئی ہے تو بجائے اس کے کہ کسی نے کچھ کر دیا ہے، یہ سوچنا چاہیے کہ اللہ نے ہماری بداعمالیوں کی وجہ سے ہم پر یہ مصیبت ڈالی ہے۔ توبہ کریں، استغفار کریں، اللہ پر یقین رکھیں۔ اللہ پر یقین رکھنے سے وہ چیز ختم ہو جائے گی۔

میرے یہاں ایک صاحب آئے اور کہا کہ ’مولانا! بیکری ڈالی ہے اور آگ جلاتے ہیں، مگر بھٹی گرم نہیں ہوتی۔ آگ بہت جلائی جاتی ہے، لکڑیاں بہت لگتی ہے مگر بھٹی گرم ہی نہیں ہوتی۔‘ میں نے کہا کہ ’اللہ کا حکم ہے کہ آگ جلے مگر گرمی پیدا نہ کرے۔‘ کہنے لگے کہ ’کسی نے سحر کر دیا ہے۔‘ مگر سچ یہ ہے کہ کون سحر کرے گا؟ اللہ میاں کے سامنے کون کرسکتا ہے؟ وہی کہہ دیتے ہیں کہ مت جلنا۔ کوئی گناہ ہو رہا ہوگا، کوئی معصیت ہو رہی ہوگی، اس لیے نہیں جل رہی ہے۔ جل رہی ہے مگر گرم نہیں ہو رہی ہے۔ اس کا بس ایک ہی علاج ہے کہ توبہ و استغفار کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ نہ کہ اس طرح کا شرک بکو کہ کسی نے کچھ کر دیا ہے۔ یہ سب شرک ہے گویا اللہ تعالی کچھ نہیں کرتے، سب یہ لوگ کرتے ہیں۔ سحر برحق ہے، ہوتا ہے مگر یہ کیا بات ہوئی ساری مشکلات اسی کی طرف منسوب کر دی جائے۔ آدمی خود اپنے اعمال کو نہ دیکھے، جیسے ہی کچھ ہوا کہنا شروع کر دیا کہ کسی نے کچھ

کر دیا ہے۔

تکلیفیں انسان کی بداعمالی کی وجہ سے آتی ہیں:

آگ کا تذکرہ چل رہا ہے تو مجھے ایک اور واقعہ یاد آیا۔ میں مدرسہ میں بیٹھا تھا کہ میرے ایک بزرگ پورا قافلہ لے کر آ گئے۔ مجھ سے بڑے تھے۔ میں نے پوچھا کہ ’خیریت تو؟ کیا بات ہے؟‘ کہا کہ ’یہ صاحب آئے ہیں، ان کی داستان سنیے۔‘ انھوں نے اپنی داستان سنائی کہ ’گھر میں آگ لگتی ہے بغیر کسی ظاہری سبب کے، نہ کوئی آگ، نہ کوئی ماچس مگر آگ لگتی ہے۔ کبھی چارپائی میں آگ لگتی ہے، کبھی کپڑوں میں، کبھی گٹھری میں، کبھی چھت پر۔ از خود جلنے لگتی ہے، پھر بجھا دیا جاتا ہے۔ طبیعت عاجز آ گئی ہے۔‘ اب ایسے وقت میں آدمی کیا کرتا ہے، جھاڑ پھونک والوں کے پاس دوڑتا ہے۔ بہت سے جھاڑ پھونک والوں کے پاس گئے مگر کچھ نہیں ہوا۔ کسی صاحب نے میرا پتہ بتا دیا تو میرے پاس آ گئے۔ بہت دور سے آئے تھے۔ مجھ سے کہا تو میں نے کہا کہ ’میں کچھ جانتا نہیں مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس گھر میں کوئی معصیت ہوتی ہے، کوئی گناہ ہوتا ہے، اس کی وجہ سے آگ لگتی ہے۔‘ کہنے لگے ’ہاں ایک گناہ ضرور ہوتا ہے، وہ یہ کہ گھر کا جو سربراہ ہے وہ شرابی ہے، بہت شراب پیتا ہے، بوڑھا ہو گیا ہے مگر پیتا بہت ہے۔‘ میں نے سوچا کہ شراب تو اُم الخبائث ہے، اللہ جانے پینے کے بعد کیا برائی وجود میں آتی ہوگی؟ میں نے کہا کہ ’بھائی! انھیں توبہ کرانے کی ضرورت ہے۔‘ وہ بوڑھا ساتھ میں آیا نہیں تھا۔ میں نے کہا کہ ’گھر پہنچنے کا انتظار نہ کیجیے، یہیں سے ٹیلی فون کر کے کہہ دیجیے کہ توبہ کر لیں ورنہ آگ بڑھتی رہے گی۔‘ مگر وہ لوگ مصر رہے کہ تعویذ دیجیے۔ اعتقاد اتنا بگڑا ہوا ہے کہ اپنے گناہوں کی طرف دھیان نہیں جاتا، تعویذ دیجیے۔ میں نے ایک تعویذ تسلی کے لیے دیدی مگر تاکید کر دی کہ ’توبہ ضروری ہے، اس کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔‘ ابھی وہ لوگ گھر نہیں پہنچے تھے، راستے ہی میں تھے کہ اطلاع ملی ادھر چار پانچ گھنٹے سے آگ نہیں لگی ہے۔ دوسرے دن نو بجے صبح مجھے فون کر کے بتلایا کہ صرف ایک مرتبہ بہت تھوڑی سی آگ لگی تھی، اس کے بعد

پھر کبھی آگ نہیں لگی۔ اس لیے کہ اس بوڑھے نے توبہ کر لی تھی اور بہت سچی اور پکی توبہ کی تھی۔ پھر وہ بوڑھا میرے پاس آنے جانے لگا، پانچوں وقت کا نمازی ہو گیا اور پھر کبھی شراب کے قریب نہیں گیا۔

وہ آگ کہاں سے لگ رہی تھی؟ کوئی نہیں جانتا۔ میں بتانا یہ چاہ رہا تھا کہ یہ سب خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ وہ قادر مطلق ہے جہاں چاہے آگ پیدا کر دے اور جہاں چاہے آگ کی گرمی ختم کر دے۔ اس طرح کی جب افتاد آئے تو انسان کو خدا کی طرف دوڑنا چاہیے نہ کہ بندوں کی طرف اور جھاڑ پھونک والوں کی طرف۔

ایک گاؤں میں مسجد بن رہی تھی، مسجد کا ایک پڑوسی تھا جو مسجد کی بڑی مخالفت کر رہا تھا، بالکل بننے نہیں دے رہا تھا۔ مدتوں پڑی رہی، نہیں بن سکی صرف اس کی مخالفت کی وجہ سے۔ خیر کسی طرح محنت کر کے مسجد تو بن گئی مگر وہ باغی ہی رہا، مسجد میں نماز پڑھنے نہیں آتا تھا۔ نماز پڑھتا تھا مگر مسجد میں نہیں آتا تھا۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ اس کے گھر میں کپڑا کٹنے لگا۔ کوئی کپڑا کہیں رکھا رہتا، وہ کٹ جاتا۔ ایسے وقت میں آدمی جھاڑ پھونک والوں کے پاس دوڑنا شروع کرتا ہے۔ اس نے بھی بھاگ دوڑ شروع کی۔ نیپال تک گیا، وہاں کوئی عامل صاحب تھے مگر بات بنی نہیں، کپڑے کا کٹنا رُکا نہیں بلکہ ترقی ہو گئی اور کٹنے کے ساتھ جلنے بھی لگا۔ بکس میں کپڑا رکھا ہے، جل گیا، چارپائی جل گئی۔ ایسے مواقع پر مجھے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں نے میرے پاس جانے مشورہ دیا لیکن چوں کہ وہ مسجد کا مخالف تھا اور میں اس کو منع کر چکا تھا اور سمجھا چکا تھا مگر مانا نہیں تھا۔ اور پھر وہ یہ سمجھتا تھا کہ میں بھی مسجد کی پارٹی کا ہوں، اس لیے میرے پاس آنے کی ہمت نہیں کی۔ مگر جب زیادہ آگ لگنے لگی تو کہلوایا کہ ’مولانا سے کہہ دو کہ آ کر دیکھ لیں، بہت عاجز آ گیا ہوں۔‘ جن سے کہلوایا تھا ان سے میں نے کہا کہ ’اس سے جا کر کہہ دیجیے کہ مسجد کی مخالفت سے توبہ کر لے۔ مسجد اللہ کا گھر ہے، اس کے بننے میں مخالفت کی اور اب بننے کے بعد بغاوت کر رہے ہو، جب تک توبہ نہیں کرو گے، آگ بڑھتی رہے گی۔‘ ایک مرتبہ کہلوایا

تو نہیں سنا پھر کہلوایا تو خیر اس نے توبہ کر لی اور نماز پڑھنے مسجد میں آنے لگا اور اس کے ساتھ ہی اس کے گھر کی آگ بھی بند ہو گئی۔

اول سہارا بھی اللہ آخر بھی وہی:

اللہ کے حکم کے بغیر نہ کوئی آگ جل سکتی ہے اور نہ جلا سکتی ہے، نہ کوئی پانی سیراب کر سکتا ہے اور نہ کوئی پانی نفع پہنچا سکتا ہے۔ یہی پانی اللہ کا حکم ہوتا ہے تو منھ زور طوفان ہو جاتا ہے اور لوگوں کو غرق کر دیتا ہے۔ یہی آگ اللہ کا حکم ہوتا تو پھیل کر جنگلوں کو جلا دیتی ہے اور یہی آگ دیگ کے نیچے جلتی ہے تو بہترین کھانا پک جاتا ہے، عمدہ سے عمدہ کھانا تیار ہو جاتا ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اول سہارا بھی اللہ ہی ہے اور آخری سہارا بھی اللہ ہی ہے۔ جن چیزوں کو ہم سہارا بنا کر استعمال کرتے ہیں ان کو بھی انتظار رہے اللہ کے حکم کا۔ ہم نے پانی کو سہارا بنایا اپنی پیاس بجھانے کے لیے، ہم نے کھانا کو سہارا بنایا بھوک مٹانے کے لیے، ہم نے دوا کو سہارا بنایا صحت حاصل کرنے کے لیے، مگر یہ سب اللہ کے حکم کے انتظار میں ہیں۔ اگر حکم ہو گیا تو سہارا دیں گے، اور نہیں تو کھانا کھاتے رہیے، پانی پیتے رہیے، آگ جلاتے رہیے، جو چاہے کرتے رہیے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ بھی نہیں کہ اول نمبر پر سہارا یہ ہے، ثانی پر یہ، ثالث پر یہ۔ اول سہارا بھی اللہ، آخر بھی وہی۔ انھیں کی مرضی ہوتی ہے جادو جادو ہوتا ہے۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں "وَمَا هُمْ بِضَارِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ" (سورة البقرة آية ۱۰۲) کوئی جادوگر کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا مگر اللہ کی اجازت سے۔ پھونکنے والے پھونکتے پھانکتے رہیں، جادو کرنے والا جادو کرتا رہے، اگر اُن کی اجازت نہیں تو کچھ نہیں ہوگا۔

میرے پاس ایک جادوگر آیا، کہنے لگا کہ ‘آپ کون سا عمل کرتے ہیں؟’ میں نے کہا کہ ‘میں کوئی عمل نہیں کرتا۔’ اس نے کہا کہ ‘میں نے آپ کے اوپر بہت جادو کرنے کی کوشش کی مگر آپ کے اوپر چلا نہیں۔’ وہ کس قسم کا جادو تھا آپ کو بھی بتا دوں۔ یہ دنیا عجیب و غریب ہے۔ دو لڑکے تھے ان دونوں کا خیال تھا کہ میں بہت بڑا عامل ہوں اور

بہت سی عملیات جانتا ہوں، حالاں کہ غلط ہے، نہ میں عامل ہوں اور نہ عملیات جانتا ہوں۔ ہاں عالم ہوں اور کوشش کرتا ہوں باعمل ہونے کی۔ باقی عملیات اور جھاڑ پھونک، تو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ چوں کہ میں تعویذ لکھتا ہوں، اس لیے وہ دونوں سمجھتے تھے کہ میں عامل ہوں اور میرے پاس آتے تھے کہ یہ بتا دیجیے وہ بتا دیجیے۔ میں کہتا کہ مجھے نہیں معلوم۔ وہ دونوں عامل تھے اور کہیں پڑھ رکھا تھا کہ 'اگر کوئی شخص اپنے دل کی بات اور عملیات نہ بتاتا ہو تو اس پر چالیس دن کا چلہ پڑھا جائے، چلہ پڑھ کر جو چاہیں اس سے معلوم کر سکتے ہیں۔' ان دونوں نے چالیس دن مجھ پر سحر کیا اور چلہ پڑھا اور چاہا کہ مجھ سے کچھ حاصل کریں اور مجھے کچھ خبر نہیں۔ جب وہ روحانی طور سے چلے ہیں تو دیکھا کہ پانچ میل دور ایک آدمی کھڑا ہے، اس نے ان کو روک دیا اور کہا 'تم وہاں تک نہیں جا سکتے، اور دیکھ لو وہاں بھی دو آدمی کھڑے ہیں۔' ان لوگوں نے بتایا کہ 'ہم نے دیکھا کہ آپ کے پاس دو آدمی سات رنگ کی لاٹھی لیے وردی پہنے کھڑے ہیں۔' اس کا مطلب ہے کہ آپ عامل ہیں اور عمل کی وجہ سے آپ کی حفاظت کی جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ میں عامل نہیں ہوں اور یہ حفاظت اللہ کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالی چاہتے ہیں تو حفاظت ہو جاتی ہے اور جب ان کی حفاظت اٹھ جائے گی تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ سارا کام ادھر سے ہے۔ " وَمَاهُمْ بِضَارِّيْنَ بِهِ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰه "(سورة البقرة آیة۱۰۲) اور کوئی جادوگر اپنے جادو کے ذریعہ نقصان نہیں پہنچا سکتا مگر اللہ کی اجازت سے۔

حضرت شاہ وصی اللہ صاحب الہ آباد میں تشریف فرما تھے۔ شب برات کے موقع پر وہاں بکثرت پٹاخے پھوڑے جاتے ہیں۔ حضرت گھر سے مسجد جانے کے لیے نکلے۔ باہر پٹاخے والوں کا ہجوم تھا، ایک آدمی نے پٹاخہ غالبًا اس کو چھچھوندر کہا جاتا ہے حضرت کی جانب چھوڑا۔ یہ ایسا پٹاخہ ہوتا ہے جو سیدھے اس شخص کی جانب لپکتا ہے جس کا نشانہ لے کر پھینکا جائے۔ وہ حضرت کے سینے کی جانب لپکا، آپ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا، جس طرف اشارہ کیا تھا فوراً اسی سمت مڑ گیا۔ چوں کہ حضرت اللہ سے مانگنے

والے لوگوں میں سے تھے۔ اس لیے جس طرف اشارہ کیا اللہ نے اسی طرف موڑ دیا، تیر آتا ہوگا وہ بھی مڑ جائے گا۔

اللہ بغیر اسباب کے بھی جو چاہے کر دے:

جو کچھ ہوتا ہے اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس یقین کو اس درجہ پختہ کر لیجیے کہ دل کسی اور طرف متوجہ ہی نہ ہو، اور کسی کی طرف سے نفع ونقصان کا تصور ہی باقی نہ رہے۔ جو کچھ ہوتا ہے خدائے وحدہ لاشریک لہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ وہ چاہیں تو اسبابِ راحت میں مصیبت پیدا کر دیں اور اسبابِ مصیبت میں راحت ڈال دیں۔ انسان بہت ضرورت مند ہے مگر کس کا؟ ان اسباب کا؟ نہیں، بلکہ اللہ تبارک وتعالی کا محتاج ہے۔ اللہ جس طرح چاہتے ہیں اس کے کام کو پورا کر دیتے ہیں۔

سیدنا ابراہیم خواص ایک مرتبہ فرماتے ہیں کہ ‘مجھ پر فاقہ شروع ہوا، میں نے دعا کی کہ ‘اے اللہ! فاقہ سے پریشان ہوں، بھوک کی وجہ سے جان جا رہی ہے، کھانا دیجیے۔’ غیب سے آواز آئی کہ ‘تم کھانا چاہتے ہو یا طاقت چاہتے ہو؟’ ابراہیم خواص فرماتے ہیں کہ ‘میں نے سوچا کہ کھانے کا مقصود تو طاقت کا حصول ہی ہے، کھانا اسی لیے کھایا جاتا ہے کہ آدمی جیے، طاقت ور رہے۔’ میں نے پروردگار سے کہا کہ ‘کھانا مطلوب نہیں ہے، طاقت ہی چاہیے۔’ فرمایا ٹھیک ہے۔ وہ فرماتے ہیں ‘۸۰؍ دن تک میرے منھ میں ایک دانہ بھی نہیں گیا اور ایک قطرہ پانی بھی نہیں گیا اور میں چلتا پھرتا رہا، نہ کہیں کمزوری محسوس ہوئی نہ بے چارگی محسوس ہوئی۔’ لیجیے صاحب! کھانا ہٹا دیا اس کے بعد بھی طاقت موجود ہے۔ یہ حکمِ الٰہی ہے جو اسباب کا پابند نہیں ہے۔

حضرت ابو ہریرہ ؓ کو رسول اللہ ﷺ نے تھوڑی سی کھجور دی اور فرمایا کہ ‘اس کو رکھ لو، کھاتے رہو کھلاتے رہو مگر کبھی کھول کر مت دیکھنا۔’ وہ بھی کمال کے تھے، انھوں نے تھیلی پشت پر باندھ لی، تاکہ اس کو دیکھ نہ سکیں اور ہاتھ اس میں پہنچ جائے۔ اور اسی میں سے نکال نکال کر کھلاتے رہے۔ یہ سلسلہ ایک دو سال نہیں تقریباً ۲۵۔۲۷؍ سال چلتا رہا،

نہ وہ کم ہوتی تھی اور نہ ختم ہوتی تھی، حالاں کہ کھجور اتنی ہی تھی کہ ایک دو مرتبہ نکالتے اور ختم ہو جاتی۔ مگر وہ حکمِ الٰہی تھا جو ختم نہیں ہونے دے رہا تھا۔ لوگوں کے یہاں کھجور درخت پر پیدا ہوتی ہے، ان کے یہاں اسی تھیلی میں پیدا ہو رہی ہے۔ جہاں حکمِ الٰہی ہو وہاں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔

ابھی میری مدینہ طیبہ حاضری ہوئی تھی، وہاں سے مجھے کھجوریں لینی تھیں۔ مجھے اس بات کا اہتمام رہتا ہے کھجوریں خاص مدینہ کی لوں، باہر کی کھجوریں بہت آتی ہیں مگر میں اس کو نہیں لیتا۔ بلکہ کھجور لینے کے لیے میں باغ میں جاتا ہوں۔ ایک واقف کار بزرگ کو لے کر میں باغ جارہا تھا تو کہنے لگے کہ 'مدینہ کی کھجوروں کے لیے حضور ﷺ نے دعا فرمائی ہے۔' کھجور سعودیہ عربیہ کا قومی درخت ہے، ایک درخت پر اوسطاً ۳۵۔۴۰؍ کلو کھجور آتی ہے، مگر مدینہ کی کھجور پر جو پھل آتا ہے وہ ۳۵۔۴۰؍ کلو نہیں، ایک سو چالیس کلو پھل آتا ہے۔' وہ دعا جو حضور ﷺ نے کردی تھی اب اللہ کا حکم بن کر آرہی ہے۔ اللہ کا حکم ہوتا ہے کہ اس میں زیادہ پھل ہو، اس میں زیادہ پھل ہوتا ہے۔

حضرت جابر ؓ نے حضور ﷺ سے شکایت کی کہ 'میں بہت مقروض ہوگیا ہوں اور قرض ادا کرنے کا میرے پاس سامان نہیں ہے، کھجوریں تیار ہونے والی ہیں مگر اتنی نہیں ہیں کہ میں ان سے قرض ادا کرسکوں۔ یہودی تنگ کررہے ہیں، آپ ان سے سفارش کردیجیے۔' آپ ﷺ نے فرمایا کہ 'نہیں، ہم تمھارے باغ میں آتے ہیں۔' آپ ﷺ ان کے باغ میں تشریف لے گئے، چند درختوں کے پاس کھڑے ہوئے اور پھر چلے گئے۔ سیدنا ابوبکر صدیق ؓ فرماتے ہیں کہ 'جابر! دیکھ لینا جن جن درختوں کے پاس کھڑے ہوئے ہیں، ان میں کتنا پھل آتا ہے۔' درخت وہی ہے مگر پیغمبر ﷺ اس کے پاس کھڑے ہوگئے تو اب اللہ کا حکم اس پر آئے گا۔ جب کھجوریں تیار ہوگئیں تو آپ نے فرمایا کہ 'ابھی کسی کو کچھ دینا مت۔ ساری کھجوریں توڑ کر رکھ لو اور سب کو کپڑے سے ڈھک دو۔ جتنی قسم کی کھجوریں ہیں ہر قسم کا الگ الگ ڈھیر بنانا پھر ہم کو اطلاع کرنا۔'

کھجوریں توڑی گئیں اور ڈھیر بنا کر آپ ﷺ کو اطلاع دی گئی تو آپ فوراً باغ میں تشریف لائے اور سب سے چھوٹے ڈھیر کے پاس بیٹھ گئے اور فرمایا کہ 'اسی میں سے نکال نکال کر دو' اسی میں سے نکال کر دیتے رہے، یہاں تک کہ سارے قرض خواہوں کا قرض ادا ہوگیا۔ جب تمام لوگ چلے گئے تو حضرت جابر ؓ نے کپڑا ہٹایا تو فرماتے ہیں کہ 'میں سوچنے لگا کہ پہلے کھجوریں زیادہ تھیں یا اب زیادہ ہیں؟' کھجوریں گھٹنے کے بجائے بڑھ گئیں۔ یہ کیا؟ کھجور تو درخت پر پھلتی ہیں، یہاں کیسے بڑھ گئیں؟ یہی حکمِ الٰہی ہے۔ حکمِ الٰہی کسی سبب کا پابند نہیں ہے۔ (بخاری)

سہارا صرف خدا کی ذات ہے:

اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ پہلا سہارا بھی اللہ اور آخری سہارا بھی اللہ ہی ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ جب سارے سہارے ٹوٹ جائیں تب اللہ کا سہارا ہے۔ نہیں۔ کہا یہی جاتا ہے کہ سب سہارے ٹوٹ جائیں تو اللہ کا سہارا ہے۔ میں کہتا ہوں سب سہارے ہیں کہاں؟ وہ سہارے جو بظاہر سہارے نظر آرہے ہیں وہ بھی تو اللہ ہی کے محتاج ہیں، اللہ ہی مدد کرتے ہیں تو وہ سہارا بنتے ہیں اور وہ نہ مدد کریں تو کچھ بھی نہیں۔ جب یہ بات ہے تو آدمی کیوں کہیں اور جائے؟ کیوں کسی اور سے مدد مانگے؟ کیوں کسی اور پر لپٹے؟ یہیں آئے اور جم کر بیٹھ جائے تو پھر اللہ کی مدد آتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ تھوڑا آزماتے ہیں کہ دیکھیں پکا ہے کہ کچا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تھوڑے دن میں بھاگ جائے۔

ایک بزرگ نے فرمایا کہ:

جہہ کتا دَردَر پھرے دَر دَر دُر دُر ہوئے
ایک دَر کو تھام لے کہے نہ دُر دُر کوئے

کتا اگر ہر جائی ہے کبھی وہاں جاتا ہے کبھی دوسری جگہ جاتا ہے، کبھی اِس گلی کبھی اُس گلی میں گھومتا ہے تو جہاں جائے گا لوگ بھگا دیں گے۔ اس کو ایک روٹی کا ٹکرا دینے کے لوگ روادار نہیں ہوں گے۔ اس لیے کہ وہ ایک دروازے کا نہیں بہت سے دروازوں

کا ہے۔ ایک دروازہ پکڑ لے اور ٹھہر جائے کہ اب کہیں نہیں جائے گا تو مالک ایک دن بھگائے گا دو دن بھگائے گا، ڈنڈا اسے مارے گا کہ کہاں یہاں بیٹھا ہوا ہے، یہاں سے بھاگ، مگر بالآخر ایک دن اسے رحم آہی جائے گا اور سوچے گا کہ یہ تو گھر کا معلوم ہوتا ہے اور اسے کھلانا پلانا شروع کر دے گا۔ ایسے ہی جو وفادار ہوتا ہے اللہ کا کہ جو کچھ مجھے لینا ہے اللہ ہی سے لینا ہے، اللہ ہی سے مانگوں گا تو جب پرکھ لیا جاتا ہے تو پھر اس پر انعام کی بارش ہوتی ہے۔ ہاں اتنا ہے کہ پرکھنے کے بعد، امتحان کے بعد انعام کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اللہ فرماتے ہیں ”اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡا اٰمَنَّا وَھُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ“ (سورۃ العنکبوت آیۃ ۲) کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ انھیں یونہی چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ یہ کہہ دیں کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے۔ ایسا نہیں ہے آزمائش ہوگی، تھوڑا جم کر بیٹھ جایئے، کہیں مت جایئے کسی سے مت کہیے، پھر دیکھیے اللہ کہاں کہاں سے انتظام کرتے ہیں۔ غیب کا پورا نظام حرکت میں آجاتا ہے جب کوئی آدمی ایسا ہوتا ہے کہ جو اللہ کے علاوہ کسی اور کے پاس نہیں جاتا۔

ایک اہم بات:

رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں .....غور سے سنیے بہت کام کی چیز ہے اور صرف سنیے نہیں، اس پر پورا یقین کیجیے، یقین کرنے والوں نے جب یقین کیا ہے تو دنیا و آخرت کی تمام نعمتیں انھیں ملیں، پھر ان سے بہتر کوئی نہیں ہوا......آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ ’کسی شخص کو اگر فاقہ ہو، اور کھانے کو نہ ہو، اور وہ کسی سے نہ کہے، صرف اللہ سے کہے، کسی کے سامنے تذکرہ بھی نہ کرے، کوئی شکایت بھی نہ کرے، اس پر صبر کرے اور کہے تو صرف اللہ سے کہے، تو فرماتے ہیں کہ ’اللہ پر حق ہو جاتا ہے اس کو سال بھر کی روزی بغیر محنت کے عطا فرمائیں۔‘ مگر یہی نہیں ہو پاتا، جہاں پریشانی ہوئی بس اِدھر اُدھر گانا شروع کر دیا۔ کسی سے نہ کہے، ایک اللہ ہی سے کہے تو وعدہ پکا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک سال تک بغیر محنت کے روزی کا دروازہ کھول دیں گے۔

میرے سارے کہنے کا حاصل یہی ہے کہ سہارا وہی ایک ہے، مددگار وہی ہے، جب آپ کو ضرورت پیش آئے فوراً اسی سے کہیے۔

ہر حال میں اللہ ہی سے کہنا چاہیے:

ہمارے ایک بزرگ ہیں سید احمد شہید علیہ الرحمہ۔ ہمارے یہاں ایک ضلع غازی پور ہے، وہیں سے تشریف لے جارہے تھے۔ راستے میں گانے کی آواز آئی۔ اللہ والوں کو اس سے وحشت ہوتی ہے، طبیعت پریشان ہوئی، ان کے ساتھ ایک بڑے عالم مولانا اسماعیل شہید بھی تھے۔ سید صاحب فرماتے ہیں کہ 'مولانا! آپ سورہ یٰس پڑھیے، میں اللہ سے دعا کرتا ہوں' مولانا نے سورہ یٰس شروع کی اور انھوں نے دعا شروع کی۔ تھوڑی دیر میں سب گانا بجانا بند ہوگیا۔ آدمی ہر موقع پر اللہ کو یاد کرے، ان لوگوں کا ذہن تھا کہ کون لڑنے جائے، کس کو فرصت ہے، چلو اللہ سے دعا کرتے ہیں۔

انھیں کی برکت سے میں اپنا ایک قصہ سنادوں۔ میں بنگلہ دیش گیا ہوا تھا، ڈھاکہ سے چاٹ گام جانا تھا، ٹرین بہت اچھی تھی، بڑی تیز رفتار ٹرین تھی اور اس ٹرین میں اذان پانچوں وقت ہوتی تھی۔ مسلمان ملک ہے، اس لیے پانچوں وقت اذان ہوتی تھی۔ ٹرین میں اذان کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ ڈرائیور کے پاس ٹیپ ریکارڈ ہوتا ہے، اذان کے وقت وہ اس کو لگا دیتا ہے، جس سے سب کو معلوم ہوجاتا ہے کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے۔ ایک ڈبہ نماز کے لیے خاص تھا، اس میں سیٹ وغیرہ نہیں تھی۔ قبلہ کے اعتبار سے اس میں قالین بچھی ہوئی تھی۔ فجر کے وقت اذان ہوئی، ہم لوگ نماز کی تیاری کرنے لگے، جیسے ہی اذان ختم ہوئی، ویسے ہی گانا شروع ہوگیا اسی قوت اور زور وشور کے ساتھ۔ میں نے سوچا کہ بڑے پاگل ہیں، ابھی تو اذان ہوئی ہے اور ابھی گانا بھی ہونے لگا۔ پوری گاڑی کے ہر ڈبے میں یکساں آواز آرہی تھی، کوئی نماز کیسے پڑھے۔ مجھ کو سید صاحب کی بات یاد آئی، میں نے سوچا کہ سید صاحب اللہ والے تھے، ان کی برکت سے میں بھی یہی کام کرتا ہوں۔ چنانچہ میں نے سورہ یٰس پڑھنی شروع کی اور اخیر تک پہنچتے پہنچتے گانا بند ہوگیا اور

پھر پورے راستے گانا بجا ہی نہیں۔

تدبیر کیجیے مگر یقین اللہ پر رکھیے:

اللہ تعالی کی طرف دھیان رکھنا چاہیے، وہ جب چاہتے ہیں جیسے چاہتے ہیں کر دیتے ہیں۔ ایک مومن کا ایمان یہی ہے مگر آدمی بھول جاتا ہے اور دھیان اِدھر اُدھر چلا جاتا ہے۔ نہیں ’ایک در کو تھام لے کہے نہ دُر دُر کوئے۔‘ میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی تدبیر مت کیجیے۔ تدبیر کیجیے مگر دل میں یقین رکھیے کہ جو کچھ ہے اللہ ہی کی طرف سے ہے، پھر نہ کوئی پریشانی ہوگی نہ شکایت ہوگی۔ بس اللہ ہی سے مانگیں اور اسی سے لپٹے رہیں۔ انسان بہت سی مجبوریوں میں اور بہت سی پریشانیوں میں پیدا کیا گیا ہے، ان دشواریوں کا حل یہی ہے انسان اللہ کی طرف متوجہ ہو، اور شاید اسی مصلحت کی وجہ سے اتنا پریشان کیا گیا ہے کہ بھاگ نہ جائے۔ اگر پریشانی نہ ہو تو انسان اللہ کو فوراً بھول جائے گا۔ اسی لیے اللہ تعالی اس کو گاہے بگاہے مصیبت میں ڈالتے رہتے ہیں، تاکہ اس کا دھیان خدا کی طرف رہے، بہک نہ جائے، ہٹ نہ جائے۔

انسان پریشانیوں میں پیدا کیا گیا ہے مگر ہر پریشانی کا علاج ہے اور وہ علاج اللہ کی جانب توجہ کرنا ہے۔ کون سا مسئلہ ایسا ہے جس کو آپ اللہ سے دعا کر کے حل نہیں کر سکتے۔ کیسا ہی ٹیڑھا راستہ ہو، جانے کی گنجائش نہ ہو، اللہ سے دعا کیجیے، اللہ تعالی اسی میں سے راستہ نکالتے چلے جائیں گے۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں ”وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ“ (سورۃ مومن آیۃ ٦٠) اور تمھارے رب نے فرمایا کہ مجھ سے مانگو مجھ سے دعا کرو ”اَسْتَجِبْ لَکُم“ میرا وعدہ ہے کہ میں تمھاری بات پوری کروں گا۔ حالاں کہ اگر اللہ چاہیں تو نہ پورا کریں، ہم ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے مگر ان کی مہربانی ہے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ ”اَسْتَجِبْ لَکُم“ میں تمھاری دعا قبول کروں گا۔

اب اس وعدہ کے بعد بد بخت ہوگا جو کہے گا کہ میں دعا نہیں کروں گا! مگر اس کے بعد بھی کوئی کہتا ہے کہ میں دعا نہیں کروں گا اور اپنے سے کام چلا لوں گا تو فرماتے ہیں

کہ ”اِنَّ الَّذِیۡنَ یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِیۡ سَیَدۡخُلُوۡنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیۡنَ“ (سورۃ مومن آیۃ ۶۰) جو میری عبادت سے، مجھ سے دعا کرنے سے تکبر کرتے ہیں میں ان کو ذلیل وخوار کر کے جہنم میں داخل کر دوں گا۔

خلاصہِ کلام:

ساری بات کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ پر کامل ایمان اور پختہ یقین ہونا چاہیے کہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ ہی کرتا ہے، اسی کی مشیت ہوتی ہے تو کسی کو نفع ونقصان پہنچتا ہے۔ کوئی انسان یا کوئی اور شے کچھ کرنے والی نہیں ہے۔ ہر معاملہ میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے، اسی سے لپٹنا چاہیے، اسی سے مانگنا چاہیے۔ دینے والا وہی ہے، اس کی مشیت کے بغیر نہ کوئی دے سکتا ہے اور نہ کوئی لے سکتا ہے۔ انسان کا ایمان جب اس پر پختہ ہوگا تو اس کی ساری الجھنیں اور ساری پریشانیاں از خود دور ہو جائیں گی۔ پھر اس کے بعد نہ کبھی اس کو کسی انسان سے شکایت ہوگی اور نہ کبھی مخلوق کی طرف نگاہ جائے گی۔

اللہ تعالیٰ ہم تمام لوگوں کو یہ دولتِ بے بہا نصیب فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

❑❑❑

غیروں کی مشابہت سے بچنا لازم ہے

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہ وَنَسْتَعِیْنُہ وَنَسْتَغْفِرُہ وَنُوْمِنُ بِہ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہ وَ مَن یُّضْلِلْہ فَلَا ھَادِیَ لَہ۔ وَنَشْھَدُ اَن لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہ لَا شَرِیْکَ لَہ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مَحَمّداً عَبْدُہ وَرَسُوْلُہ اَرْسَلَہ بِالْحَقِّ بَشِیْراً وَنَذِیْراً ۔ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہ وَاَصْحَابِہ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً۔ اَمَّا بَعْدُ:

فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمان الرحیم

وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوْا اللّٰہَ فَاَنْسَاھُمْ اَنْفُسَھُمْ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ (۱۹) لَا یَسْتَوِیْ اَصْحَابُ النَّارِ وَاَصْحَابُ الْجَنَّةِ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ (۲۰) [سورة الحشر]

اللہ تبارک وتعالی نے اس رکوع کی پہلی آیت میں ایمان والوں کو تقوی کا حکم دیا ہے، اور اس کا طریقہ یہ بتایا کہ ہر ایک کو یہ دیکھتے رہنا چاہیے کہ کل یعنی اللہ کے پاس حاضر ہونے کے لیے کیا بھیجا ہے؟ اور کیا تیاری کی ہے؟ انسان اسی فکر میں لگ جائے، اور یہی اس کے دل کی فکر بن جائے تو اس کی ساری زندگی سنور جائے گی۔ اس لیے کہ اللہ کے احکام کو پورا کرنا اور منہیات سے اپنے کو بچانا، اسی میں ساری کائنات کی اصلاح و فلاح ہے۔

تقوی ان دونوں چیزوں کا مجموعہ ہے کہ آدمی دھیان رکھے کہ اللہ کی کتنی

تابعداری کی اور منہیات سے کتنا باز رہا۔

پھر فرمایا کہ ’ اللہ سے ڈرو، اللہ تمھارے کاموں سے باخبر ہے۔‘ دوسری آیت میں ایک بات سے منع کیا ہے۔ (جس چیز کا حکم دیا جائے اسے کرنا فرض، اور جس سے منع کیا جائے اسے کرنا حرام۔ حکم دیا تقوی اختیار کرو اور اپنے اعمال کی دیکھ بھال کرتے رہو) فرمایا کہ ”وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ“ ان لوگوں جیسے مت ہو جانا جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا، یہ زبردست حکمت کی بات ہے۔

ایک جامع حکم:

اس دنیا میں دو طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں، ایک تو وہ ہیں جو اللہ کو یاد رکھتے ہیں، اس کی اطاعت کرتے ہیں اور اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں۔ اور دوسرے وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا، یعنی اللہ سے کوئی مطلب نہیں، اس کے احکام کی کوئی پرواہ نہیں۔ ایک جماعت ایمان والوں کی، اور ایک جماعت اللہ کو بھلانے والوں کی۔ اللہ نے منع فرمایا کہ اس دوسری جماعت کی طرح مت ہونا، اسی طرح ان کے افعال، ان کی صفات اور ان کے طور طریقے سب چیزوں سے منع فرما دیا۔

ہر چیز کا ایک اثر ہوتا ہے، انسان جب اللہ کو بھولتا ہے تو غیر اللہ میں مشغول ہوتا ہے، پھر اسے اللہ کے احکام کی پرواہ نہیں ہوتی، اللہ کا خوف اسے نہیں ہوتا، ہر کام میں اپنے نفس کا فایدہ مطلوب ہوتا ہے۔ اگر کسی کام میں نفس کا فایدہ ہو تو اسے کرتا ہے۔ اگر اسے اللہ سے ڈرنے کو کہا جائے تو ڈرنے کے بجائے اور تکبر پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اسے آخرت کے جواب کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ اس کے اصل مصداق تو کفار ہیں، پھر وہ لوگ جو ان کے مشابہ ہیں۔ ایمان والوں سے اللہ نے فرمایا کہ تم ایسوں کی طرح مت ہو جانا۔ ان کے احوال واقوال اور طور طریقے کی پسندیدگی تمھارے اندر نہ آنے پائے۔ بہت جامع بات ہے، جس قدر غور کیا جائے اس کی جامعیت ظاہر ہوتی ہے۔ فرمایا” وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِيْنَ“ (سورة الاعراف آية ۲۰۵) غافلوں میں سے مت ہو جانا۔ یہ نہیں فرمایا

کہ غافل مت بننا۔ ’چوری مت کرنا‘ اور ’چوروں کا ساتھی مت بننا‘ دونوں حکم میں بڑا فرق ہے۔ یہ ایک مومن کے لیے زبردست حکم ہے۔ اور یہی نکتہ ہے جہاں کہا گیا ہے ”صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ“ ہمیں انھیں کے زمرے اور جماعت میں رکھیے جن پر آپ کا انعام ہوا ہے۔ فرمایا ” وَلَا تَرۡکَنُوۡا اِلَی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ “ (سورة هود آیة ۱۱۳) ظالموں کی طرف مت جھکنا ورنہ ان کی طرح تمھیں بھی آگ پکڑ لے گی۔

مقبول ہونے اور نہ ہونے کا تعلق ذات سے نہیں، افعال اور صفات سے ہے۔ اگر ظالموں کا طریقہ اختیار کروگے تو انجام ویسا ہی ہوگا۔ یہ نہیں فرمایا کہ ظالم مت بننا، بلکہ فرمایا کہ ظالموں کی طرف مت جھکنا۔ اللہ مسلسل فرماتے ہیں کہ ظالموں اور کافروں سے تمھاری مشابہت نہ ہونے پائے، جو طریقہ غیروں کا ہے وہ تمھارے اندر نہ آنے پائے۔ غیروں کا طریقہ انھیں کے لیے رہنے دیجیے، اسلام کا جو طریقہ ہے اسے اپنایئے، یہی اللہ کا حکم ہے۔

ہر حال میں اللہ کے حکم کو دیکھنا ہے:

حضور اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ بعض صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ ”اِنَّهَا سَتَكُوۡنُ بَعۡدِیۡ اَثَرَةٌ وَاُمُوۡرٌ تُنۡكِرُوۡنَهَا، قَالُوۡا یَارَسُوۡلَ اللّٰهِ! کَیۡفَ تَامُرُنَا مَنۡ اَدۡرَكَ مِنَّا ذَالِكَ ؟ قَالَ: تُؤَدُّوۡنَ الۡحَقَّ الَّذِیۡ عَلَیۡكُمۡ وَتَسۡأَلُوۡنَ اللّٰهَ الَّذِیۡ لَكُمۡ“ (متفق علیه) میرے بعد تم لوگ ترجیحات اور ناپسندیدہ امور دیکھوگے۔ تم جس منصب کے حق دار ہوگے، وہ تمھیں نہ دے کر دوسروں کو دیا جائے گا۔ آج کل یہی ہو رہا ہے، چاہے جمہوریت ہو یا بادشاہت، ہر حکومت میں لایق کو چھوڑ کر نالایقوں کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ اس لیے کہ اس نے رشوت دے رکھی ہے، اس سے رشتہ داری ہے، کسی بڑے کا دباؤ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ’تم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے گی۔‘ صحابہ نے عرض کیا کہ ’یا رسول اللہ! اس وقت ہم کیا کریں؟‘ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ’تمھارے اوپر جو دوسروں کے حقوق ہیں، اسے تم ادا کر دو، اور تمھارا جو حق دوسروں پر ہو، اس کے بارے میں اللہ سے سوال کرو، کسی

سے لڑائی مت کرو، دونوں پہلو میں اللہ کا واسطہ ہے، میرے اوپر دوسروں کے حقوق ہوں، اسے ادا کردوں، اس لیے کہ اللہ کا حکم ہے "اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰی اَھْلِھَا" (سورۃالنساء آیۃ ۵۸) یقیناً اللہ کا حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں تک پہنچاؤ۔

حضور ﷺ نے جب مکہ فتح کیا تھا تو اس وقت خانہ کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ کے پاس تھی۔ یہ اس وقت اسلام نہیں لائے تھے۔ حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کنجی لانے کے لیے بھیجا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کنجی مانگی تو وہ دینے سے انکار کرنے لگے۔ حضرت علی نے زبردستی چھین لی اور کعبہ کا دروازہ کھولا۔ حضرت عثمان بھی پیچھے پیچھے آ گئے۔ کنجی ہاتھ سے جانے کے بعد سوچ رہے ہیں کہ اب دوبارہ ان کو نہیں دی جائے گی۔ ادھر حضور ﷺ پر یہ آیت نازل ہوئی۔ آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی اور کنجی لے کر ان کے حوالے کر دی اور فرمایا کہ 'یہ قیامت تک تمھارے پاس رہے گی'۔

اپنا حق صرف اللہ سے مانگیں:

اللہ کا حکم ہے کہ ہمارے اوپر دوسروں کے جو بھی حقوق ہوں اسے طاقت کے بقدر ادا کریں، اور جو ہمارا حق دوسروں پر ہو، اسے اللہ سے مانگیں۔ قلوب تو اللہ کے قبضے میں ہیں، وہ دوسروں سے ہمارا حق دلوا دیں گے۔ جب آدمی ایسا کرے گا تو جھگڑے کی کوئی بات ہی نہ ہوگی۔ دوسروں کا حق تو ہم ادا نہ کریں اور اپنا حق وصول کرنے کے لیے لڑائی کریں۔ یہ کام ہمارا نہیں ہے، یہ غیروں کا طریقہ ہے۔ اللہ کا حکم ہے کہ ہم ضرورت کے وقت ہر کسی کے کام آئیں۔ ایک آدمی اپنے پیسے یا کسی اور طریقے سے کسی کی مدد کرتا ہے تو اب مدد کرنے والے پر ہے کہ وہ اپنے احسان کا بدلہ طلب نہ کرے، اس سے شکریہ کی امید نہ رکھے۔ ہوتا یہ ہے کہ وہ بے چارہ اس کی تعریف اور قدر نہیں کر سکا اور کسی معاملہ میں اس کی خلاف ورزی کر بیٹھا تو اب یہ شکایتیں کرتا پھرتا ہے کہ ہم نے ضرورت کے وقت اس پر احسان کیا اور یہ ہماری بات نہیں مانتا۔ اس سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ یہاں تو یہ حکم

ہے ”لَا تُبْطِلُوْا اَعْمَالَکُمْ“ (سورۃ محمد آیۃ ۳۳) اپنے اعمال کو برباد مت کرو۔ کسی کی مدد کر دینا یہ اللہ کی توفیق سے ہوا ہے، اپنے اس کام کا بدلہ اللہ سے طلب کریں، اس سے بدلہ نہ مانگیں۔ ہاں اس پر بھی یہی حق ہے کہ وہ اپنے محسن کا شکریہ ادا کرے۔ دونوں پر اللہ کا حکم الگ الگ ہے۔ احسان کرنے والا اس سے بدلہ کی امید نہ رکھے، اور جس پر احسان کیا گیا ہے اس پر حق ہے وہ اپنے احسان کرنے والے کا شکریہ ادا کرے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی علیہ الرحمہ کو کسی نے ضرورت کے وقت تنہائی میں ایک بڑی رقم دی، مگر دوسرے موقع پر حضرت نے اسے ظاہر فرما دیا۔ یہ صاحب بڑے شرمائے، تو حضرت نے فرمایا کہ ’یہ میرا حق تھا، مگر تم اپنی زبان سے مت کہنا کہ میں نے اتنا دیا۔‘ الغرض اللہ کو یاد رکھنے والوں کی شان یہ ہے کہ دوسروں کا حق ادا کر دیں اور اپنا حق اللہ سے مانگیں۔

غیروں کے ساتھ مشابہت منع ہے:

جب ہندوستان میں انگریزی تہذیب کی یلغار تھی تو علما نے سختی سے منع فرمایا تھا کہ ان کی تہذیب اختیار مت کرو۔ جو لوگ اس تہذیب کی طرف بھاگے جا رہے تھے، اس تہذیب کے دلدادہ تھے، انھوں نے بڑا اعتراض کیا کہ آخر اس تہذیب میں خرابی کیا ہے؟ یہ لوگ لکیر کے فقیر بنے بیٹھے ہیں۔ علما نے انہیں یہ حدیث سنائی ”مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ“ (ابوداؤد) جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے اس کا شمار انھیں لوگوں میں ہوتا ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے، فطرت اور قاعدے کے عین مطابق ہے۔ چوروں کا طریقہ اختیار کرنے والا چور ہوتا ہے۔ عورتوں کا طریقہ اختیار کرنے والا عورت ہوگا۔ جب یہ حدیث سنائی تو لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ’یہ حدیث ضعیف ہے۔‘ ٹھیک ہے مان لیا حدیث ضعیف ہے مگر قرآن کی آیت تو ضعیف نہیں۔ قرآن میں صاف طور سے کہہ دیا گیا ”وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوْا اللّٰہَ“ ان کی کسی بھی طرح مشابہت اختیار نہ کرنا۔ ”وَلَا تَرْکَنُوْا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا“ (سورۃ ھود آیۃ ۱۱۳) ظالموں کی طرف مت جھکنا۔

غلط ہر حال میں غلط ہے:

ہماری بہت بڑی بیماری یہ ہے کہ ہم نے دوسروں کی مکمل پیروی کرڈالی ہر ہر چیز میں۔ چہرے مہرے میں، داڑھی میں، لباس میں دوسروں کا طریقہ اختیار کرلیا ہے۔ حالانکہ ان کے لباس میں کوئی اسلامی رعایت نہیں رکھی گئی۔ یہ پتلون، آج کے زمانے میں ناجائز کہنے کی ہمت نہیں ہے مگر ذرا کوئی دیکھے تو سہی، ستر کا جو مقصد ہوتا ہے وہ اس سے پورا بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ مگر اتنا زیادہ عام ہوگیا ہے کہ اسے ناجائز کہنے والے کو لوگ پتہ نہیں کیا کہیں گے، مگر حق، حق ہے۔

ہمارے گاؤں میں شرابیوں کی اچھی خاصی تعداد ہے، اور کچھ لوگ شراب سے بچنے والے بھی ہیں۔ ایک بار ان لوگوں نے اعلان کیا کہ تمام شرابیوں کا بائیکاٹ کردیا جائے، ان سے کسی طرح کا اب کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ شرابیوں کے سرغنہ کو جب معلوم ہوا تو اس نے کہا کہ 'بائیکاٹ کون کرتا ہے؟ جو تعداد میں زیادہ ہوتا ہے، ہماری تعداد زیادہ ہے، اس لیے ہم غیر شرابیوں کا بائیکاٹ کرتے ہیں۔' اسی طرح پتلون والے ہیں، ان کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ کسی کو ناجائز کہتے ہوئے ڈر محسوس ہوتا ہے، مگر حق میں یہ سب نہیں چلتا، جو بات حق ہے وہ بہرحال حق ہے، چاہے اس پر عمل کرنے والا ایک ہی آدمی کیوں نہ ہو۔ قرآن کا اعلان ہے "لَا يَسْتَوِى الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ" (سورة المائدة آية ۱۰۰) ناپاک اور پاکیزہ چیزیں برابر نہیں ہوتیں، چاہے تمھیں ناپاک چیزوں کی کثرت اچھی لگتی ہو۔ برائی کثرت میں ہو تب بھی اسے اچھائی پر فضیلت نہیں دی جاسکتی۔ اگر نمازی اور بے نمازی میں تناسب دیکھا جائے تو بے نمازی کی تعداد بہت زیادہ ہوگی، مگر کیا اس سے نماز اور نمازی کی فضیلت کم ہوجائے گی؟ کثرتِ تعداد مطلوب نہیں ہے۔ قوت حق میں ہوتی ہے چاہے وہ قلیل ہو۔ انگریزی تہذیب کے دلدادہ کی تعداد چاہے کتنی ہی زیادہ ہوجائے مگر شرعاً جو ناجائز ہے اس سے وہ جائز نہیں ہوسکتا۔

تہذیب اپنی ہی اچھی ہوتی ہے:

اچھا عجیب بات یہ ہے کہ انگریزی تہذیب میں ہمارے دین سے میل کھانے والی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ ان کا ہر طریقہ ہمارے طریقہ کے برعکس ہے۔ ان کے یہاں ادب یہ ہے کہ قابلِ احترام جگہوں پر سر سے ٹوپی اتار دیں گے۔ ہم طالب علمی کے زمانے میں الہ آباد گئے، ایک بار ہائی کوٹ کی کچہری میں گئے تو چپراسی نے کہا کہ ’ٹوپی اتار دیجیے۔‘ میں نے کہا ’جوتا اتارتے ہیں، ٹوپی کیوں اتاریں۔‘ مگر وہ اس پر مصر رہا۔ ہماری تہذیب یہ ہے کہ ٹوپی قابلِ احترام جگہوں میں سر پر رہے، اور ان کی تہذیب ہے کہ نہ رہے۔ احرام کی حالت میں تو ہے کہ سر کھلا رہے گا، مگر عام حالت میں سر پر ٹوپی رہے گی۔ آج بھی لوگ بڑوں کے پاس سر پر ٹوپی رکھ کر جاتے ہیں۔ ہماری تہذیب ہے جس کی سخت تاکید کی گئی ہے کہ ٹخنے سے نیچے کپڑا نہیں ہونا چاہیے۔ سیدنا عمر فاروقؓ پر جب حملہ ہوا تھا تو بے ہوشی پر بے ہوشی طاری ہو رہی تھی۔ اسی وقت ایک نوجوان عیادت کے لیے آیا، جب جانے لگا تو آپ نے دیکھا کہ اس کا کپڑا ٹخنے سے نیچے جا رہا ہے۔ بلا کر سمجھایا کہ کپڑا اوپر کرو، یہ سنت بھی ہے اور اس میں صفائی بھی ہے۔ اس کی بڑی شدید حرمت آئی ہے۔ اب تو صرف لوگ نماز میں اوپر کر لیتے ہیں حالانکہ ہر وقت اوپر ہونا چاہیے۔ یہ انگریزی تہذیب ہے جو اسلامی تہذیب کے سراسر خلاف ہے۔ اگر لوگ اوپر رکھیں گے تو دنیا بے وقوف کہے گی۔ ہمارے شیخ نے فرمایا ’عجیب بات ہے، جب نیچے کرنے پر آتے ہیں تو ٹخنے سے نیچے کر لیتے ہیں، اور جب اوپر کرنے پر آتے ہیں تو چڈی بنا لیتے ہیں۔‘ اگر کوئی پتلون ٹخنہ سے اوپر کر کے پہننے لگے تو لوگ سر دیکھیں گے کہ کہیں پاگل تو نہیں ہے؟ یہ ان کی تہذیب ہے جو شرعاً جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ ستر کا جو مقصد ہے، وہ پورا نہیں ہو پاتا ہے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ غیروں کے طریقہ پر چلنے والا، اللہ کو بھولنے والا ہے۔ اور ظالموں کی طرح اسے بھی آگ پکڑ لے گی۔ اللہ نے صاف منع کر دیا ہے کہ ’ظالموں کی طرف مت جھکو ورنہ جہنم کی آگ تمھیں بھی پکڑ لے گی۔

اللہ کو بھولنے والا اپنا ہی نقصان کرتا ہے:

جو اللہ کو بھول جائے وہ بے وقوف ترین انسان ہے۔ اللہ فرماتے ہیں ”وَمَنُ یَرُغَبُ عَنُ مِلَّةِ اِبُرَاهِیُمَ اِلَّا مَنُ سَفِهَ نَفُسَهُ “(سورة البقرة آیة ۱۳۰) اور کون ہے جو ابراہیم کے طریقے سے انحراف کرے؟ سوائے اس شخص کے جو اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کر چکا ہو۔ اور جو لوگ اللہ کو یاد رکھنے والے ہیں، عقل مند وہی لوگ ہیں۔ ”اَلَّذِیُنَ یَذُکُرُوُنَ اللّٰهَ قِیَاماً وَّقُعُوُداً“ (سورة آل عمران آیة ۱۹۱) ان کا کام ہر حال میں اللہ کو یاد رکھنا ہے، بیٹھے بھی، کھڑے بھی اور لیٹے بھی۔

اللہ نے سیدھی بات فرما دی کہ ان لوگوں کی طرح مت ہونا جو اللہ کو بھول گئے۔ اللہ کو بھولنے کی وجہ سے سزا کیا ملی؟ ”اَنُسَاهُمُ اَنُفُسَهُمُ“ اللہ نے ان کی اپنی جان کو بھلا دیا۔ انھیں اپنے نفع ونقصان کی تمیز اور پہچان ختم ہوگئی۔ خدا کو بھولنے والا کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ”مَنُ اَعُرَضَ عَنُ ذِکُرِیُ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیُشَةً ضَنُکاً“ (سورة طه آیة۱۲۴) اور جو میری نصیحت سے منھ موڑے گا تو اس کو بہت تنگ زندگی ملے گی۔ وہ دیکھنے میں چاہے کتنوں ہی خوش حال اور مال دار ہوں مگر ان کی زندگی ایک دم تنگ ہوگی۔

سکونِ قلب مال میں نہیں ہے:

ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ ایک صاحب بہت پریشان ہیں، آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ خیر وہ انہیں لے کر آئے، انھوں نے اپنی پریشانی ذکر کی تو میری روح کانپ گئی۔ ان کی بات سے اندازہ ہوا کہ وہ پہلے بہت مالدار تھے، اب ایک دم قلاش ہو گئے ہیں، کھانے کو بھی محتاج ہو گئے۔ ان کی پریشانی سن کر میں یہی سمجھ رہا تھا کہ ان سے زیادہ غریب شاید اب کوئی نہ ہو۔ پھر انھوں نے بڑی بے بسی سے کہا کہ ’میرے یہاں دعا کے لیے تشریف لے چلیے۔‘ میں نے ان کی بے بسی دیکھ کر ہامی بھر لی۔ انھوں نے کہا کہ ’میں گاڑی بھیج دوں گا۔‘ میں نے منع کیا کہ گاڑی بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں، میں خود ہی آجاؤں گا۔ میں نے سوچا کہ بے چارے کہاں سے گاڑی کا انتظام کریں گے۔ اس لیے

میں کرایے کی گاڑی سے ان کے یہاں پہنچ گیا۔ جب ان کا گھر دیکھا تو حیران رہ گیا یا خدا! اتنی بڑی بلڈنگ انھیں کی یا ہے کہیں اور آ گئے؟ میں تو سمجھا تھا کہ کوئی معمولی جھونپڑی ہوگی۔ جب دروازہ کھولا گیا تو اندر پندرہ بیس گاڑیاں نظر آئیں۔ اس مدرسہ (مدرسہ فلاح المسلمین گواپوکھر مدھوبنی) سے زیادہ بڑی عمارت تھی۔ معلوم ہوا کہ اس شہر کا نمبر ایک کا مالدار ہے، قالین کا کاروبار ہوتا ہے اور ایک گودام دکھایا اور بتایا کہ اس میں پانچ چھ ارب کا قالین موجود ہے، بازاروں میں جو لگے ہوئے تھے وہ اس کے علاوہ تھے۔ جسے میں نے سب سے بڑا فقیر سمجھا تھا وہ اتنا مالدار نکلا، مگر پریشان اتنا کہ گولیاں کھا کر سوتا ہے مگر نیند نہیں آتی۔ تو یہی خوش حالی ہے؟ خوش حالی تو دل کے اطمینان کا نام ہے، اس کے لیے مالداری لازم نہیں ہے۔

میرے دوستو! جو لوگ خدا کو بھول جاتے ہیں اللہ تعالی ان کی اپنی جان کو بھی بھلا دیتا ہے۔ انھیں کچھ پتہ نہیں چل پاتا، وہ فایدہ میں نقصان اور نقصان میں اپنا فایدہ سمجھنے لگتے ہیں۔

فاسق کی طرف اللہ کی رحمت متوجہ نہیں ہوتی ہے:

آگے فرمایا ”اُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ“ وہی لوگ فاسق ہیں، جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا۔ وہ بھی فاسق اور جوان کے طریقہ پر چلا وہ بھی فاسق، یہ دونوں فاسق ہیں۔ اور یہ بہت بری بات ہے کہ ایمان والا ہو اور فاسق ہو، اللہ کو یہ بات منظور نہیں ہے۔ فرماتے ہیں ”بِئْسَ الْاِسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ“ (سورۃ الحجرات آیۃ ۱۱) ایمان کے بعد فسق کا نام بری بات ہے۔ اور اللہ نے فرمایا کہ ’فاسقوں کی مشابہت اختیار کرنے والا بھی فاسق ہوتا ہے، پھر اس پر اللہ کا غضب نازل ہوتا ہے۔‘

اسی لیے حضرت سید احمد شہید علیہ الرحمہ کے پاس کوئی بھی پریشان حال آتا اور دعا کی درخواست کرتا تو حضرت اس سے وعدہ لیتے کہ ’جھوٹ نہیں بولو گے، بے ایمانی نہیں کرو گے، گناہ نہیں کرو گے۔ اگر تم وعدہ کرو کہ فسق کا کام نہیں کریں گے تو ہم دعا

کر دیں گے۔' اور جو وعدہ کرتا اس کا کام بھی بن جاتا اور جو وعدہ خلافی کرتا وہ برباد ہوتا۔ ہم لوگ سب کے لیے دعا کرتے ہیں مگر اس دعا کا اثر ہر ایک پر ظاہر نہیں ہوتا ہے، اس لیے کہ جو فسق کا کام کرے گا، اللہ کی رحمت اس کی طرف کیسے متوجہ ہوگی، اس پر تو اللہ کا غضب نازل ہوتا ہے۔

فاسق کے حق میں دوسرے کی دعا بھی قبول نہیں ہوتی:

ایک شخص کسی گناہ میں پکڑا گیا، لوگ اس کے لیے دعا کرنے لگے۔ مجھ سے بھی کہا گیا کہ میں بھی دعا کر دوں۔ میں نے کہا کہ 'وہ پہلے سچی پکی توبہ کرے تو ہم دعا کریں گے۔' اس کو لوگوں نے میری بات بتا دی، تو اس نے مجھے جواباً خط لکھا کہ 'میں نے سچی توبہ کر لی ہے۔' میں نے اس کی بات سچ مان کر اس کے لیے دعا کرنی شروع کر دی، مگر میری حالت بگڑنے لگی، دل پر تاریکی چھانے لگی۔ بہت غور کیا تو احساس ہوا کہ شاید وہ دعا غلط ہو رہی ہے۔ پھر میں نے اس دعا سے توبہ کر لی۔ بعد میں پتا چلا کہ اس نے کوئی توبہ نہیں کی تھی، بلکہ میں نے توبہ کی بات کہی تھی تو وہ اس تک پہنچی ہی نہیں تھی۔ دوسرے لوگوں نے اوپر ہی اوپر اس کی طرف سے مجھے توبہ کا خط لکھ دیا تھا۔

اللہ کی رضا مندی شرط ہے، اسے ناراض کر کے کوئی کام کیا جائے تو مال تو مل جائے گا، اطمینان نہیں مل سکے گا۔ ہمیں یہ حکم ہے کہ ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا۔

اہلِ جنت اور اہلِ جہنم برابر نہیں ہیں:

آگے فرماتے ہیں "لَا یَسْتَوِیْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ" جنت والے اور جہنم والے برابر نہیں ہو سکتے۔ جنت والے کون ہیں اور جہنم والے کون ہیں؟ آیت کے سیاق وسباق سے پتہ چل رہا ہے کہ جنت والے وہ حضرات ہیں جو اصحابِ تقوی ہیں، دوسروں کی مشابہت اختیار نہیں کرتے، اپنے اعمال کی نگرانی کرتے ہیں، اللہ کو نہیں بھولتے، یہ لوگ کامیاب ہیں۔ اور جہنم والے وہ لوگ ہیں جن میں یہ صفات نہیں

ہیں۔ آدمی خود دیکھ لے کہ کس زمرہ میں جا رہا ہے؟ جنت والوں سے اس کا تعلق ہے یا جہنم والوں سے؟ اس کا جس جماعت سے تعلق ہوگا اسی میں اس کا شمار ہوگا۔

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ‘آدمی کے بارے میں مت پوچھو کہ وہ کیسا ہے؟ اس کے دوستوں کو دیکھو جن کی صحبت میں یہ رہتا ہے، اسی سے اس کے اخلاق و عادات کا پتہ چل جائے گا۔’ اپنا محاسبہ کرتے رہنا چاہیے کہ ہمارا تعلق اہلِ جنت کے ساتھ ہے یا اہلِ جہنم کے ساتھ؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ”حَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا“، قبل اس کے کہ تمھارا حساب لیا جائے، اپنا محاسبہ کرلو کہ تم کس سے تعلق رکھتے ہو؟ دونوں گروہ ایک دوسرے سے ایک دم جدا ہیں۔ ”فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّةِ وَفَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ“ (سورة الشوری آیة ۷) ایک گروہ جنت میں جائے گا اور ایک گروہ بھڑکتی ہوئی آگ میں۔ ان دونوں گروہوں کی اتنی پہچان بتادی گئی ہے کہ انھیں پہچاننا کچھ مشکل نہیں، بلکہ انسان کی فطرت بتادے گی کہ یہ جنتی ہے یا جہنمی؟

نیک لوگ بآسانی پہچان لیے جاتے ہیں:

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری ریلوے ٹکٹ کاؤنٹر پر ٹکٹ لینے گئے۔ ٹکٹ دینے والا غیر مسلم تھا مگر حضرت کو دیکھتے ہی باہر نکل آیا۔ مصافحہ کیا اور کہا ‘یہ مسلمان معلوم ہوتے ہیں۔’ دونوں گروہوں کی اپنی پہچان بتادی گئی ہے کہ ہر گروہ کا آدمی دور سے پہچان لیا جاتا کہ اس کا تعلق کس گروہ سے ہوسکتا ہے؟

میں الہ آباد ایک بار ایک بزرگ قاری حبیب صاحب کے یہاں گیا۔ انھوں نے ایک واقعہ سنایا کہ ‘ایک صاحب مجھ سے ملنے آئے۔ مصافحہ کیا تو ان کا پورا ہاتھ داغدار تھا۔ میں نے ان سے وجہ پوچھی کہ ‘ہاتھ پر یہ داغ کیسے ہیں؟’ نماز کا وقت تھا، انھوں نے کہا کہ ‘مولانا! پہلے نماز پڑھ لیتے ہیں اس کے بعد بتاؤں گا۔’ نماز کے بعد انھوں نے تفصیل سے بتانا شروع کیا کہ ‘میں پنجاب کا ایک بڑا کاشتکار ہوں۔ ایک بار مجھے مسلمانوں کی جگہیں دیکھنے کی خواہش ہوئی۔ میں دیکھنے کے لیے نکلا تو ہوتے ہواتے

دیوبند بھی آیا۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کا درس ہو رہا تھا، میں وہیں بیٹھ گیا اور مسلسل بیٹھا رہا۔ اپنے پرانے لباس یعنی دھوتی وغیرہ ہی میں تھا۔ جب درس ختم ہوا تو طلبہ مولانا سے مصافحہ کرنے لگے۔ مجھ سے نہیں رہا گیا، میں نے بھی بے اختیار مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ حضرت نے مجھ سے اشاروں میں پوچھا کہ ’آپ کون؟‘ میں نے بے اختیار کہہ دیا کہ ’مجھے مسلمان کر لیجیے۔‘ مولانا بھی کمال ہی کے تھے، وہیں بیٹھ گئے اور بڑے اطمینان سے کلمہ پڑھا دیا، پھر اپنے گھر لے گئے۔ جب میں واپس اپنے گھر گیا تو گھر والوں نے میری خوب پٹائی کی اور مردہ سمجھ کر ایک جگہ ڈال دیا۔ پھر کسی طرح میں دیوبند پہنچا۔ حضرت مدنی نے مجھے پڑھایا اور ایک نابینا لڑکی جو کہ حافظ تھیں، ان سے میری شادی کر دی۔ سات لڑکے پیدا ہوئے، ساتوں حافظ اور قاسمی ہیں۔ سب میری بڑی خدمت کرتے ہیں اور مجھے کسی طرح کی کوئی ضرورت نہیں، مگر دین کی خدمت کا شوق ہے، اس لیے فلاں مدرسہ کا سفیر ہوں اور اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیتا۔

الغرض جنتی اور جہنمی میں بہت فرق ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ اس کا تعلق جنتیوں سے ہو۔ ان کے عادات وخصایل اپنے اندر پیدا کرے، اور اہل جہنم سے دور رہے۔

اللہ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین

❑❑❑

۲۳؍شوال ۱۴۲۷ھ بروز جمعرات بعد نماز مغرب
بمسجد مدرسہ فلاح المسلمین گواپوکھر بھوارہ مدھوبنی

بنی اسرائیل کی بدعنوانیاں اور کفرانِ نعمت

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہ وَنَسْتَعِیْنُہ وَنَسْتَغْفِرُہ وَنُوْمِنُ بِہ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہ وَ مَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہ۔ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہ لَا شَرِیْکَ لَہ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہ وَرَسُوْلُہ اَرْسَلَہ بِالْحَقِّ بَشِیْراً وَنَذِیْراً ۔ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہ وَاَصْحَابِہ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً۔ اَمَّا بَعْدُ:

فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمان الرحیم

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسَی بِآیَاتِنَا اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَکَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّوْرِ وَ ذَکِّرْھُمْ بِاَیَّامِ اللّٰہِ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَآیَاتٍ لِکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ(۵) وَاِذْ قَالَ مُوْسَی لِقَوْمِہِ اذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ اَنْجَاکُمْ مِنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ و یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآئَکُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآئَکُمْ وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِنْ رَبِّکُمْ عَظِیْمٌ(۶)وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکُمْ لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ(۷)[سورہ ابراھیم]

محترم بزرگو اور دوستو! اللہ تعالی کے احسانات میں سے ایک بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے اپنے بندے کو کفر و شرک اور بداعمالیوں کی نحوست اور ان کی تاریکیوں سے نکالنے کے لیے اور روشنی کے راستے پر ڈالنے کے لیے اور صحیح راستے پر چلنے کے لیے انبیاے کرام علیہم الصلوۃ والسلام کا سلسلہ دنیا میں قایم فرما دیا۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی ہدایت کا نور ہے، جہاں کہیں بھی ہدایت کی روشنی ہے، بلکہ یوں کہہ لیجیے کہ اچھے اعمال کا

جہاں کہیں بھی دنیا میں وجود ہے، وہ برکت ہے انبیا علیہم السلام کی۔ اس لیے کہ اللہ کی طرف سے وہ اسی لیے آئے تھے کہ جو کام اللہ کو پسند ہے ان کاموں کے ذریعہ وہ مخلوقِ خدا کا خدا کے ساتھ صحیح تعلق پیدا کر دیں۔ انبیا کا مشن یہی ہے۔ اور ٹھیک ان کے مقابلہ میں ایک گروہ ہے شیاطین کا۔ شیطان نے پوری قوت لگا دی کہ بندوں کو گمراہ کرے۔ اس نے جنت سے نکلتے وقت بھی اللہ سے یوں کہا بلکہ دھمکی دی تھی کہ ’’ فَبِمَا اَغْوَیْتَنِیْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِیْمَ ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِنْ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَیْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ‘‘ چوں کہ آپ نے مجھے بھٹکا دیا ہے، گمراہ کر دیا ہے، اس لیے قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میں آپ کے سیدھے راستے پر بیٹھ جاؤں گا، پھر میں ان کے سامنے سے آؤں گا، پیچھے سے آؤں گا، دائیں سے آؤں گا، بائیں سے آؤں گا، ہر طرف سے آپ کے بندوں کو گھیروں گا اور ان کو صحیح راستے پر چلنے نہیں دوں گا۔ اور اس کے بعد یہاں تک کہہ دیا ’’ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شَاكِرِیْنَ ‘‘ (سورۃ الاعراف آیۃ ۱۶) کہ آپ اکثر لوگوں کو شکر گزار نہیں پائیں گے۔ احسان سب آپ کا ہوگا، ساری نعمتیں آپ کی طرف سے ہوں گی، سارا کام آپ کی طرف سے ہوگا، روزی آپ کی کھائیں گے، آپ کی زمین پر رہیں گے، آپ کے آسمان کے نیچے رہیں گے، آپ کی نعمتوں سے فایدہ اٹھائیں گے۔ غرض یہ کہ ان کا رُواں رُواں آپ کے احسانات سے جکڑا ہوگا، لیکن چند ہی ایسے لوگوں کو آپ پائیں گے جو آپ کے احسانات کی قدر کریں گے اور آپ کی طاعت کریں گے۔ باقی اکثر لوگوں کو میں بہکا دوں گا۔

چنانچہ وہ اپنی اس دھمکی پر قایم رہا۔ اس نے گمراہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ لیکن اللہ تعالی نے بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے انبیا کا سلسلہ جاری فرما دیا کہ کسی کو کل یہ کہنے کا موقع باقی نہ رہے کہ ہمیں خبر نہ تھی، ہمیں معلوم نہ تھا۔ من جملہ انبیا کے ایک بڑے نبی حضرت موسی علیہ السلام دنیا میں تشریف لائے۔ میں نے جو آیت پڑھی ہے اس میں انھیں کا تذکرہ ہے۔ ’’وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسَى بِاٰیَاتِنَا‘‘ ارشاد فرمایا کہ ہم نے

موسی کو بھیجا اپنی آیات دے کر، اپنے احکامات دے کر، اپنی نشانیاں دے کر، اپنی طرف سے معجزات دے کر۔ چنانچہ موسی علیہ السلام کے معجزے مشہور ہیں کہ آپ کے ہاتھ کی لاٹھی سانپ کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ اسی طرح آپ اپنا ہاتھ بغل میں لے جا کر باہر نکالتے تھے تو وہ سفید شفاف روشن سورج کی طرح چمکنے لگتا تھا۔ اور اس کے علاوہ اللہ نے حضرت موسی علیہ السلام کو اور بھی کئی آیاتِ بینات اور معجزات براہ راست عطا فرمائے۔ وہ ان کو اپنی قوم کے پاس لے کر گئے اور یہ بتلایا کہ میں اللہ کا نبی ہوں، میری اطاعت کرو میری بات مانو، فلاح پا جاؤ گے، تاریکیوں سے نکل کر روشنی کی طرف آ جاؤ گے۔ اور اگر نہیں مانو گے تو تمھارے ساتھ بھی وہی معاملہ ہوگا جو گذشتہ امتوں کے ساتھ ہوا ہے۔

تذکیر بایام اللہ:

”وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَيَّامِ اللّٰهِ“ اور ان لوگوں کو اللہ کے ایام یاد دلاؤ۔ یعنی اللہ تعالی نے گذشتہ امتوں کے ساتھ جو معاملات فرمائے ہیں ان کی یاد دہانی کراؤ۔ چنانچہ جس امت نے اللہ کی فرماں برداری کی، اس امت کو اللہ نے انعام واکرام سے نوازا، اور جن لوگوں نے اللہ کی نافرمانی کی، اللہ نے ان کو تہس نہس کر دیا، ہلاک و برباد کر دیا۔ نوح علیہ السلام کی قوم نے نہیں مانا، طوفان آ گیا، ساری قوم غرق کر دی گئی۔ ہود علیہ السلام کی قوم نے نہیں مانا، اللہ تعالی نے ان کے اوپر ایسی خوف ناک آندھی بھیجی کہ ”وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمَانِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ“ (سورة الحاقة آية ۷) اور جو عاد کے لوگ تھے انھیں ایک ایسی بے قابو طوفانی ہوا سے ہلاک کیا گیا جو سات راتیں اور آٹھ دن تک مسلسل چلتی رہیں، جس کے نتیجے میں پوری قوم چکنا چور ہو گئی۔ پھر وہ لوگ اس طرح مرے پڑے رہے جیسے کھجوروں کے تنے۔ ہوا کی طغیانی اور طوفان نے سب کو ختم کر دیا ایک فرد بھی نہیں بچا، سب ہلاک کر دیے گئے۔ اس لیے کہ انھوں نے ہود علیہ السلام کی بات نہیں مانی تھی اور ان کی نافرمانی کی تھی۔

قرآن کریم میں بار بار فرمایا گیا ہے "كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحِ ِِ الْمُرْسَلِيْنَ" (سورة الشعراء آية ۱۰۵) نوح کی قوم نے پیغمبروں کو جھٹلایا "كَذَّبَتْ عَادُ ِِ الْمُرْسَلِيْنَ" (سورة الشعراء آية ۱۲۳) عاد نے پیغمبروں کو جھٹلایا "كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ ِِ الْمُرْسَلِيْنَ" (سورة الشعراء آية ۱۴۱) ثمود نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔

حضرت ہود علیہ السلام کے بعد حضرت صالح علیہ السلام کی قوم آئی، جن کو اللہ نے اونٹنی کا معجزہ عطا کیا تھا۔ ایک پہاڑ سے ایک بہت بڑی اونٹنی نکلی۔ اتنی بڑی اونٹنی تھی کہ اس کے دودھ سے پوری آبادی سیر ہو جایا کرتی تھی اور اس کی جسمانی قوت اور غذا کا یہ حال تھا کہ قوم کے جتنے جانور تھے، سب کے لیے پانی پینے کی باری مقرر تھی۔ فلاں فلاں دن سب جانور پانی پییں گے اور ہفتہ میں ایک دن حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی پانی پیے گے۔ لیکن جس دن وہ پانی پیتی تھی اس دن دوسرے جانوروں کو پانی نہیں ملتا تھا۔ لیکن قوم نے سرکشی کی۔ حضرت صالح علیہ السلام نے کہا تھا کہ 'دیکھو! اونٹنی پر حملہ نہ کرنا اور نہ اسے چھیڑنا۔ اگر اونٹنی کو چھیڑو گے تو اللہ کا عذاب نازل ہو جائے گا۔' لیکن انھوں نے اونٹنی کو مار ڈالا۔ اونٹنی کا بچہ بھاگا، اسے بھی پکڑنا چاہا لیکن وہ نکل گیا۔ فرمایا کہ "تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ" (سورة هود آية ۶۵) بس تین دن اور گنجایش ہے، تین دن کے بعد عذاب آ گیا۔ فرشتے نے ایک ہولناک آواز نکالی، اس کی وجہ سے لوگوں کی دل پھٹ گئے اور سب مر گئے۔

اسی طرح حضرت لوط علیہ السلام کی قوم برائیوں میں مبتلا تھی۔ نجس ترین گندگی میں مبتلا تھی۔ حضرت لوط علیہ السلام نے بہت منع کیا، بہت سمجھایا لیکن وہ قوم ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ حضرت لوط علیہ السلام ہی پر الزام تراشیاں کیں۔ حضرت لوط علیہ السلام تنگ آ گئے، اللہ کی طرف متوجہ ہوئے اور امداد کے طالب ہوئے۔ عرض کیا "رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ" (سورة العنكبوت آية ۳۰) اے میرے رب! اس فسادی قوم کے اوپر میری مدد کیجیے۔ یہ قوم حد درجہ فساد کرنے پر آمادہ ہے میری کوئی

بات نہیں سنتی۔ بس اللہ کی طرف سے مدد آئی۔ چند فرشتے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ ان حضرات نے کہا کہ ہم لوط کی قوم پر جا رہے ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ اس بستی کے اندر لوط بھی ہیں، کیسے ہلاک کروگے؟ ”قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا“ (سورۃ العنکبوت آیۃ ٣٢) کہنے لگے کہ ہم کو معلوم ہے کہ اس میں کون ہے؟ ہم نے لوط علیہ السلام کو وہاں سے نکال دیا ہے۔ لوط علیہ السلام سے کہہ دیا ہے کہ ان کی قوم پر سخت عذاب نازل ہونے والا ہے۔ اس لیے راتوں رات اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جائیں۔ اور جب اس قوم کے اوپر عذاب آ جائے تو پلٹ کر نہ دیکھیں۔ عذاب اتنا سخت ہوگا کہ اگر کسی نے پلٹ کر دیکھ لیا تو وہ بھی اس میں گرفتار ہو جائے گا۔ چنانچہ لوط علیہ السلام اپنے گھر والوں کو لے کر باہر نکلے اور تاکید کر دی کہ ’پیچھے چاہے جتنا ہنگامہ ہو، لوگوں کے رونے چلانے اور فریاد کرنے کی آوازیں آئیں لیکن خبردار! کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے۔‘ لوط علیہ السلام اپنے گھر والوں کو لے کر جا رہے ہیں اور پیچھے عذاب آنا شروع ہوگیا۔ عذاب کیا تھا، اللہ اکبر! اللہ حفاظت فرمائے۔ پہلے تو حضرت جبرئیل نے سب کی آنکھوں پر اپنا پَر مار دیا، سب اندھے ہوگئے۔ چہرہ تختہ کے مانند سپاٹ ہوگیا، اس کے بعد دوسری صورت یہ ہوئی کہ حضرت جبرئیل نے وہاں کی زمین اکھاڑ دی۔ جتنی زمین پر وہ قوم آباد تھی پورے شہر کو انھوں نے اکھاڑ لیا اور اوپر لے جا کر الٹ دیا اور صرف الٹا ہی نہیں بلکہ اس کے بعد اوپر سے پتھراؤ شروع ہوگیا۔ آسمان سے بہت بڑے بڑے پتھر برسنے لگے۔ ان پتھروں پر نشانات لگے ہوئے تھے یعنی وہ پتھر عام دنیا کے نہیں تھے بلکہ وہ براہ راست اللہ کی طرف سے تھے۔ جس کے جسم پر وہ پتھر لگا، بالکل ریزہ ریزہ اور گل کر ختم ہوگیا۔ یہاں حکم تھا کہ پیچھے لوگ بہت چلائیں گے، فریاد کریں گے۔ چنانچہ جب عذاب آیا تو ہنگامہ شروع ہوا، فریاد ہونے لگی، حضرت لوط علیہ السلام نے منع کر رکھا تھا کہ خبردار! پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا لیکن حضرت لوط کی بیوی جو اُن کے ساتھ نہ تھی، کافر تھی، وہ بار بار مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ حضرت

لوط علیہ السلام نے اس کو منع کیا لیکن اس نے نہیں مانا۔ بس ایک پتھر اس کو بھی آ کر لگا اور وہیں مرگئی۔ لوط علیہ السلام ساتھیوں کو ساتھ لے کر چل دیے۔ آج بھی وہ جگہ غیر آباد ہے۔ دنیا میں وہ جگہ موجود ہے بلکہ جن جن قوموں پر عذاب آیا ہے وہ سب جگہیں موجود ہیں لیکن آج اس جگہ آبادی نہیں ہے۔ چوں کہ اللہ کے عذاب کا اثر اب بھی موجود ہے۔

مُعذَّب جگہوں سے احتیاط:

نبی کریم ﷺ جب غزوہ تبوک میں تشریف لے جا رہے تھے تو اس علاقے سے گزرے جس میں قومِ ثمود پر عذاب آیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ ’لوگو! یہ وہ جگہ ہے جہاں اللہ کا عذاب آیا ہے، اس لیے سر جھکائے ہوئے روتے ہوئے استغفار کرتے ہوئے یہاں سے گزر جاؤ، جتنی جلد گزر سکو گزر جاؤ، اس لیے کہ یہ جگہ مُعذَّب ہے، یہاں اللہ کا عذاب آیا ہے۔ یہاں کی کوئی چیز استعمال نہ کی جائے، نہ یہاں کا پانی پیا جائے اور نہ یہاں کی کوئی چیز لی جائے، گزرتے ہوئے چلے جاؤ۔‘ چنانچہ لوگ گزرتے چلے گئے۔ ایک صحابی تک اس کی خبر نہ پہنچ سکی کہ یہاں کی کسی چیز کے استعمال سے اللہ کے رسول ﷺ نے منع کیا ہے، انھوں نے پانی لے لیا اور جہاں لشکر نے پڑاؤ ڈالا تو انھوں نے اس پانی سے آٹا گوندھ لیا اور روٹی پکائی۔ اس کا ایک ہی لقمہ کھایا تھا کہ پیٹ میں شدید درد شروع ہوگیا۔ ہزاروں سال پہلے عذاب آیا تھا لیکن اس عذاب کا اثر ابھی تک پانی میں موجود تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے چین ہوگئے، کوئی دوا کارگر نہیں ہو رہی تھی، کوئی علاج کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ ایسے مواقع پر لوگ رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کی خدمت میں خبر گئی۔ آپ نے پوچھا کہ ’وہاں کا پانی تو نہیں لے لیا تھا؟‘ کہا ’جی پانی لے لیا تھا۔‘ فرمایا ’اسے کیا کیا؟‘ کہا ’آٹا گوندھ لیا اور روٹی پکالی۔‘ فرمایا کہ ’بس یہی بات ہے۔‘ آپ ﷺ نے فوراً کچھ پانی لے کر اپنا جھوٹا اور ہاتھ ڈال کر دیا کہ اس کو پی لو۔ چنانچہ انھوں نے اس کو پیا اور ٹھیک ہوگئے۔ نبی کریم ﷺ کے دستِ شفا سے سکون حاصل ہوا، ورنہ تو تڑپ ہی رہے تھے۔

یہ ایام اللہ ہیں، یہ اللہ کی تاریخیں ہیں کہ اللہ اپنے بندوں کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے۔ جنھوں نے سرکشی کی ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اور جنھوں نے اطاعت کی ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں ”وذکرھم بایام الله“ کہ اللہ کے ایام سے ڈراؤ، لوگوں کو سناؤ کہ دیکھو فلاں قوم پر عذاب آیا اور فلاں قوم نے مانا تو اللہ نے اس کو اتنا نوازا کہ سارے عالم پر فضیلت دی۔ جس نے مانا اس کو ہر طرح کے انعام و اکرام سے نوازا، جس نے نہیں مانا اس کو تباہ برباد کردیا۔ شاید کہ لوگوں کو نصیحت ہو۔

فرمایا کہ ”وَاِذْ قَالَ مُوْسَی لِقَوْمِهٖ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجَاكُمْ مِنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآئَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآئَكُمْ“۔ جب موسی نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! اللہ کے احسان کو اپنے اوپر یاد کرو، خدا نے کتنا بڑا احسان تم پر کیا کہ تم کو فرعون سے نجات دی کہ وہ تم کو سخت عذاب میں مبتلا کیے ہوئے تھا کہ تمھارے یہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا تو اگر لڑکا ہوتا تو اس کو ذبح کردیتا اور لڑکیاں پیدا ہوتیں تو زندہ باقی رکھتا۔

بنی اسرائیل پر خدا کا عظیم احسان:

آپ ایک لمحہ کے لیے سوچیے کہ بنی اسرائیل پر جو مصیبت آئی تھی اس مصیبت کا ایک حصہ بھی اگر ہم پر آجائے تو کیا حال ہو؟ بنی اسرائیل کی مصیبت اتنی سخت تھی کہ گھر میں بچہ پیدا ہو رہا ہے، خوشی منانے کا موقع ہے لیکن وہاں لوگ سہمے رہتے تھے، ڈرے رہتے تھے، پولیس گشت کرتی تھی اور جہاں کوئی لڑکا پیدا ہوا پولیس اٹھا لے جاتی اور باہر لے جا کر ذبح کردیتی۔ ماں باپ کی آنکھوں کے سامنے بچوں کو ذبح کردیا جاتا۔ لڑکیاں پیدا ہوتیں تو چھوڑ دیا جاتا۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ موسی نے کہا کہ اللہ نے تم کو اس سخت عذاب سے نجات دی، اس کو یاد کرو۔ چنانچہ موسی علیہ السلام کے آجانے کے بعد فرعون کی پوری حکومت غرق ہوگئی، اس کی پوری قوم ڈوب گئی اور موسی علیہ السلام اور ان کی قوم کو نجات مل گئی۔ اللہ کا کس قدر عظیم احسان ہے کہ اتنے شدید عذاب سے بغیر لڑے

بھڑے نجات دیدی۔ بنی اسرائیل میں لڑنے کی طاقت نہیں تھی۔ اللہ نے اپنے خاص فضل وکرم سے لڑائی نہیں ہونے دی۔ بس موسی علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اپنی قوم کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ وہ باہر نکلے، فرعون نے پیچھا کیا، سامنے دریا ہے پیچھے دشمنوں کا لشکر ہے۔ بنی اسرائیل کے لوگ گھبرا گئے کہ اب تو ہم لوگ پکڑے گئے۔ حضرت موسی نے فرمایا” كَلَّا اِنَّ مَعِىَ رَبِّى سَيَهۡدِيۡنِ“ ہرگز نہیں میرے ساتھ میرا رب ہے جو مجھے ہدایت دے رہا ہے۔ مجھے سیدھا راستہ دکھلا رہا ہے۔ حکم ہوا” فَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰۤى اَنِ اضۡرِبۡ بِّعَصَاكَ الۡحَجَرَ“ (سورة الشعراء آية ٦٢، ٦٣) ہم نے کہا اپنے ڈنڈے کو دریا پر مارو۔ دریا پر ڈنڈا مارا، بارہ راستے پھوٹ گئے اور بنی اسرائیل کے تمام لوگ پار ہوگئے۔ فرعون بھی اس خوشی میں چلا کہ راستہ موجود ہے لیکن بیچ دریا میں پہنچا تھا کہ اللہ نے دریا کو حکم دیا کہ مل جاؤ، دریا مل گیا، وہ سب ڈوب گئے، کوئی نہیں بچا۔ اور پھر مصر سے فرعون کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ تو اللہ نے بغیر کسی لڑائی کے موسی علیہ السلام کے ذریعے بنی اسرائیل کو نجات دیدی۔ اب سوچیے کہ کتنا بڑا احسان کیا۔ فرمایا کہ ”وَفِىۡ ذٰلِكُمۡ بَلَاۤءٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَظِيۡمٌ“ (سورة البقرة آية ۴۹) اور یہ تمھارے رب کی طرف سے ایک بہت بڑی آزمائش تھی۔

شکرگزاری پر افزونیِ نعمت کا وعدہ:

آگے جو بات بیان کررہے ہیں اسی کو بیان کرنا مقصود ہے۔ اللہ نے جب اتنا احسان کیا تو اس سلسلے میں رب کے حضور بندوں کی جانب سے کیا پیش کش ہونی چاہیے؟ موسی علیہ السلام اپنی قوم سے فرماتے ہیں ”وَاِذۡ تَاَذَّنَ رَبُّكُمۡ لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ وَلَئِنۡ كَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِىۡ لَشَدِيۡدٌ“ اور تمھارے رب نے یہ اعلان کردیا ہے کہ تم میری نعمتوں کی قدردانی کروگے، میرے احسانات پر شکریہ ادا کروگے تو میں تم کو اور زیادہ دوں گا۔ اگر تم ناشکری کروگے تو میرا عذاب بڑا سخت ہے۔ کیا عذاب ہے؟ نہیں بتایا۔ آگ میں جلاؤں گا، جہنم میں ڈالوں گا، فرشتوں کے ذریعہ عذاب دلواؤں گا، دشمنوں کو تم

پر مسلط کر دوں گا، دشمن تمھیں اسی دنیا میں عذاب چکھائیں گے، کیا کریں گے؟ اللہ نے اس کی تفصیل نہیں بیان کی لیکن اجمالاً یہ بیان کر دیا کہ میرا عذاب سخت ہے۔ یہ عذاب دنیا میں بھی آ سکتا ہے یہ عذاب آخرت میں بھی ہو سکتا ہے۔

بنی اسرائیل کا کفرانِ نعمت:

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے کہہ رہے ہیں ’دیکھو! اتنا احسان اللہ نے تمھارے اوپر کیا، ان کے احسانات کی قدر کرو‘ لیکن بنی اسرائیل نے کیا کیا؟ وہ بھی سن لیجیے۔ بنی اسرائیل نے اس نعمت کی قدر نہیں کی اور حد کر دی ناقدری کی۔ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر مصر سے باہر چلے گئے۔ ان کو حکم ہوا کہ تم کوہ طور پر آ جاؤ، تاکہ ہم تم کو کتاب دیدیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے دربار میں حاضری کے لیے چلے گئے اور قوم کو پیچھے چھوڑ دیا۔ قوم سے کہا کہ ’تم لوگ آتے رہو، میں چلتا ہوں‘ ان کی قوم میں ایک شخص سامری نام کا تھا، اس نے گائے کا بچھڑا بنالیا اور اس کی پوجا شروع کرا دی اور کہنے لگا کہ ’یہی خدا ہے، یہی پروردگار ہے‘ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اطلاع ہوئی تو وہ تشریف لے آئے۔ نبی کی موجودگی میں اس قوم نے ناشکری کی انتہا کر دی۔ اللہ کے اس عظیم احسان کی کس قدر ناقدری کی کہ کفر و شرک میں مبتلا ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں ان پر سخت عذاب مسلط کیا گیا کہ ’خود اپنے ہاتھوں سے اپنے بھائیوں کو قتل کرو‘ جس نے بچھڑے کی پوجا کی ہے وہ قتل کر دیا جائے اور قتل کرنے والا وہ آدمی ہوگا جس نے پوجا نہ کی ہوگی۔ چنانچہ بہت سے لوگ قتل کر دیے گئے لیکن یہ قوم اب بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام سمجھا رہے ہیں کہ ’اللہ تعالیٰ نے ارضِ مقدس یعنی فلسطین کو تمھارے حق میں لکھ دیا ہے۔ میری اطاعت کرو اور اس میں داخل ہو جاؤ۔‘ وہ کہنے لگے کہ ”قَالُوا يَا مُوسىٰ اِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ “اے موسیٰ! اس میں بڑے زبردست لوگ ہیں۔ ”وَاِنَّا لَنْ نَدْخُلَهَا حَتَّى يَخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنْ يَخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دَاخِلُوْنَ“ (سورة المائدة آية ۲۲) ہم تو اس بستی میں نہیں داخل ہوں گے جب تک یہ نکل نہ جائیں۔ اگر وہ

نکل جائیں تب ہم داخل ہوں گے۔ خیال تھا کہ جیسے مصر سے ہم کو نکال دیا گیا اور فرعون کو بغیر لڑے ہوئے ہلاک کر دیا گیا تھا، اسی طرح اس قوم کو بھی بغیر لڑے ہلاک کر دیا جائے، تب ہم اس میں داخل ہوں۔ اللہ کا حکم تھا کہ نہیں تم کو خود جہاد کرنا ہے، خود کچھ محنت کرنی ہے، خود کوشش کرنی ہے اس لیے جاؤ جہاد کرو۔ لیکن ان لوگوں نے کہا کہ 'ہم نہیں جائیں گے۔' یہاں تک حد کر دی کہ سمجھانے کے بعد کہنے لگے کہ " قَالُوا يَا مُوسَى اِنَّا لَنُ نَدُخُلَهَا اَبَدًا مَا دَامُوا فِيُهَا فَاذُهَبُ اَنُتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّاهَاهُنَا قَاعِدُونَ" (سورة المائدة آية ۲۴) اے موسی! ہم اس وقت تک اس میں داخل نہیں ہوں گے جب تک یہ قوم اس میں ہے۔ آپ جائیں اور آپ کا رب جائے، ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔ موسی علیہ السلام اپنی قوم سے عاجز آ گئے، ان کی ناقدری سے تنگ آ گئے۔ ان کے ذریعہ اس قوم پر کتنا بڑا احسان ہوا تھا، یہ اللہ کے پیغمبر ہیں۔

قوم کے لیے اعزاز کی بات:

کسی بھی قوم میں پیغمبر پیدا ہو جائے، یہ اس قوم کے لیے اعزاز اور بہت زیادہ خوش قسمتی کی بات ہے۔ کسی قوم میں اللہ والے پیدا ہو جائیں تو یہ اس قوم کے لیے کتنی بڑی فضیلت کی چیز ہے۔ کسی قوم میں ایک اللہ والا ہوتا ہے اور پوری قوم کا سر بلند ہو جاتا ہے۔ آج ہم اہلِ مکہ کا احترام کرتے ہیں، دل سے احترام کرتے ہیں ان کو پیشوا مانتے ہیں، بڑا مانتے ہیں، ان کو اللہ کا پڑوسی قرار دیتے ہیں، کیوں؟ اس لیے اس قوم میں ایک نبی پیدا ہوئے ہیں، جن کی امت میں ہم بھی ہیں۔ لیکن ان کو قربت زیادہ تھی اس لیے ہمارے نزدیک وہ بہت معزز ہیں۔ ان کی برائیاں بھی ہم بیان کرنا جائز نہیں سمجھتے، اس لیے کہ وہ اللہ کے پڑوسی ہیں، نبی ﷺ کے قریبی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی بخشش ہو جائے اور ہماری پکڑ ہو جائے۔ خوب سمجھ لیجیے کہ کسی قوم میں نبی پیدا ہو جائیں، کسی قوم میں اللہ والے پیدا ہو جائیں، کسی قوم میں بزرگ پیدا ہو جائیں تو یہ اس قوم کے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔

بنی اسرائیل کے کفرانِ نعمت کی انتہا:

بنی اسرائیل کے اعزاز کے لیے یہ کیا کم تھا کہ موسی علیہ السلام پیدا ہوئے لیکن اس قوم نے بھی حد کردی۔ موسی علیہ السلام کہہ رہے ہیں کہ ’چلو اللہ تم کو فتح دیں گے۔‘ لیکن یہ لوگ مان کے نہیں دے رہے ہیں۔ بات یہ تھی اس میں بنی اسرائیل کی آزمایش تھی۔ جس قوم سے جہاد کا حکم ہورہا تھا وہ ظاہراً ایک طاقت ور قوم تھی۔ یہ لوگ ان کے ظاہری ڈیل ڈول اور تن وتوش کو دیکھ کر ڈر گئے تھے۔ لیکن بنی اسرائیل میں دو آدمی جو اللہ سے ڈرتے تھے، انھوں نے ترغیب دی کہ دروازے سے داخل ہو جاؤ، کچھ نہیں کرنا پڑے گا، مگر ان بزدلوں نے صاف انکار کر دیا کہ ’جب تک یہ لوگ اس میں رہیں گے، ہم نہیں جائیں گے۔ تم اور تمھارا رب جائے، ہم یہیں بیٹھے تماشہ دیکھیں گے۔‘ موسی علیہ السلام پر اس وقت کیا گزری ہوگی! عاجز ہو کر فرمایا ”قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَا اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِیْنَ “(سورۃ المائدۃ آیۃ ۲۵) کہ اے میرے پروردگار! میں اپنا اور اپنے بھائی کے علاوہ کسی کا مالک نہیں۔ میرا بس اپنے اوپر ہے، اپنے بھائی ہارون کے اوپر ہے، باقی ساری قوم باغی اور سرکش ہو چکی ہے۔ لہٰذا ان سے ہم کو ہٹا لیجیے، ان سے ہم کو دور کر دیجیے۔ اللہ نے فرمایا ’قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِیْنَ“ (سورۃ المائدۃ آیۃ ۲۶) کہ یہ چالیس سال تک اپنے گھر نہیں آسکتے، زمین میں گھومتے رہیں گے، پریشان رہیں گے، اس فاسق قوم کے اوپر افسوس مت کرو۔ اب ہماری طرف سے ان کے اوپر دوسری طرح کا عذاب مسلط ہو رہا ہے۔

بنی اسرائیل پر اللہ کا عذاب:

چنانچہ ایک لمبے چوڑے میدان میں جو تقریباً ۲۷ میل چوڑا تھا، اس میں یہ قوم محصور ہو کر رہ گئی۔ ان کی تعداد اس وقت چھ لاکھ تھی، کوئی دیوار یا کوئی رکاوٹ نہیں تھی، لیکن دن بھر چلتے تھے کہ اس سے نکل جائیں، شام کو پتہ چلتا کہ وہیں ہیں۔ چالیس سال

روزانہ یہ قوم نکلنے کی کوشش کرتی رہی اور حیران وسرگرداں رہی، یہاں تک کہ اس زمانہ کے جتنے سرکش لوگ تھے، سب مرگئے۔ موسی علیہ السلام نے دعا کی کہ ’اے پروردگار! ہمارے اور اس قوم کے درمیان تفریق پیدا کردیجیے۔‘ چنانچہ اسی میدان میں موسی علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام بھی دنیا سے تشریف لے گئے۔ یہ حضرات تو اس پاجی قوم سے نجات پاکر پروردگار کے حضور حاضر ہوگئے اور قوم میں جتنے شریر وسرکش تھے سب مرکر ختم ہوگئے۔ جو پہلے بچے تھے اب وہ جوان ہوگئے۔ ان کو اس بات کا احساس تھا کہ ہمارے باپ دادوں نے کام بگاڑا ہے، ہم ایسا نہیں کریں گے۔ ان لوگوں نے اطاعت کی، فرماں برداری کی، توبہ واستغفار کی اور معافی مانگی۔ چنانچہ حضرت یوشع علیہ السلام جو موسی علیہ السلام کے بعد نبی ہوئے، ان کی اطاعت کی اور چالیس سال کے بعد جہاد کے لیے نکلے اور جہاد کیا تو اللہ تعالی نے ان کو فتح دلائی۔

کامرانی کا مدار اطاعت پر ہے:

جب مانا تو اللہ نے فتح نصیب کی اور نہیں مانا تو ۲۷؍میل کے ایک میدان میں ایسا گھمایا کہ حیران وسرگرداں ہوکر اس میں مرمرا کر ختم ہوگئے۔ الغرض جس قوم نے موسی علیہ السلام کی قدر نہیں کی، خدا کے انعام واحسان کی قدر نہیں کی، تو کیسا اس قوم کو تباہ و برباد کرڈالا۔ بھٹکا دیا دھتکار دیا۔ یہی کیفیت ان کی بعد میں بھی رہی۔ حضرت عیسی علیہ السلام آئے تب بھی گڑبڑ کرتے رہے۔ نبی کریم ﷺ تشریف لائے تب بھی گڑبڑ کرتے رہے۔ اس لیے قیامت تک کے لیے ان پر لعنت کی مہر لگادی گئی۔ آج وہ دنیا کی سب سے ذلیل ترین قوم ہے، سب سے بے عزت قوم ہے، سب سے کمینی قوم ہے۔ اس وجہ سے کہ اس نے نعمتوں کی قدر نہیں کی۔

قانونِ قدرت:

اللہ نے فرمایا ’’لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ‘‘ اگر تم شکر کروگے تو میں بڑھاؤں گا اور اگر ناقدری کروگے، ناشکری کروگے تو میرا عذاب سخت ہے۔ یہ اللہ کا اٹل قانون ہے کہ نعمت کی جتنی قدردانی ہوگی، اتنی بڑھے گی پھلے گی

پھولے گی، اور اگر ناقدری اور ناشکری شروع ہوگئی تو جو ہے وہ بھی چھن جائے گی اور ناقدری کا جو عذاب ہوگا وہ الگ۔

اللہ تعالیٰ ہم سب لوگوں کو نعمتوں کی صحیح قدر کرنے کی توفیق دے اور شکر گزاری کا عادی بنائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمين

* * *

ابدال کا تعارف اور ان کی صفات

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہ وَنَسْتَعِيْنُه وَنَسْتَغْفِرُہ وَنُوْمِنُ بِه وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْه وَ نَعُوْذُ بِاللّٰه مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن يَّهْدِه اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَه وَ مَن يُّضْلِلْه فَلَا هَادِىَ لَه۔ وَنَشْهَدُ اَن لَّآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَه لَا شَرِيْكَ لَه وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مَحَمّداً عَبْدُہ وَرَسُوْلُه اَرْسَلَه بِالْحَقِّ بَشِيْراً وَنَذِيْراً ۔ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْه وَعَلٰى آلِه وَاَصْحَابِه وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً۔ اَمَّابَعْدُ:

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ صَامِتٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْاَبْدَالُ فِیْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ ثَلَاثُوْنَ رَجُلاً قُلُوْبُهُمْ عَلٰى قَلْبِ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلِ الرَّحْمَانَ كُلَّمَا مَاتَ مِنْهُمْ رَجُلٌ اَبْدَلَ اللّٰهُ مَكَانَهُ رَجُلًا۔ او كما قال عليه الصلوة السلام (مسند الامام احمد)

ایک دن میں نے کسی مناسبت سے ذکر کیا تھا کہ اس امت میں ابدال ہوتے ہیں اور یہ بھی کہا تھا کہ کبھی ان کا تذکرہ کروں گا۔ میرے ذہن میں تھا کہ ابدال کے سلسلے میں کچھ بتانا چاہیے، اس لیے نہیں کہ ابدال کو ہم ڈھونڈھیں۔ وہ تلاش کرنے سے نہیں ملتے، بس اتفاق سے کبھی کسی کو مل جاتے ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ ابدال کی جو صفت رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہے وہ صفات اختیاری ہیں اور وہ صفات اللہ کو پسند ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ایک خاص مرتبہ انسانوں کو عطا فرماتے ہیں جن کے لیے رسول اللہ ﷺ نام تجویز فرمایا ہے ''اَبدال''۔ یہ اولیاء اللہ میں سے بڑے درجہ کے اولیا کی جماعت ہے۔

اس امت کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں ہر زمانہ اور ہر دور میں بڑے بڑے اولیا رہے ہیں اور رہیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی ان کا اظہار ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا ہے۔ لوگ جب طالب ہوتے ہیں اور تلاش کرتے ہیں تو اللہ تعالی ظاہر فرما دیتے ہیں اور اگر لوگ بے نیاز ہو جاتے ہیں، لوگوں کو فکر نہیں ہوتی، اپنی اپنی دنیا میں مست رہتے ہیں تو اللہ تعالی اپنے اولیا کو چھپا دیتے ہیں۔ اور یہ اخفا اللہ کا ان پر بڑا احسان ہوتا ہے۔ قیامت کے دن بعض اولیا سے کہا جائے گا کہ ’میرا تم پر احسان رہا ہے کہ میں نے تم کو لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ رکھا‘ لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ رہنے کی وجہ سے وہ فتنوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

اولیاء اللہ کو ستانے کا انجام:

لیکن بہر حال امت کے لیے بھلائی کی بات یہ ہے کہ اولیاء اللہ ظاہر ہوں، تا کہ ان سے فایدہ اٹھایا جا سکے۔ اگر ظاہر نہ ہوں تو بجائے فایدہ کے امت نقصان میں پڑ جاتی ہے۔ اس لیے کہ جو اللہ کا ولی ہوتا اور برگزیدہ بندہ ہوتا ہے، وہ اچھا اور نیک بندہ ہوتا ہے، اللہ کے یہاں اس کا مرتبہ ہوتا ہے مگر لوگ نہ پہچاننے کی وجہ سے ان کے ساتھ کبھی بدتمیزی اور گستاخی کر دیتے ہیں تو اللہ تعالی اس کا انتقام خود اس قوم سے لیتا ہے۔ جب بھی کسی اللہ والے کو کوئی قوم ستاتی ہے وہ ضرور تباہی میں پڑتی ہے اور اسی دنیا کے اندر تباہی میں پڑتی ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں کہ:

ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد
تا دلے صاحب دلے نالد بدرد

کوئی قوم اس وقت تک رسوا نہیں ہوتی، ذلیل نہیں ہوتی جب تک کسی صاحبِ دل کے دل کو درد نہ پہنچا دے۔

کتنی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگ کسی کو ستاتے رہتے ہیں، کسی کو تکلیف پہنچاتے رہتے ہیں اور پھر بعد میں اس کا خمیازہ بہت دن تک بھگتتے ہیں۔ مجھے ایک بستی میں جانے

کا اتفاق ہوا۔ آج سے تقریباً بائیس سال پہلے کی بات ہے۔ اس بستی میں خاص بات لوگوں نے یہ بتلائی کہ یہاں لا ولد بہت ہو رہے ہیں۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو لا ولد ہیں۔ مجھے تشویش ہوئی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کئی لوگ جو لا ولد تھے میرے جاننے والوں میں سے تھے۔ میں وجہ کی تلاش میں پڑا تو معلوم ہوا کہ یہاں ایک بزرگ آئے تھے اور ان سے یہاں کے لوگوں نے کافی گستاخی کا معاملہ کیا تو وہ ناراض ہوگئے تھے اور کچھ کہہ دیا تھا۔ اس کا اثر شاید رہا ہو، معلوم نہیں کہ اسی کے اثر سے ہے یا نہیں مگر شاید اسی کا اثر ہو۔ میں نے کہا کہ 'اب وہ بزرگ تو دنیا میں نہیں رہے مگر ان کی قبر کہاں ہے بتاؤ۔' لوگوں نے بتائی تو میں نے کہا کہ 'چلیے ان کی قبر پر چلتے ہیں، ان کے لیے دعاے مغفرت کرتے ہیں، ایصال ثواب کرتے ہیں اور اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اگر انھیں بزرگ کی ناراضگی کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے تو ان کو راضی کر دیجیے، تاکہ بات ختم ہو جائے۔ ورنہ تو کچھ دنوں میں آبادی ہی ختم ہو جائے گی۔' ہم لوگ وہاں گئے، ایصال ثواب کیا، دعا کی۔ میرے قریبی لوگوں میں سے ایک صاحب اسی بستی کے تھے، وہ بھی لا ولد تھے اور بہت پریشان تھے۔ ان کی وجہ سے مجھے بھی تشویش رہا کرتی تھی مگر ایصال ثواب و دعا کے بعد ان کو اولاد ہوگئی تو مجھے بھی اطمینان ہوا اور وہ بھی پر سکون ہوگئے۔ اب کیا حال ہے مجھے نہیں معلوم۔

بزرگوں کی دعا کا اثر:

ایسا ہوتا ہے کہ کبھی کسی کی دعا لگ جاتی ہے اور اس کا اثر بہت دنوں تک رہتا ہے اور کبھی بد دعا لگ جاتی ہے تو اس کا بھی اثر برسوں تک رہتا ہے۔ جون پور میں ایک گاؤں ہے 'سُونگر'۔ میرے کچھ شاگرد وہاں کے ہیں۔ وہاں بہت پہلے تقریباً آج سے چھ سات سو سال پہلے ایک نابینا بزرگ جا رہے تھے۔ وہ بزرگ 'بینائے دل' کہلاتے تھے۔ بینائے دل اس وجہ سے کہلاتے تھے کہ ان کی آنکھ نہیں تھی مگر دل کی آنکھ سے دیکھتے تھے۔ ان کی آنکھ کا ڈھیلا سرے سے تھا ہی نہیں، چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ اس لیے ان کو دیکھ کر لوگ ڈر جاتے تھے، لیکن تھے بہت بزرگ، اللہ والے۔ ایک گاؤں ہے 'سُر ہُر پور' وہیں کے

رہنے والے تھے، معلوم نہیں اب وہ گاؤں ہے کہ نہیں؟ وہ ایک مرتبہ ایک گاؤں کے پاس سے گزر رہے تھے تو انھیں پیاس محسوس ہوئی۔ گاؤں والوں سے کہا کہ 'پانی ملے گا؟' تو بجائے اس کے کہ گاؤں والے ان کو پانی دیتے، ان کو دیکھ کر گھبرا گئے یا ڈر گئے یا محض گستاخی میں کہہ دیا کہ 'نہیں نہیں یہاں پانی نہیں ہے، جایئے۔' انھوں نے کہا کہ ٹھیک ہے 'پانی نہیں ہے تو پانی نہیں رہے گا۔' یہ کہہ کر چلے گئے۔ اس گاؤں میں آج تک پانی نہیں ہے۔ کوئی کنواں ٹھیک سے پانی نہیں دیتا، بڑی محنت سے، بہت کھدائی کے بعد پانی نکلتا ہے۔

آگے بڑھے، ایک اور گاؤں کے قریب پہنچے، کچھ آواز محسوس ہوئی تو رُکے۔ وہاں کچھ عورتیں جانور چرا رہی تھیں۔ ان سے کہا کہ 'پیاس بہت لگی ہے پانی مل جائے گا؟' عورتوں نے تعجب سے دیکھا اور کہا کہ 'بابا! بیٹھیے، پانی کیا دودھ بھی ملے گا۔' عزت سے بیٹھایا اور دودھ لاکر دیا۔ یہ بہت خوش ہوئے اور پوچھا کہ کون گاؤں ہے؟ معلوم ہوا کہ دریاپور ہے۔ کہا 'اچھا دریا ہے تو دودھ کا دریا بھی یہی ہے۔' اس گاؤں کا تجربہ یہ ہے کہ اگر کوئی گائے یا بھینس دو کلو دودھ دیتی ہے تو اگر اس گاؤں میں جانور کو لے جائیں تو سوا دو کلو دودھ ضرور ہو جائے گا۔

دریاپور سے آگے بڑھے تو سونگر پہنچے۔ یہ گاؤں پسند آیا تو یہیں رہ گئے۔ سونگر والوں نے ان کی بہت خدمت کی، وہاں ان کی خانقاہ بھی بن گئی، تیس چالیس سال تک وہاں رہے۔ وہاں ایک سانپ ہوتا ہے جس کو 'چیتر' کہتے ہیں۔ اب بھی ہوتا ہے، بہت زہریلا سانپ ہوتا ہے۔ ایک دن مسجد یا خانقاہ سے نکل رہے تھے، جوتا پہن رہے تھے کہ کسی نے آواز دی کہ 'بابا! چیتر ہے چیتر ہے جوتے میں۔' جوتا جھاڑ کے کہا کہ 'چیتر کیا ہے کیچوا ہے کیچوا۔' اس کے بعد سے اس گاؤں میں یہ سانپ آج تک کیچوا ہے۔ چیتر اس گاؤں میں بالکل نہیں کاٹتا۔ اور یہ بھی تجربہ ہے کہ اس گاؤں کے باہر اگر کسی کو چیتر نے کاٹ لیا تو اس کا بچنا مشکل ہے لیکن اگر زہر پھیلنے سے پہلے وہ مارگزیدہ سونگر میں آ گیا تو

بچ جائے گا۔

میں بھی گیا تھا اس گاؤں میں تو کچھ لوگ اس سانپ کو پکڑ کر میرے پاس بھی لائے تھے۔ مجھے تو بڑی گھن آئی اس کو پکڑنے میں۔ لوگوں نے کہا بھی ’لیجیے پکڑیے!‘ مگر میں نے کہا کہ ’اگر یہاں نہیں کاٹتا تو اِس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس کو کھیل بنا دیا جائے۔‘ وہاں کے لوگوں کو کاٹتا ہی نہیں اور اگر کاٹ بھی لے تو کچھ نہیں ہوتا۔ یہ ایک بزرگ اللہ والے کی دعا کا اثر ہے۔

میں جب دیوبند پڑھتا تھا تو وہاں بچھو بہت نکلتے تھے۔ مگر کبھی کسی کو ڈنک نہیں مارتے تھے۔ ہمارا ایک ساتھی بقرعید کی چھٹی میں گھر سے آیا، جاڑے کا موسم تھا، بستر جھاڑے بغیر سو گیا۔ صبح اٹھا تو دیکھا کہ بستر پر تین بچھو مرے ہوئے پڑے تھے مگر ڈنک نہیں مارا۔ ہم لوگوں نے مفتی محمود صاحب سے ایک مرتبہ پوچھا تھا کہ ’یہاں بچھو بہت ہیں مگر ڈنک نہیں مارتے؟‘ تو فرمایا کہ ’فلاں بزرگ کی دعا ہے، اس لیے ڈنک نہیں مارتے۔‘ دیوبند میں میں نے کسی کو ڈنک مارتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ بزرگوں کی دعا کے اثرات ہوتے ہیں۔ کسی جگہ کے لوگ تکلیف پہنچا دیتے ہیں تو بہت دنوں تک بھگتتے ہیں اور کسی جگہ کے لوگ آرام پہنچا دیتے ہیں تو قیامت تک اس کا فایدہ اٹھاتے ہیں۔

اللہ والوں کی خدمت کا صلہ:

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ’قیامت کے دن جہنم والوں کی صف لگی ہوگی۔ جنتیوں کو اجازت مرحمت ہوگی کہ دیکھو اگر تمھاری جان پہچان کا کوئی آدمی اس صف میں ہو تو اس کی سفارش کر سکتے ہو، سفارش قبول کی جائے گی۔ سب لوگ ٹہل ٹہل کر دیکھ رہے ہوں گے۔ ایسے میں ایک جنتی ٹہل رہا ہوگا کہ ایک جہنمی آدمی اسے آواز دے گا اور پوچھے گا کہ ’صاحب! آپ مجھے پہچان نہیں رہے ہیں؟‘ جنتی کہے گا کہ ’نہیں، آپ کون ہیں؟‘ جواب ملے گا کہ ’ایک مرتبہ آپ کو بہت پیاس لگی تھی تو آپ نے مجھ سے پانی مانگا تھا تو میں نے آپ کو پانی پلایا تھا۔‘ جنتی کہے گا کہ ’ہاں ہاں مجھے یاد آیا۔‘

(وہاں حافظہ بھی بہت اچھا ہو جائے گا) پھر وہ اس کی سفارش کرے گا اور اسے جہنم سے رہائی مل جائے گی۔ ایک گلاس پانی پلانے کے عوض جہنم سے چھٹی مل جائے گی۔ یہ ہے اللہ والوں کو آرام پہنچانے کا انعام۔ بہت دور تک اس کا فایدہ پہنچتا ہے۔

اہل اللہ میں شامل ہونے کا نسخہ:

ایک عالم سے کسی نے کہا کہ ‘دعا کیجیے کہ میری اولاد بھی عالم بن جائے۔’ انھوں نے فرمایا کہ ‘میں دعا تو ضرور کر دوں گا مگر آپ ایک کام کیجیے کہ علما کی خدمت کیجیے۔ علما کی خدمت جتنی دل سے کیجیے گا آپ کی اولاد میں سے اتنے ہی اچھے عالم نکلیں گے۔’ تو یہ ہے جب کسی اللہ والے کی خدمت کی جاتی ہے تو اللہ تعالی اس کا بدلہ دیتے ہیں اور اگر تکلیف پہنچائی جاتی ہے تو اس کا بھی بدلہ ملتا ہے۔

اہل اللہ کے احترام کا صلہ:

امام محمد کے بارے میں آتا ہے کہ وہ ایک مرتبہ بہتے ہوئے پانی کی نالی پر بیٹھے وضو کر رہے تھے۔ ان سے آگے ایک شخص اور بیٹھا وضو کر رہا تھا جس کا استعمال کیا ہوا پانی امام صاحب کی جانب بہہ کر آ رہا تھا۔ اس آدمی کی نگاہ پڑی تو اس نے سوچا کہ اتنے بڑے عالم اور اللہ والے اُدھر بیٹھے وضو کر رہے ہیں، میرا استعمال کیا ہوا پانی ان کے پاس بہہ کر پہنچ رہا ہے، وہ اگرچہ پاک ہے مگر مناسب نہیں ہے کہ وہ میرا استعمال کیا ہوا پانی استعمال کریں۔ بس وہ آدمی آہستہ سے اٹھا اور بغیر کچھ کہے دوسری سمت جا کر بیٹھ گیا جدھر امام صاحب کا استعمال کیا ہوا پانی آ رہا تھا۔ اس نے امام صاحب کی اتنی تعظیم اور ادب کیا، اس کی وجہ سے اس کی بخشش ہوگئی۔ جب وہ مرا تو کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ ‘کیا ہوا؟’ کہا کہ ‘جو امام صاحب کے ساتھ احترام کا معاملہ کیا تھا، اسی کی وجہ سے بخش دیا گیا۔’

اہل اللہ کے ساتھ گستاخی کا انجام:

اللہ نے اس امت کو بہت زرخیز بنایا ہے۔ اس میں بہت بڑے بڑے اللہ کے

ولی ہیں۔ ایسے ایسے ہیں کہ آدمی اندازہ نہیں کرسکتا، پہچان نہیں پاتا۔ ایک بزرگ تھے شیخ عبدالحق صاحب، بوڑھے آدمی تھے۔ ان کو ایک آدمی گالی دے رہا تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے آدمی سے کہا کہ ’اس کو تھپڑ لگاؤ‘ اس کو بڑا تعجب ہوا کہ کیوں مارنے کو کہہ رہے ہیں؟ ابھی کہہ ہی رہے تھے کہ گالی دینے والا گرا اور مرگیا۔ شیخ عبدالحق صاحب نے فرمایا کہ ’اس کو ایک طمانچہ ماردیے ہوتے تو اللہ کا عذاب رک جاتا۔ یہ مجھے گالی دے رہا تھا، اس لیے اس پر اللہ کا عذاب آیا، جس کو آتے میں دیکھ رہا تھا، اس لیے کہا کہ ’مارو‘۔ اگر مار دیے ہوتے تو عذاب واپس ہوجاتا لیکن تم نے نہیں مارا اور میری طرف سے بدلہ نہیں ہوا، اس لیے اللہ نے انتقام لے لیا‘

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے پاس ایک شیعہ آیا اور مذاق کیا کہ ’سنا ہے کہ آپ کی والدہ زندہ ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان سے میرا نکاح کرادیجیے، میں پیغام لے کر آیا ہوں‘ امام صاحب خود اس وقت بوڑھے ہوچکے تھے مگر ان کی والدہ حیات تھیں۔ امام صاحب نے کچھ کہا نہیں، صبر کیا اور فرمایا کہ ’بھائی! میری والدہ عاقلہ بالغہ ہیں، میں ان سے اجازت لے لوں۔ اگر ان کا مشورہ ہوگا تو کردوں گا‘ اس کی بدتمیزی کو نظر انداز کردیا، صبر کرلیا اور یہ کہہ کر اندر چلے گئے۔ جب باہر نکلے تو وہ مرچکا تھا۔ تو فرمایا کہ ’’قَتلَهٗ صَبرُ اَبِیْ حَنِیفَۃَ‘‘ ابوحنیفہ نے صبر کرلیا اس لیے یہ مرگیا۔

اللہ والوں کو ستانا کبھی بہت جلد نقصان پہنچادیتا ہے۔

ابدال کی صفات:

میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس امت میں ہمیشہ اولیا کی ایک بڑی تعداد رہی ہے۔ ان اولیا میں سے ایک ابدال ہوتے ہیں، جن کا ذکر حدیث شریف میں آیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ’’اَلْاَبْدَالُ فِیْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ ثَلَاثُوْنَ رَجُلًا‘‘ اس امت میں تیس آدمی ابدال رہیں گے۔ ’’قُلُوْبُهُمْ عَلٰی قَلْبِ اِبْرَاهِیْمَ خَلِیْلِ الرَّحْمَانِ‘‘ (اصل یہی مجھے بتانا ہے) ان کا دل ایسا ہوگا جیسا ابراہیم علیہ السلام کا دل ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کا دل کیسا

تھا؟ اس کو یوں سمجھئے کہ ’غزوہِ بدر میں خاصے کفار قید ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے مشورہ کیا کہ ’ان کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیے۔‘ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ ’جتنے قیدی ہیں، سب کسی نہ کسی مسلمان کے رشتہ دار ہیں۔ ہر قیدی کو اس کے رشتہ دار کے حوالے کر دیا جائے کہ وہ اس کو قتل کر دے۔ ایک بھی قیدی کو زندہ رکھنا مناسب نہیں ہے، سب قتل کے مستحق ہیں۔ کیوں کہ ان لوگوں نے بہت مسلمانوں کو ستایا ہے تنگ کیا ہے۔‘ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ ’ان کو قتل نہ کیا جائے بلکہ ان پر کچھ فدیہ لگا دیا جائے اور فدیہ وصول کر ان کو چھوڑ دیا جائے۔ ممکن ہے کہ بعد میں ان کو ایمان کی توفیق ہو جائے۔‘ آپ ﷺ چوں کہ فطرتاً حلیم الطبع تھے، اس لیے آپ ﷺ کو یہ مشورہ بہت پسند آیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ’ابوبکر کی مثال ایسی ہے جیسی ابراہیم علیہ السلام۔ وہ بہت مہربان تھے، کتنا ہی بڑا دشمن ہو، اس کی بھلائی کے لیے اسے معاف کر دیتے تھے۔‘ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ ’ان کی مثال نوح علیہ السلام کی ہے۔‘ نوح علیہ السلام کو بہت دن تک ان کی قوم کے لوگوں نے ستایا تو بڑی سخت بددعا کی، اتنی سخت بددعا کی کہ کسی نبی نے ایسی بددعا نہیں کی۔ ”رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ دَيَّارًا“ (سورة نوح آية ۲۶) پروردگار! زمین پر ایک بھی کافر کو نہ چھوڑیے گا، سب کو ہلاک کر دیجیے گا۔ اسی بددعا کی وجہ سے ایسا طوفان آیا کہ سب ختم ہو گئے۔ بہر کیف دونوں حضرات کا قلب قابلِ تعریف تھا، اس لیے کہ وہ اللہ کے لیے غصہ تھے اور یہ اللہ کے لیے مہربان تھے۔

ابدال جو ہوتے ہیں سراپا خیر ہوتے ہیں۔ ان کے دل میں ہمیشہ نرمی ہوتی ہے۔ ان کے دل میں نہ کینہ ہوتا ہے اور نہ کدورت ہوتی ہے، کسی سے غصہ نہیں ہوتے، ہر ایک کے لیے ان کا دل صاف ہوتا ہے۔ دل کا صاف ہونا کینہ و کدورت سے خالی ہونا یہ اللہ کو اتنا پسند آتا ہے کہ اگر یہ پورے طور سے کسی کو حاصل ہو جائے تو ابدال میں شامل ہو جائے۔ ابدال ہونا کوئی نبوت کا منصب نہیں ہے کہ اب نبوت کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ ابدال ہر زمانہ میں رہتے ہیں۔ جس کا دل اتنا صاف ستھرا ہو گا وہ ابدال میں سے ہو گا۔

"كُلَّمَا مَاتَ مِنْهُمْ رَجُلٌ اَبْدَلَ اللّٰهُ مَكَانَهُ رَجُلًا" جب ان میں سے کوئی آدمی مرجائے گا تو دوسرا آدمی اس کی جگہ لایا جائے گا۔ تیس آدمی ہمیشہ رہیں گے۔ اسی لیے شاید ان کو ابدال کہتے ہیں کہ ایک گیا تو دوسرا اس کی جگہ پر آجاوے گا۔

ابدال کی برکت:

اور فرماتے ہیں "اَلْاَبْدَالُ فِیْ اُمَّتِیْ ثَلَاثُوْنَ، بِهِمْ تَقُوْمُ الْاَرْضُ وَبِهِمْ تُمْطِرُوْنَ وَبِهِمْ تُنْصَرُوْنَ" (مجمع الزوائد) ابدال تیس آدمی ہوتے ہیں اور وہ ایسے بابرکت ہوتے ہیں کہ ان کی وجہ سے زمین قائم ہوتی ہے۔ زمین کی ہریالی وشادابی اور زمین کا قیام انھیں کی برکت سے ہے۔ ان ہی کی وجہ سے بارش ہوتی ہے۔ جب ان کی دعائیں ہوتی ہیں اور اللہ کی رحمت متوجہ ہوتی ہے تو بارش ہوتی ہے۔ "وَبِهِمْ تُنْصَرُوْنَ" اور تمھاری جو مدد ہوتی ہے، وہ انھیں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ کتنے مصایب وتکالیف کو اللہ انھیں ابدال کی دعاؤں کی وجہ سے دور فرماتے ہیں۔

اور فرماتے ہیں "اَلْاَبْدَالُ فِیْ اَهْلِ الشَّامِ" ابدال شام والوں میں سے زیادہ ہوتے ہیں۔ "وَبِهِمْ تُرْزَقُوْنَ" انھیں کے ذریعہ روزی ملتی ہے۔

اور فرمایا کہ "اِنَّ الْاَبْدَالَ بِالشَّامِ وَهُمْ اَرْبَعُوْنَ" (مسند الامام احمد) یہاں فرمایا کہ 'ابدال چالیس ہوتے ہیں' اس پہلے جو حدیث پڑھی گئی اس میں تیس کا تذکرہ ہے۔ دونوں طرح کی روایتیں ہیں۔ "كُلَّمَا مَاتَ رَجُلٌ اَبْدَلَ اللّٰهُ مَكَانَ الرَّجُلِ" جب کوئی مرجاتا ہے تو اس کی جگہ دوسرا لے لیتا ہے۔

ہمارے دیار کے ابدال:

یہ لوگ ہر زمانہ میں ہوتے ہیں۔ ان میں مختلف قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ہمارے ہندوستان میں شاہ عبدالعزیز کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بھی اسی گروہ کے تھے۔ ان لوگوں کے ذریعہ دنیا کا نظام قایم ہوتا ہے۔ اب ان کو کوئی کوئی جانتا ہے جس پر کھل جائے، ورنہ بیشتر لوگ نہیں جانتے۔ جو لوگ جان لیتے ہیں وہ ان سے فایدہ بھی اٹھا

لیتے ہیں۔

ہمارے مولانا یعقوب صاحب نانوتوی جو دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس تھے، وہ بھی اسی گروہ سے تھے۔ ان کو جہاں حکم ہوتا تھا جانے کا وہاں چلے جاتے تھے۔ جہاں جہاں ان کا قدم پڑتا وہاں وہاں آبادی ہوتی چلی جاتی تھی۔ دہلی میں بہت دن تک رہے۔ روزانہ صبح کو نکلتے اور شام کو واپس لوٹ کر آتے۔ ان سے کسی نے پوچھا کہ 'حضرت! کہاں چلے جاتے ہیں؟' تو انھوں نے فرمایا کہ 'مجھے حکم ہوا ہے کہ تم جہاں جہاں جاؤ گے وہاں آبادی ہوگی۔' آج جدھر نئی دلی آباد ہے، اسی طرف جایا کرتے تھے۔ ان کے جانے کی برکت سے پوری نئی دلی آباد ہے۔

یہ لوگ بڑے ہوتے ہیں، اللہ ان سے بڑا کام لیتا ہے۔ ان کی جو صفت حدیث میں بیان کی گئی ہے وہ اختیاری صفت ہے۔ اصل انھیں صفات کا حاصل کرنا اور اپنے اندر ان صفات کا پیدا کرنا ہے۔

اللہ تعالی ہم لوگوں کو ان صفات سے متصف فرمائیں اور بزرگوں اور اولیاء اللہ کے حقوق کو پہچاننے اور ان کی معرفت کی توفیق عطا فرمائیں اور ان سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دیں۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین

❑❑❑

ماہ محرم اور ہمارے اعمال

الحمد لله و كفى سلام على عباده الذين اصطفى۔ اما بعد:

فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمان الرحيم

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ كِتَابِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَا اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ۔ (سوره التوبة آية۳۶)

ترجمہ: مہینوں کی تعداد اللہ کے نزدیک بارہ ہے اللہ کی کتاب میں جس دن اس نے زمین وآسمان پیدا کیے تھے۔ ان میں چار مہینے محترم ہیں۔

حضرات گرامی! عربی مہینے کے اعتبار سے (محرم) سال کا پہلا مہینہ ہے۔ اس مہینے نے آکر ہمیں بتایا کہ ہم اپنی عمر کی ایک اور منزل پیچھے چھوڑ آئے ہیں، شب وروز کی گردش نے ایک سال اور ہم پر گزار دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے ”حَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا“ یعنی یومِ حساب کے آنے سے پہلے ہی اپنے نفس کا حساب کرلو۔ اس دن کے آنے سے پہلے جب خدائے ذوالجلال والاکرام ایک ایک لمحے کا حساب لے گا، اس فرمان کے مطابق ہمیں اپنے بیتے ہوئے لمحات کا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم نے اپنی عمر کے یہ قیمتی بارہ مہینے کس طرح گزارے ہیں؟ کیا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سیکڑوں ہزاروں لمحات ختم ہوکر مٹ گئے؟ اب ان کا کوئی نام ونشان باقی نہ رہا؟ کیا یہ زمانہ کی لمحہ بہ لمحہ گزرتی گھڑیاں معدوم ہوتی جاتی ہیں؟ ان کا کوئی ریکارڈ محفوظ نہیں رکھا جاتا؟ اگر ہم نے ایسا تصور قایم کیا تو یہ ایک خطرناک غلطی ہے۔ قسم خدائے وحدہ لاشریک کی جس کے قبضہ میں ہم سب کی جان ہے، یہ کارخانۂ عالم بے کار نہیں ہے، ہماری گزرتی ہوئی ایک ایک گھڑی کا ریکارڈ محفوظ کیا گیا ہے۔ ”وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِيْنَ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ“

(سورۃ الانفطار آیۃ ۱۰، ۱۱، ۱۲) تمھارے اوپر نگہبان مقرر ہیں جو انتہائی بزرگ ہیں، ایک ایک بات لکھتے ہیں۔ یہاں ہم نے جو کچھ کیا ہوگا، کل وہ پورا دفتر پیش کر دیا جائے گا۔ اس دن کوئی بات نہ بنے گی۔ مجرم انسان چیخ اٹھے گا ”مَا لِ هٰذَاالْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَ لَا كَبِيْرَةً اِلَّا اَحْصَاهَا “(سورۃ الکھف آیۃ ۴۹) یہ کیسی کتاب ہے کہ اس میں کوئی چھوٹی بڑی چیز چھوٹی نہیں، ہمارا سارا کچا چٹھا موجود ہے۔

حضرات محترم! یہ سب کچھ ہوگا، اس لیے آیئے سر جوڑ کر بیٹھیں اور خوب غور کریں کہ ان گزرے ہوئے بارہ مہینوں میں ہم نے کیا پایا اور کیا کھویا؟ اگر ہماری نمازیں غفلت وفراموشی کی شکار نہیں ہوئی ہیں، اگر ہم نے سنن ونوافل کی حفاظت کی ہے، اگر ہم نے پورے سال مسجدوں کو آباد رکھنے کا اہتمام کیا ہے، اگر ہم نے رمضان کے تیس دن اور تیس راتوں کو ذکر وتلاوت سے معمور رکھا ہے، اگر ہمارے دن صرف لہو ولعب اور سرمستی ومدہوشی میں ضایع نہیں ہوئے، اگر ہماری راتیں نرم نرم گدوں اور گداز بستروں کی نذر نہیں ہوئی ہیں، اگر اللہ کی یاد سے ہم نے دلوں کو تازگی بخشی ہے، اگر ہمارے دن کے اوقات ذکرِ خداوندی کے ساتھ کسب معاش میں گزرے ہیں، اگر سنگین معاشی مصروفیات کے درمیان مؤذن کی پکار پر ہم مسجدوں کی جانب لپکے ہیں۔ پھر اگر ہمارے ہاتھ پاؤں سے ہمارے مسلمان بھائی محفوظ رہے ہیں، اگر ہماری مجلسیں مردہ بھائیوں کی گوشت خوری سے پاک رہی ہیں، اگر ہماری قوت بنی نوعِ انسان کی فلاح وبہبود میں صرف ہوئی ہے، اگر ہم نے خالق کے ساتھ سچا معاملہ اور مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک کیا ہے۔ اگر یہ سب ہوا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ سال کے بارہ مہینے جو گزر گئے سرتا سر رحمت تھے، خیر تھے، ہمارے لیے ذخیرہِ آخرت ہیں، ذریعہِ نجات ہیں۔ اور اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہوا تو کیا عرض کیا جائے کہ سراسر باعثِ خسران تھے۔ ”رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ“(سورۃ الاعراف آیۃ ۲۳) اے ہمارے پروردگار! ہم اپنی جانوں پر ظلم کر گزرے ہیں، اور اگر آپ نے ہمیں معاف نہیں فرمایا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم نامراد لوگوں میں شامل ہو جائیں گے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ ہم سے غلطیاں نہیں ہوئی ہیں؟ کون ہے جس کا دامن معصیت کی نجاست سے آلودہ نہیں ہوا ہے؟ یقیناً ہم سب خطا کار ہیں، تو کیا ان خطاؤں پر مہر لگ چکی ہے؟ کیا اب ان کی تلافی نہیں ہوسکتی؟ نہیں ایسا نہیں۔ قربان جایئے اس بے پایاں رحمتِ الٰہی کے اور فدا ہویئے اس بے کراں شانِ مغفرت پر جو ہر آن ہر لمحہ خاطی اور گنہگار بندوں کو دعوت استغفار دیتی ہے۔ ”هَلُ مِنُ تَائِبٍ فَأَتُوبُ عَلَيُهِ هَلُ مِنُ مُسُتَغُفِرٍ فَاغُفِرُلَهٗ هَلُ مِنُ سَائِلٍ فَاُعُطِيُهِ“ (متفق عليه) کیا ہے کوئی گنہگار جو چند قطرے اشکِ ندامت لے کر آئے اور ساری معصیتوں سے پاک ہو کر جائے۔ کس قدر مہربان ہے وہ آقا، جس نے تخلیق انسانی سے پہلے ہی باب جنت پر لکھ دیا ہے ”اُمَّةٌ مُذُنِبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ“ کہ امت گنہگار ہے اور رب آمرزگار ہے۔ جب تک سانس کی آمد وشد ہے، جب تک سورج مشرق سے نکل رہا ہے، توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، بڑھنے والے بڑھیں، مغفرت کا شامیانہ تنا ہوا ہے، اس میں بڑھ کر پناہ لیں۔

اب آیئے ایک قدم بڑھ کر جائزہ لیں کہ ہمیں اس ماہ (محرم) میں کیا کرنا تھا اور ہم کیا کررہے ہیں؟ یہ سال کا پہلا مہینہ ہے، محرم کا مہینہ ہے۔ یہی مہینہ ہے جس میں دنیا کا آغاز ہوا، اور یہی مہینہ ہے جس میں دنیا کا اختتام ہوگا۔ اس مہینے کے دامن میں بے شمار رحمتیں ہیں، مگر ہمارے لیے اس میں کرنے کے کیا کام رہ گئے ہیں؟ افسوس جس امت کو خیرِ امت کا لقب ملا تھا، جس کے لیے بانیِ امت نے خون پسینہ ایک کردیا تھا، جس کے لیے آپ ﷺ نے جاتے جاتے پیغام دیا تھا کہ ”تَرَكُتُ فِيُكُمُ اَمُرَيُنِ لَنُ تَضِلُّوُا مَاتَمَسَّكُتُمُ بِهِمَا: كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّتِيُ“ (رواه الامام مالك فى الموطا) کہ تمھارے درمیان قرآن واحادیث کا ایسا گراں مایہ سرمایہ چھوڑ کر جارہا ہوں کہ جب تک تم اس کو تھامے رہوگے، گمراہ نہ ہوگے۔ وہی امت آج کیا کررہی ہے؟ یومِ عاشوراء میں خرافات کے اندر مبتلا ہورہی ہے۔ اس کی حرکتوں سے انسانیت کی پیشانی داغ دار ہے۔ کہیں لکڑیوں کے مضحکہ خیز مجسمے نکال کر اس کے اِردگرد اسلام کے نام لیوا اچھل کود رہے ہیں، کہیں فرضی دولہا بنا کر اسلام کو سر بازار رسوا کررہے ہیں[۱] کہیں سینہ پیٹ پیٹ کر

دیوانگی کا مظاہرہ کیا جارہا ہے۔ اور یہ سب کس کے نام پر ہو رہا ہے؟ نواسۂ رسول حضرت سیدنا حسین ؓ کے نام پر، جن کی زندگی صبر و رضا کی تصویر تھی، جنھوں نے حق کی خاطر اپنی جان نثار کر دی اور شہید ہو کر زندۂ جاوید بن گئے۔

کیا سیدنا حسین ؓ ہمارے درمیان ہوتے تو ان سینہ کوبیوں سے خوش ہوتے؟ بتائیے! یہ جلوسِ بدتمیزی، یہ ماتم، یہ سینہ کوبی کس کی سنت سے ثابت ہے؟ کہ اگر اس کے خلاف کچھ کہا جائے تو آسمان سر پر اٹھا لیا جاتا ہے۔

یقیناً سیدنا حسین ؓ کی شہادت اس امت کا ایک دردناک حادثہ ہے، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ ماتم و نوحہ کا یہ شرم ناک طریقہ کس نے شروع کیا؟ کیا صحابہ کرام کے دلوں میں سیدنا حسین ؓ کی محبت کم تھی؟ آخر تابعین وائمہ کرام بھی تو اہل بیت سے محبت رکھتے تھے؟ پھر ان کے قلوب میں ماتم کے اس طریقے کا الہام کیوں نہیں ہوا؟ ہم کسی تاریخ میں نہیں پڑھتے کہ یہ مقدس جماعت بھی کسی خاص تاریخ میں ایک فرضی روضہ بنا کر گلی کوچوں میں 'یا حسین یا حسین' کا نعرہ لگاتی پھرتی ہو۔

حضرات! اظہارِ محبت کا یہ طریقہ سرے سے قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ محبت کا تو تقاضا یہ ہے کہ محبوب نے جس مقصد کو اپنا نصب العین بنایا تھا، محبت کرنے والے اسی مقصد کے حصول میں جان وتن کی بازی لگا دیں۔ آج ضرورت ہے کہ اسلام کو، اسلامی احکام کو اپنی زندگیوں میں از سرنو تازہ کیا جائے۔ اسلام کے نام لیوا صرف نام کے اعتبار سے نہیں بلکہ اعمال واخلاق، نظریات وعقاید اور حال ومقام ہر اعتبار سے اسلام کے نشان اور علامت ہوں۔ بدعات وخرافات سے توبہ کریں۔ خالص توحید اور اتباع سنت کو اختیار کریں اور ساری کائنات کے لیے آیتِ رحمت بنیں۔ واللہ الموفق وھو المعین

□□□

حاشیہ

۱) بنارس شہر میں ایک عجیب وغریب رواج یہ ہے کہ ایک شخص کو دولہا بنا کر رات بھر دوڑاتے ہیں۔ اس کے پیچھے ایک جم غفیر دوڑتا ہے۔ اس سلسلے میں دولہا کو نشہ آور چیزیں کھلا پلا کر تازہ دم رکھتے ہیں تاکہ وہ رات بھر دوڑ سکے۔

خواتین سے خطاب

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہ وَنَسْتَعِیْنُہ وَنَسْتَغْفِرُہ وَنُؤمِنُ بِہ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن يَّهْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہ وَ مَن يُّضْلِلْہ فَلَا هَادِىَ لَہ۔ وَنَشْهَدُ اَن لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہ لَا شَرِيْكَ لَہ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مَحَمَّداً عَبْدُہ وَرَسُوْلُہ اَرْسَلَہ بِالْحَقِّ بَشِيْراً وَنَذِيْراً ۔ وَصَلَّى اللّٰہُ تَعَالٰى عَلَيْہِ وَعَلٰى آلِہ وَاَصْحَابِہ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً۔

اَمَّا بَعْدُ:

محترم خواتین! مجھے حکم ہوا ہے کہ آپ سے کچھ گفتگو کروں اور دین کی کچھ باتیں جن کا تعلق خاص طور سے آپ عورتوں سے ہے، اس کو بیان کروں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اللہ نے ہمیں دینِ اسلام عطا فرمایا، یہ اس کا بہت بڑا احسان ہے۔ اس سے دنیا بھی بنتی ہے اور آخرت میں جنت بھی ملتی ہے۔ یہ بڑا کرم ہے کہ بغیر ہمارے مانگے ہمیں عطا فرما دیا۔ اب ہماری ذمہ داری ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی محبت پیدا کریں۔ یہ دنیا ختم ہونے والی ہے، ہم سب اللہ کے بندے ہیں، ہمارے ذمہ ضروری ہے کہ ہم سب ان کاموں کو کریں جس کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔

سب سے پہلی بات ایمان لانا ہے۔ الحمد للہ ہم سب ایمان والے ہیں۔ پھر حکم ہے کہ 'ایمان کی تجدید کیا کرو۔' اور اس کا طریقہ یہ بتلایا گیا ہے کہ کثرت سے کلمہ پڑھا جائے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ صبح و شام کے معمولات میں کلمہ کو داخل کرلیں۔ ہاتھ میں تسبیح لیں اور آٹھ دس مرتبہ 'لا الہ الا اللہ' پڑھ کر ایک مرتبہ 'محمد رسول اللہ'

پڑھیں۔ 'لاالـٰـہ الاالـلّٰـہ' پڑھتے وقت یہ خیال ذہن میں جمائے رکھیں کہ میں اللہ کی عبادت کرتی ہوں اور اسے ہی معبود مانتی ہوں اور اسی سے ہماری ساری ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ اور جب 'محمد رسول الله' پڑھیں تو یہ خیال رکھیں کہ کامیابی اور نجات اسی طریقہ میں ہے جو نبی ﷺ نے پیش فرمایا ہے۔ یہ کم از کم صبح و شام سو مرتبہ پڑھیں۔ رفتہ رفتہ تعداد بڑھاتی رہیں، دوسو، تین سو، چار سو، پانچ سو تک پڑھا کریں اور اس پر پابندی سے عمل کریں۔

دوسری چیز 'سُبْـحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِہٖ' سو بار دن بھر میں پڑھا کریں۔ کسی کا عمل اس شخص سے بڑھا ہوا نہیں ہوتا سوائے اس کے جو یہ عمل کرے۔ حدیث میں آتا ہے کہ "مَنْ قَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِہٖ فِیْ یَوْمٍ مِأَۃَ مَرَّۃٍ حُطَّتْ خَطَایَاہُ وَاِنْ کَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ" (بخاری) جس نے سبحان اللہ بحمدہ ایک دن میں سو مرتبہ پڑھا تو اس کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے اگرچہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں۔

اسی طرح صبح و شام ملا کر سو مرتبہ درود شریف پڑھا کریں۔ یہ حضور ﷺ کا ہم پر حق ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ "مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ وَاحِدَۃً صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ عَشَرَ صَلَوَاتٍ وَحَطَّ عَنْہُ عَشَرَ خَطِیْئَاتٍ وَرَفَعَ لَہ عَشَرَ دَرَجَاتٍ" (رواہ ابو داؤد عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ) جو مجھ پر ایک بار درود پڑھے گا اللہ اس پر دس رحمتیں بھیجیں گے اور اس کی دس خطاؤں کو معاف کریں گے اور اس کو دس درجات بلند کریں گے۔ اور رات میں سوتے وقت تسبیح فاطمی اور آیۃ الکرسی پڑھ لیا کریں۔ اس سے دن بھر کی تکان دور ہو جاتی ہے اور اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے۔ اسے پابندی سے پڑھا کریں، اس سے اپنی ذات میں، مال میں، اولاد میں برکت ہوتی ہے۔

ہماری پریشانی کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہم تسبیح نہیں پڑھتے۔ اللہ کا حکم ہے "سَبِّحُوْہُ بُکْرَۃً وَّ اَصِیْلًا" (سورۃ الاحزاب آیۃ ۴۲) صبح و شام اللہ کی تسبیح کرو۔ ایک خاتون صحابیہ نے اس کی وجہ پوچھی تو آپ ﷺ نے فرمایا "یُکَفِّرْنَ الْعَشِیْرَ" بہت کچھ

ملنے کے بعد بھی وہ ناشکری کرتی ہیں، اس لیے ہمیشہ اللہ کا اور اپنے شوہر اور اپنے مربی کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے۔ ”مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهِ“ (رواہ الترمذی عن ابی ہریرۃؓ) جو لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا بھی شکر نہیں ادا کرتا۔

شوہر کا اگر ہمارے ساتھ کوئی اچھا سلوک ہو، وہ ہمیں کچھ دے تو بجائے یہ کہنے کے کہ یہ کیسا لائے ہیں؟ ہمیں پسند نہیں۔ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے، اس سے اس کا دل بڑھے گا اور دوسری بار مزید اس سے اچھی چیز لائے گا۔ جب ہمیشہ اس کے ساتھ رہنا ہے پوری زندگی اسی کے ساتھ گزارنی ہے تو اس سے کبھی بد اخلاقی نہیں کرنی چاہیے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ ’شوہر اور بیوی کے لیے جائز نہیں ہے کہ ایک دوسرے پر غصہ کریں۔‘ غصہ ایسی تلخ چیز ہے کہ اگر اس کو پانی میں ڈال دیا جائے تو وہ بھی کڑوا ہو جائے۔ جب ایک دوسرے پر غصہ ہوں گے تو تعلقات بگڑیں گے اور آپس میں تلخی پیدا ہوگی۔ غصہ بہت سی خرابیوں کی جڑ ہے۔ اس سے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوتی ہے، تعلقات خراب ہوتے ہیں۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے تعلقات خراب ہوں، یہ بہت بری چیز ہے۔ اس سے بہت ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے خرابیوں کی جڑ یعنی غصہ کو بالکل ترک کر دینا چاہیے۔

آج کل حج کا موسم ہے۔ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ’کیا کرنا چاہیے۔‘ میں ان سے کہتا ہوں کہ ’غصہ کو ہندوستان میں چھوڑ کر جائیں، وہاں پر صرف صبر لے کر جائیں۔‘ اس کے بڑے اچھے نتائج ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ“ (سورۃ آل عمران آیۃ ۱۳۴) غصہ کو پی جانا، متقیوں کی علامت ہے۔ اس سلسلے میں دونوں طرف سے کمزوری وکوتاہی ہوتی ہے، مگر عورتوں کی طرف سے زیادہ ہوتی ہے۔ اولاد سے بھی ناگواریاں ہوتی رہتی ہیں، جب یہ بچے چھوٹے ہوتے ہیں تو مائیں ان پر جان چھڑکتی ہیں۔ جب یہ کچھ بڑے ہوتے ہیں تب بھی ان کی غلطیاں نظرانداز کرتی ہیں۔ لیکن جب ان بچوں کی شادی ہو جاتی ہے تو ایک جنگ چھڑ جاتی ہے، حالاں کہ خود ہی شوق سے

شادی کرایا ہے، اپنی پسند کی بہو لائے ہیں۔ یہ بری بات ہے۔ دوسرے گھر سے بہو آتی ہے، اسے اپنی بیٹی سمجھئے، سارا جھگڑا ایک دن میں ختم ہو جائیں گا۔ بہو بھی غلطی کرتی ہے مگر زیادہ غلطی ساس کی ہوتی ہے۔ اس لیے سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ ناگواریوں پر صبر کریں۔ انبیا کے جو بڑے بڑے درجات ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ انھوں نے تکالیف پر صبر کیا۔ اس لیے صبر اور حسنِ سلوک بہت ضروری چیز ہے۔

الغرض غصہ کا اظہار نہ کریں، سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ اور جو پڑھنے کے لیے بتایا گیا ہے، اس کا اہتمام کریں۔ نماز، روزہ کا اہتمام کریں۔ جیسے ہی اذان ہو فوراً نماز کی تیاری کریں۔ اگر بچے نے پیشاب کر دیا ہے تو بہت سی عورتیں سمجھتی ہیں کہ بغیر نہائے پاک نہیں ہوں گی۔ حالاں کہ جہاں پیشاب لگا ہے اس جگہ کو دھو لینا کافی ہے۔ تلاوت کا اہتمام ہونا چاہیے، اس میں بالکل ناغہ نہ ہو۔ اس میں بہت برکت ہے۔ اور اپنے لیے اور اپنے شوہر کے لیے دعا کریں۔

عورتیں جب غصہ میں ہوتی ہیں تو طرح طرح کے الفاظ بول دیتی ہیں جو نامناسب ہی نہیں بددعائیہ بھی ہوتے ہیں۔ اور جب بچے پر کوئی اُفتاد پڑتی ہے تو چیختی چلاتی ہیں، حالاں کہ یہ اسی کا اثر ہوتا ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ چاہے جتنا غصہ آئے، صبر کریں اور کوئی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائیں۔ جن لڑکیوں کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنے شوہر کے گھر میں رہتی ہیں، ان کے لیے ضروری ہے کہ سسرال کی شکایت اپنے میکے میں نہ کریں۔ خرابیاں دونوں جگہ ہوتی ہیں، ایسا کرنے سے بات بگڑتی ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گھر ان کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف لائے۔ وہ شکار پر گئے ہوئے تھے۔ ان کی بیوی سے گھر کی حالت دریافت کی تو انھوں نے شکایت کی کہ 'گھر میں تنگی رہتی ہے، فاقہ ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ 'جب اسماعیل آئیں تو ان سے سلام کہہ دینا اور کہہ دینا کہ گھر کی چوکھٹ بدل لیں۔' حضرت اسماعیل آئے، نورانیت کا احساس ہوا تو پوچھا کہ 'کوئی آیا تھا

کیا؟’ بیوی نے بتایا کہ ایک بوڑھے بزرگ آئے تھے اور حلیہ بتایا تو وہ سمجھ گئے۔ پوچھا ‘کچھ کہہ گئے ہیں۔’ کہا ‘ہاں چوکھٹ بدلنے کو کہا ہے۔’ فرمایا کہ ‘انھوں نے کہا ہے کہ تم کو طلاق دیدیا جائے۔’ لہٰذا اسے طلاق دیدیا اور دوسری شادی کرلی۔ پھر کچھ دنوں کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف لائے اور پھر حضرت اسماعیل گھر پر نہیں تھے۔ بیوی نے ان کا استقبال کیا، اچھی طرح سے بیٹھایا اور تواضع کی۔ گھر کا حال دریافت کیا تو بڑا اطمینان ظاہر کیا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ ‘بڑی اچھی زندگی گزر رہی ہے۔’ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ ‘اسماعیل آئیں تو سلام کہہ دینا اور کہہ دینا کہ چوکھٹ باقی رکھیں۔’ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام تشریف لائے اور گھر میں نورانیت کا احساس ہوا تو پوچھا کہ ‘کوئی آیا تھا؟’ بیوی نے سارا حال سنایا تو پوچھا کہ ‘کچھ کہہ گئے ہیں؟’ کہا ‘ہاں چوکھٹ باقی رکھنے کو کہا ہے۔’ فرمایا کہ ‘وہ تمھارے بارے میں کہہ گئے ہیں کہ تمھیں باقی رکھا جائے۔’

عورت اگر چاہے تو گھر کو جنت بنادے اور اگر چاہے تو جہنم بنادے، یہ عورت کے ہاتھ میں ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان باتوں کا اہتمام کریں، وظایف پڑھیں، پانچوں وقت کی نماز کا اہتمام کریں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ‘جو عورت پنج وقتہ نماز پڑھتی ہے، رمضان کا روزہ رکھتی ہے، اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرتی ہے اور شوہر کی اطاعت کرتی ہے تو اسے حکم ہوتا ہے کہ جنت کے آٹھوں دروازوں میں سے جس سے چاہے جنت میں چلی جائے۔’ یہ اللہ کا بڑا انعام ہے۔ (صحیح الجامع الصغیر للالبانی عن ابی هریرة ؓ)

اللہ تعالی سب کو توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین

❑❑❑